ہندیاترا

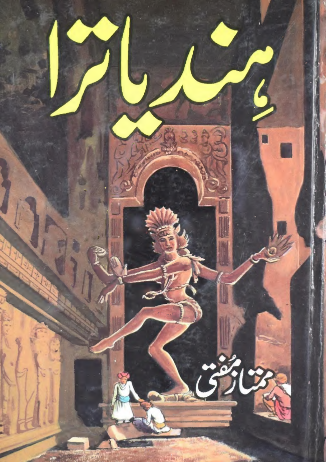

ممتاز مفتی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر» میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

ہندیاترا

ممتاز مفتی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

حضرت **امیر خسروؒ**
کے نام
اگرچہ یہ کتاب اس لائق نہیں کہ
ایک بلند پایہ ادیب
عالم
فن کار
اور
عظیم بزرگ
کے نام معنون کی جائے
لیکن جیسی کیسی بھی ہے،
یہ کتاب انہی کی دین ہے۔

فہرست

پیش لفظ ۷
ممتاز مفتی کی ہند یاترا ۹
تیاری ۱۹
روانگی ۴۲
امرتسر ۶۳
فرنٹیئر میل ۹۰
دِلّی ۱۱۲
سکاؤٹ کیمپ ۱۲۷
حاضری ۱۴۰
مہرولی ۱۵۷
قطب صاحب ۱۷۰
دربار گنج ۱۸۳
روز و شب ۲۰۳

بیجی سار ۲۲۲
گل مہرپارک ۲۳۶
راگ ودیا ۲۵۷
زیارتیں ۲۷۰
فرمائشیں ۲۸۹
آخری دن ۳۰۹

پیش لفظ

دوسرا ایڈیشن

۱۹۹۲ء

ایک روز قدرت اللہ شہاب نے برسبیل تذکرہ کہا، ایک بات پوچھوں ؟

میں نے کہا پوچھیے۔

بولے آپ نے ہند یاترا کس لئے لکھی تھی؟

کیا مطلب، میں نے پوچھا۔

آخر کوئی مقصد ہو گا۔

نہیں تو، کوئی مقصد تو نہیں تھا۔

عام طور پر کتاب لکھنے کا مقصد سلف پروجیکشن ہوتا ہے۔

ہاں بالکل، میں نے جواب دیا۔

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ہندوستان کے بارے میں کچھ تفریحاً لکھنا مناسب نہیں۔

میں نہیں سمجھا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خیر سگالی کے جذبات پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ آپ اس بات کو مانتے ہیں؟

جی بالکل مانتا ہوں۔

ہر بات جو لکھی جاتی ہے، اس پر رد عمل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ ہر بات کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

بڑی معقول بات ہے، میں نے جواب دیا۔

کیا ہند یاترا لکھتے وقت یہ بات آپ کے ذہن میں تھی؟

جی نہیں، بالکل نہیں تھی۔ میں نے تو ہند یاترہ میں اپنے ذاتی تاثرات بیان کئے تھے۔

قدرت اللہ شہاب بولے۔ آج کل ہندوستان کے سفرنامے لکھنے کا فیشن ہو چکا ہے۔ ان سفرناموں میں مصنف بلا تکلف ذاتی خیالات اور جذبات لکھ دیتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کے ذاتی جذبات دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دونوں ملکوں میں جذبات کے چھینٹے اڑاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ اب ہمیں جذباتی تعلقات سے باہر نکل آنا چاہئے۔ چونکہ ہمارے باہمی تعلقات پر جنوب مشرقی ایشیاء کے تمام ممالک کے مستقبل کا انحصار ہے۔

قدرت اللہ کی بات بالکل صحیح ہے۔

کب تک ہم جذباتی رنگ پچکاریوں کی ہولی کھیلتے رہیں گے۔ کب تک ہم نفرت کے چھینٹے اڑاتے رہیں گے۔

عقل کا تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے عزت اور احترام کے جذبات پیدا کریں اور انہیں فروغ دیں۔

دلی میں چند روز قیام کے دوران مجھے یہ احساس ہوا کہ وہاں کے عوام کے دلوں میں پاکستان کے خلاف کوئی غم و غصہ نہیں، وہ پاکستان کو سچے دل سے تسلیم کر چکے ہیں۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف تعصب نہیں۔ پھر ہند میں ہندو مسلم فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے اس امر کی وضاحت نہیں کی۔

ہندو مسلم فسادات یا اشتعال انگیز بیانات ہند کے عوام کے جذبات کے ترجمان نہیں ہوتے بلکہ سیاست دانوں کے مفادات کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں۔

ہند میں سیاستئے اپنے مفادات کے لئے ہندوازم کو استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان میں سیاستئے اپنے مفادات کے لئے اسلام کو استعمال کر رہے ہیں۔

ممتاز مفتی

ڈاکٹر رشید امجد

ممتاز مفتی کی ہند یاترا

ممتاز مفتی ایک شخص نہیں، فکشن کا ایک عہد ہے۔

انہوں نے صرف اردو افسانے ہی کو "ان کہی" کے ایک نئے ذائقے سے آشنا نہیں کیا بلکہ دوسری اصناف ناول، ڈرامہ، سفر نامہ، رپور تاژ اور خاکہ نگاری وغیرہ میں بھی اہم موضوعاتی اور فنی تجربے کیے ہیں۔ انہوں نے پہلی بار حقیقت نگاری اور رومان پسندی کے درمیان ایک ایسے نفسیاتی تضاد کو ابھارا ہے جس سے ہماری کہانی میں ایسی فکری دبازت پیدا ہوئی ہے کہ انسانی باطن کی گہرائیاں اس میں سمٹ آئی ہیں۔ انہوں نے مجاز اور حقیقت کے درمیان درمیان ایک نئی سیمائی کو دریافت کیا ہے۔ یوں ان کے یہاں حقیقی زندگی کی کھری تصویریں بھی ہیں اور باطن کی ان دیکھی دنیا کی ان کہی کہانیاں بھی۔

ممتاز مفتی کا فنی سفر کئی اصناف میں پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے ہر صنف میں اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے لیکن یہاں بات ان کے سفر نامہ "ہند یاترا" تک محدود ہے۔ اردو میں سفر نگاری کی روایت پرانی ہے اور پچھلے چند برسوں میں یہ سب سے مقبول صنف بھی ہے۔ یوسف خان کمبل پوش اور محمود نظامی سے مستنصر حسین تارڑ تک کئی ادیبوں نے اس صنف میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن مفتی کا "ہند یاترا" ایک مختلف سفر نامہ ہے جس میں بندھی ٹکی تکنیک سے ہٹ کر سفر نامہ اور رپور تاژ کو ملا کر ایک نیا تجربہ کیا گیا ہے جس سے ایک نیا ذائقہ پیدا ہو گیا ہے۔ مفتی کہتے ہیں:

> "کہیں کہیں اس میں سفر نامے کی جھلک نظر آئے گی، کہیں رپور تاژی تاثر پیدا ہو گا، کہیں کہیں ایسا لگے گا جیسے انشائیہ ہو اور کئی ایک جگہوں پر یادوں کی برات کا رنگ جھلکے گا۔"

اصل بات یہ ہے کہ بڑا فنکار ہیت اور تکنیک کو سامنے رکھ کر نہیں لکھتا بلکہ اس کے افکار و مشاہدات خود بخود کسی ہیت میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور یوں بعض اوقات اس کی

خلاقانہ مہارت ہیت اور تکنیک کی صورت بھی بدل دیتی ہے۔ اس سفرنامے کا معاملہ بھی یوں ہے کہ مفتی نے اسے لکھنا شروع کیا، بنیادی طور پر یہ ایک سفر کی روداد ہے لیکن ان کے تجربے، علم اور وسیع مشاہدے اور مطالعے نے اس میں کئی رنگ بھر دیئے۔ سو یہ ایک سفر نامہ بھی ہے اور ایک تاریخ بھی۔ تاریخ اس حوالے سے کہ اس میں برصغیر کی دو بڑی قوموں مسلمان اور ہندوؤں کا نفسیاتی، فکری اور تمدنی مطالعہ بھی موجود ہے۔ یہ مطالعہ ایک پاکستانی مسلمان کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ مفتی کے اپنے لفظوں میں:

> "میں ہندو قوم کی جملہ مثبت خصوصیات کا مداح ہوں۔ مجھے ان سے صرف ایک شکایت ہے کہ ان کا رویہ مسلمان اور پاکستان کش ہے، پھر یہ بھی کہ ہندو کے اس رویئے کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ ہندو کے اس رویئے نے مجھے مسلمان بنا دیا۔ مجھے ایک تعصب بخشا، منفی نہیں، مثبت تعصب۔"

یہ مثبت تعصب پورے سفرنامے میں موجود ہے اور اس کی وجہ سے ہندو معاشرے پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا ممکن ہو گئی ہے۔ یوں تو یہ سفرنامہ ایک خاص عرصہ کا ہے لیکن اس کے پس منظر میں برصغیر کے مسلمانوں کے عروج و زوال کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ دراصل دوہرے سفر کی کہانی ہے۔ ایک سفر تو خارج میں اسلام آباد سے دہلی تک کا ہے اور دوسرا سفر یادوں کے حوالے سے تقریباً ایک ہزار سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ مفتی نے کمال فنی مہارت سے ان دونوں سفروں کو یوں یکجا کیا ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ کہاں سے یادوں کا سفر شروع ہوتا ہے اور کہاں سے خارجی سفر، دونوں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ فنی طور پر ایک ایسی اکائی وجود میں آئی ہے کہ اسے حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> "ہماری بسیں بازار میں داخل ہو گئیں۔ دو رویہ دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ بڑی معتبر قسم کی دکانیں، ٹٹ پونجیہ دکانیں نہیں۔ ساوی کی ساری دوکانیں مقفل پڑی تھیں۔ یا اللہ یہ کیا بات ہے۔ ساڑھے آٹھ بجنے کو آئے ہیں، ابھی تک کوئی دکان نہیں کھلی۔ ہندو تو ایک سحر خیز قوم ہے۔ صبح پو پھٹتے وقت جاگ اٹھتا ہے...... ہندو کو منافع کی نہیں، دوکان کی لگن ہے لیکن یہ کیا، ساڑھے آٹھ بج گئے اور ایک بھی دوکان نہیں کھلی...... بازار میں کوئی دوکان

> نہیں کھلی تھی، ہر دروازہ مقفل تھا۔ ہائیں یہ کیا ہوا۔ کیا ہندو کے دل سے دوکان کی محبت ختم ہوگئی، کیا اس پوتر لگن کا انت ہوگیا۔ کیا ہندو بدل گیا۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہندو کبھی نہیں بدل سکتا۔
>
> ہندو صدیاں —— بدھ مت کے تحت جیا۔ وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیاء کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ بدھ مت جس نے باہر کے انسان کو مسخ کرکے اندر کے انسان کو نکالا۔ جس نے امتیازات کو توڑا۔ جس نے کردار کی عظمت عطا کی...... وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیاء کو بدل ڈالا، وہ بدھ مت ہندو کا بال بھیکا نہ کرسکا۔ الٹا ہندو نے اس کے ماتھے پر اپنا ٹیکہ سجادیا...... پھر مسلمان آئے۔ سینکڑوں سال ہندو مسلمان کے تحت رہا۔ مسلمان بادشاہوں کا وزیر بنا۔ بڑے بڑے منصب حاصل کیئے۔ مسلمانوں کے طور طریق میں رہن سہن کیا۔ لیکن اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھی بلکہ مسلمان درباروں پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ پھر انگریز آیا۔ صدیوں ہندو انگریز کے تحت رہا۔ انگریز کا رنگ اپنایا لیکن باہر باہر سے۔ اس کے رنگ میں ڈوبا نہیں۔ اپنی روایات کو سینے سے لگائے رہا اور آج آزادی پا لینے کے بعد، صدیوں کے بعد اپنا راج قائم کرلینے کے بعد کیا ہندو بدل گیا ہے۔ کیا اس نے صبح سویرے جاگنا چھوڑ دیا ہے۔ کیا اسے دوکان کا جنون نہیں رہا۔ نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

اس اقتباس میں مفتی نے صدیوں کا سفر کس خوبصورتی سے لمحوں میں طے کیا ہے۔ اہم بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ ان دو صفحوں میں انہوں نے ہندو قوم کا نفسیاتی تجزیہ کردیا ہے۔ ہندو کی نفسیات پر اور یہ کہ ہندوازم ایک مذہب ہے یا جینے کا ایک طریقہ۔ ان گنت مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن مفتی نے جس اختصار اور خوبی سے چند سطروں میں یہ نفسیاتی گرہ کھولی ہے۔ اس کی داد ممکن نہیں۔

"ہند یاترا" میں یادوں اور ماضی کے حوالے سے جو سفر خارجی سفر کے مطبون چلتا ہے، وہ صرف یادوں یا جذبوں تک محدود نہیں بلکہ تاریخی حقائق، تحقیقی معلومات اور نفسیاتی

و معاشی تجزیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ برصغیر کی تاریخ کو درست رکھنے کی ایک تخلیقی سعی بھی ہے اور اس سعی کے پیچھے ایک مسلمان ذہن کار فرما ہے جو ہندو کے ساتھ صدیوں کے رہن سہن کے باوجود اپنی ایک "مسلم شناخت" رکھتا ہے۔ بظاہر یہ سفر ہومیو پیتھی کتابوں کی تلاش تک محدود ہے اور مفتی اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں بقول ان کے وہ ہندوستان کو لوٹ لائے ہیں لیکن یہ سفر صرف اس مقصد تک محدود نہیں بلکہ درون خانہ کئی اور اہم معاملات بھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ ماضی کی بازیافت ہے لیکن یہ ماضی پرستی نہیں بلکہ ماضی کی یادوں کے حوالے سے حال کا جائزہ لینا ہے اور ہندو کے جدید دور سے اپنا تقابلی مطالعہ کر کے اس مقام و حالت کا تعین کرنا ہے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ دوسرا اہم مسئلہ مفتی کی روحانیت ہے۔ وہ اس سفر کے ذریعے بعض روحانی بزرگوں کے مزار پر حاضری دینا چاہتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم بزرگ قطب الاقطاب حضرت بختیار کاکیؒ ہیں۔ مفتی نے لاہور کے شاہ بابا کا پیغام بھی ان کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ یہ چند صفحات جن میں مفتی اپنے کیمپ سے قطب صاحب کے مزار پر حاضری دینے اور واپسی کا سفر کرتے ہیں، برصغیر کے صوفیاء اور مختصر سی درجہ بندی کی ایک وقیع تاریخ ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ مفتی نے تیرہ چودہ صفحات میں کتنی اہم اور مفصل باتیں کر دی ہیں اور کتنی بے تکلفی اور روانی سے۔ ان چودہ صفحات میں مفتی لاہور سے دہلی، دہلی سے لاہور اور پھر موجودہ عہد سے التمش کے عہد میں لے جاتے ہیں اور ایک لمحے میں پڑھنے والا کبھی خود کو جدید دہلی میں قطب صاحب کے مینار پر کھڑا پاتا ہے اور کبھی سلطان التمش کے عہد میں قطب صاحب کی خوشبو محسوس کرتا ہے۔ فنی گرفت کا یہ کمال شاید ہی کسی دوسرے نثر نگار کو حاصل ہو۔ یہ سارا سفر دو تہذیبوں، دو ملکوں، دو عقیدوں اور دو قوموں کا ایک تقابلی مطالعہ ہے۔ دہلی اور اسلام آباد دو علامتیں ہیں جن کے توسط سے دو ملکوں کی مجموعی صورت حال کا تقابل کیا گیا ہے۔ دہلی کی جدت پسندی، ترقی اور رفتار میں ایک ٹھہراؤ اور تہذیبی رکھ رکھاؤ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام آباد کی جدت پسندی اور ترقی میں ایک اچھلتا پن ہے، یہی فرق دونوں ملکوں کی سفارت اور دفتری طریقۂ کار میں بھی ہے۔ مفتی نے مختلف جگہوں پر اس فرق کو واضح کیا ہے اور دو ایک جگہ دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے مجموعی رویئے پر طنز بھی کیا ہے۔ زائرین سے پاکستانی سفیر کی ملاقات. بلکہ اس ملاقات کی تمہید جس طنزیہ انداز

میں باندھی گئی ہے اور جس طرح یہ ملاقات ہوتی ہے اور سفیر صاحب کی جگہ ان کے فرسٹ سیکرٹری بر آمد ہوتے ہیں، وہ حصہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مختصر اقتباس دیکھئے:

> "عین اس وقت چھوٹی داڑھی والا داخل ہوا۔ "وہ آرہے ہیں، وہ آرہے ہیں" وہ یوں انبساط بھری سرگوشی میں بولا جیسے حضرت امیر خسرو" بنفس نفیس تشریف فرما ہورہے ہیں—" اونہوں، وہ بولا "خود نہیں، فرسٹ سیکرٹری کو بھیجا ہے۔"

اور اس عظیم ملاقات کی گرم جوشی کا حال دیکھئے:

> "باری باری انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا۔ جب میری باری آئی تو میرے ہاتھ میں ایک ٹھنڈا بے جان ہاتھ تھا جیسے وہ اسکیمولینڈ سے خاص طور پر میرے لئے امپورٹ کیا گیا ہو"

"ہند یاترا" میں ایک ناول کی سی کہانی. ایک سفرنامے کی سی منظر نگاری. ایک رپورتاژ کی سی روانی اور ایک تاریخ کی سی حقائق نگاری ہے۔ مفتی بات میں سے بات نکالنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی فنی مہارت کا کمال یہ ہے کہ وہ کہانی کو ایک ماہر گلکار کی طرح جس شکل میں چاہیں، ڈھال سکتے ہیں۔ اپنے قاری کو جدھر گھمانا چاہیں، گھما سکتے ہیں۔ اس سفر نامے میں بھی انہوں نے اپنے قاری کو ایک ہی جست میں کئی جلوے دکھائے ہیں۔ صدیوں کا سفر لمحوں میں کرایا ہے اور پڑھنے والا ان کے ساتھ ساتھ یوں چلتا ہے جیسے کوئی بچہ کسی بزرگ کی انگلی پکڑے چل رہا ہو۔ لیکن اس چلنے میں کوئی جبر نہیں بلکہ ایک لطف اور سپردگی کی لذت ہے۔ مفتی جب ایک طویل جست لگا کر حال سے ماضی اور ماضی سے حال میں آتے ہیں تو ذہن کو ذرا بھی جھٹکا نہیں لگتا اور پڑھنے والا کہانی در کہانی کے دبیز اسراروں میں سفر کرتے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے جیسے بالکل سیدھی پکی سڑک پر چلے جا رہا ہو۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ سفرنامہ صرف حال کا نہیں بلکہ اس کے پس پشت ایک طویل ماضی بھی ہے۔ مفتی کا کمال یہ ہے کہ جس شدت سے ماضی میں ڈوب کر ابھرتے ہیں، اسی شدت سے اپنے قاری کو بھی یہ تجربہ کراتے ہیں۔ یادوں کا یہ سلسلہ محض جذباتی نہیں بلکہ فکری اور تاریخی ہے اور مختلف مناظر سے تخلیق ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے

ماضی کے حوالے سے کئی فلمیں ٹکڑوں کی صورت میں چل رہی ہیں۔ ایک ٹکڑا ایک منظر دکھاتا ہے، پھر دوسرا ٹکڑا دوسرا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ سارے سلسلے ایک تمدن، ایک فکر اور ایک نظریۂ حیات کے حوالے سے ایک سرزمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سارے منظر ایک ہی تسلسل میں ہوتے تو ایک خشک تاریخ بن جاتے۔ مفتی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان بے شمار مناظر کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے پورے سفر میں پھیلا دیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے انہیں حال کے مناظر سے جوڑ دیا ہے کہ قاری ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر جست بھی لگاتا ہے اور اسے جھٹکا بھی محسوس نہیں ہوتا۔ اس میں مفتی کی فنی مہارت بھی ہے اور سفرنامے کی دلچسپی بھی جس میں کئی چھوٹے چھوٹے افسانے اور کہانیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ بظاہر کئی باتیں معمول کی ہیں لیکن مفتی ان معمول کی باتوں کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ اس وجہ سے "ہند یاترا" صرف ایک معمول کا سفرنامہ نہیں بلکہ دائرہ در دائرہ ایک پیچیدہ سفر ہے جو خارج سے باطن اور باطن سے خارج میں آکر ایک تاریخی روپ اختیار کر لیتا ہے۔

ممتاز مفتی ایک صاحب اسلوب نثر نگار ہیں۔ مختصر طنزیہ جملے لکھنے میں ان کا جواب نہیں۔ وہ بڑی آسانی سے ایسا طنز کر جاتے ہیں کہ کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا اف بھی نہیں کر پاتا کہ بات بہت آگے نکل چکی ہوتی ہے۔ اس سفرنامے میں بھی انہوں نے اپنے اس فن سے بڑا کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں ضرورت پڑی ہے، ایک مقرر کی طرح جذباتی تقریر بھی کی ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ تقریر کا احساس نہ ہو۔ قاری غور و فکر کرے یا اسلوب کے بہاؤ میں نہ بہے اور اپنے آپ کو روک سکے تو اسے احساس ہو گا کہ مفتی نے اس کے ساتھ کیا ہاتھ کر دیا ہے اور اس کی شخصیت کو کیسے ریزہ ریزہ کر کے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔

اس سفرنامے کی ایک اور دلچسپی اس کے ذیلی عنوان ہیں جن سے آگے پڑھنے کی ایک امنگ پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی مفتی کا ایک کمال ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتے۔ قاری ایک سحرزدہ شخص کی طرح ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس کی دلچسپی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ ذیلی عنوانات نہ صرف یہ کہ چونکاتے ہیں بلکہ ایک تجسس بھی پیدا کرتے ہیں۔ جیسے کھون ہی کھون ___ بھیڑ بکریاں ___ جنتر منتر ___ قلیوں کا جلوس ___

سکھ ہی سکھ ــــ ننگا کلہاڑا ــــ لاٹاں ــــ دودھیا جوڑا ــــ نیند میں چھچھڑا ــــ خوف کی دیوار ــــ اصل لڑکی ــــ وغیرہ۔ قاری ایک تجسس کے ساتھ ان عنوانات کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے اور اس طلسم کے اسراروں میں کھو جاتا ہے۔

اس کتاب کی دلچسپی اور روانی میں دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ مفتی کے اسلوب کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ پنجابی کی کوکھ سے پھوٹا ہوا اسلوب مفتی کی پہچان ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے میں بھی اردو، ہندی اور پنجابی الفاظ کو ایک دوسرے میں گوندھ کر ایک ایسی زبان بنائی ہے جو سفرنامے کے عمومی مزاج اور حالات و واقعات کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ ایک عنصر کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح کی فنی اکائی ہی ایک اعلیٰ فن پارے کو جنم دیتی ہے اور یہ خوبی مفتی کے دوسرے کاموں کی طرح اس سفرنامے میں بھی پوری طرح موجود ہے۔ پنجابی الفاظ کے استعمال سے جملہ بنانے کا رویہ پوری کتاب میں موجود ہے۔ مثال کے لئے یہ چند جملے پیش ہیں:

میں چوری چوری کانی آنکھ سے چوباروں کو دیکھ رہا تھا۔
اسی طرح ہتھ پنکھیاں گھومتی ہیں۔
پھر سڑک کے عین درمیان میں وہ چٹا سفید پاؤں۔
میرے سر کو کھون چڑھ گیا ہے۔
کیا یہ سب فوت شدہ لوگ ہیں۔
ایسا زنانہ مزاج پایا ہے کہ پلا مار کر دیئے بجھاتی ہے۔
ویگنوں میں کھجل ہوتا ہے۔
کچ کے گلاس کی طرح نازک۔
ایک بار اس کے مونڈھے پر سر رکھ دوں، پھر جو ہونا ہے ہو جائے۔
اسے مٹی میں رول دیا۔
جب دور سے فرنٹیئر میل کی کوک سنائی دی۔
تھا تو ڈاکو، پر مسلمانوں کا بہت بیری تھا۔

مفتی نے پنجابی الفاظ کا استعمال اتنی سہولت اور روانی سے کیا ہے کہ وہ جملے کا لازمی حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ مفتی کے بیان اور اظہار میں اتنی روانی ہے کہ جب وہ فاصلوں اور

وقت کو تیزی سے سمیٹتے ہیں تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ واقعہ یا بات کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں جب ان کی بیوی موت کی دہلیز پر کھڑی تھی، دونوں میاں بیوی انتہائی مایوسی کے عالم میں ہسپتال کو خیرباد کہتے ہیں۔

> "چلو گھر چلیں" ـــــ "چلو" میں نے کہا ـــــ وہ بولی ـــــ "جو ہونا ہے وہیں ہو"
>
> پھر ہم ریل گاڑی میں بیٹھے قصور جا رہے تھے جہاں میں سکول ماسٹر تھا۔ گاڑی کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں ہو نکتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ پھر دفعتہً اس چھائی ہوئی مسلط و محیط کچھ بھی نہیں سے امید کی ایک کرن پھوٹی۔ ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ لدھیانے کے کسی ڈاکٹر محمود کے حیرت انگیز معجزات کا ذکر کر رہے تھے۔
>
> میں نے زیر لب کہا "شان سن رہی ہو"
>
> "ہاں" وہ بولی "سن رہی ہوں"
>
> "چلو لدھیانے چلیں ـــــ چلو گی"
>
> "جہاں جی چاہے لے چلو" وہ بولی "کیا فرق پڑتا ہے"
>
> ڈاکٹر محمود نے ایک پڑیا شان کے منہ میں ڈالی اور بولا "جاؤ، جوں جوں گھر پہنچو، اچھے ہوتے جاؤ"
>
> ہم گھر پہنچتے گئے، شان اچھی ہوتی گئی، اچھی ہوتی گئی اور پھر چند ہی دنوں میں وہ "کچھ بھی نہیں" "سبھی کچھ" میں بدل گیا۔ زندگی پھر ہری ہو گئی۔ پھول کھل گئے ـــــ"

اس اقتباس میں جس طرح وقت اور فاصلے سمٹے ہیں لیکن کہیں جھٹکے کا احساس نہیں ہوتا، وہ مفتی کے فن کا اعجاز ہے۔ مفتی کے قلم نے دم بھر میں طویل فاصلہ ہی طے نہیں کیا، بہت سی تفصیلات کو بتائے بغیر ہی تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ چند مختصر مکالموں اور دو ایک بیانیہ جملوں نے اتنی مکمل تصویر بنائی ہے کہ اس کئی پیراگرافوں میں بھی مکمل کرنا مشکل ہے۔ یہ مفتی کے فن کا اعجاز ہے جو پورے سفرنامے میں جگہ جگہ اپنی پہچان کراتا ہے۔

اس سفرنامے کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ مفتی نے یہ سفر ایک مسافر کی حیثیت سے

کیا ہے، ایک ادیب کی حیثیت سے نہیں۔ یہ بات اس لئے قابل توجہ ہے کہ پورے سفر کے دوران سوائے فکر تونسوی کے کسی ہندوستانی ادیب کا ذکر نہیں آیا۔ نہ ہی مفتی نے دہلی جاکر دوسرے ادیبوں کی طرح اپنی شام منوائی۔ نہ کسی اور طرح کی ادبی پی آر کی۔ اسی لئے اس سفرنامے کے مواد میں جھوٹ اور بناوٹ کی بجائے ایک سچائی اور کھرا پن پیدا ہوا ہے۔ یہ نرول رویہ مفتی کے صاف اور نیک باطن سے جنم لیتا ہے اور ان ہزاروں نمازی پرہیز گاروں کے رویوں سے مختلف ہے جو گئے تو تھے امیر خسروؒ کے عرس میں شرکت کے لئے اور واپسی پر ہندوستانی مصنوعات چھپا چھپا کر لائے۔ اس سفرنامے کا اختتام ان سطروں پر ہوتا ہے:۔

> "گاڑی سیٹیاں مار رہی تھی ....
>
> لٹیرے لوٹ کا مال سنبھال رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سیکوریٹی والے چوری چوری ہنس رہے تھے۔ ریل گاڑی کھی کھی کرتی ہوئی سرک رہی تھی۔ دور جامع مسجد کانوں پر ہاتھ رکھے چلا چلا کر پوچھ رہی تھی "مجھے لینے کب آؤ گے، اللہ اکبر"

یہ چند سطریں ان لوگوں کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر ضرور مجبور کریں گی جو اسلام اسلام پکارتے ہندوستان جاتے ہیں، لیکن وہاں پہنچتے ہی ہر طرح کی ادبی محفلوں میں شریک ہوکر "ہم ایک ہیں" کا نعرہ لگاتے ہیں اور واپسی پر تحفوں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس لاتے ہیں اور سرحد پار کرتے ہی پھر اسلام کا ورد شروع کر دیتے ہیں۔

مفتی نے اس سفرنامے میں کسی ازم کا نعرہ نہیں لگایا لیکن پورے سفر میں ان کی پہچان ایک مسلمان کے حوالے سے ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے ساری چیزوں کو دیکھا اور اسی نظر سے تاریخ کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ ان کے سارے حوالے مسلم فکر اور روحانیت کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں۔

"ہند یاترا" ایک منفرد سفرنامہ ہے۔ جس کا مسافر ایک شخص بھی ہے، ایک مفکر بھی، ایک روحانی نظام کو ماننے والا جدید صوفی بھی۔ اس نے اپنی نظر سے، اپنے نظریۂ حیات سے چیزوں، منظروں اور رویوں کو دیکھا ہے اور اپنے نتیجے نکالے ہیں۔ یہ اس سفرنامے کی موضوعاتی اور فکری انفرادیت ہے۔ رہی بات بیان اور اظہار کی تو جیسا عرض کیا گیا ہے، مفتی

ایک شخص نہیں، فکشن کا ایک عہد ہے جس کا اپنا ایک اسلوب۔ ایک بیان اور انفرادیت ہے اور یہ سب کچھ اس سفرنامے میں موجود ہے۔

رشید امجد

52-C لین نمبر 7-A
گلستان کالونی، راولپنڈی

تیاری

گزشتہ چونتیس سال میں کئی مرتبہ میرا جی چاہا کہ ہندوستان جاؤں۔ ایک بار اپنے گاؤں بٹالے کو دیکھوں جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ مفتیاں محلے کو دیکھوں جس کے چوگان میں کھیل کھیل کر میں بڑا ہوا تھا۔

مفتیاں محلّہ

کیا مفتیاں محلے کی وہ عظیم ڈیوڑھی جو محلے کو کوچہ بند کرتی تھی اب بھی جوں کی توں قائم ہے۔ وہ ڈیوڑھی جسے شہنشاہ جہانگیر نے بنوایا تھا۔ جہاں شہنشاہ خود ایک بار آ کر ٹھہرا تھا۔ وہ ڈیوڑھی جس میں سے گزرتے ہوئے مجھ پر دہشت سی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ ساتھ ہی فخر سے میری گردن تن جایا کرتی۔ کیا اس عظیم ڈیوڑھی کے بڑے بڑے چوبی کواڑ جو کبھی بند نہ ہوئے تھے. اب بھی ویسے ہی کھلے رہتے ہیں۔

کیا ڈیوڑھی سے ملحقہ مسجد اب بھی اسی طرح سفید چادر میں لپٹی ہوئی گیان دھیان میں مگن بیٹھی ہوئی ہے۔ کیا مسجد کے کنویں کا پانی اب بھی اتنا ہی ٹھنڈا ہے کہ سہارا نہیں جاتا۔

مجھے یاد ہے جب مجید ملک پہلی مرتبہ بٹالے آیا تھا اور اس کنویں کے سقاوے میں نہایا تھا تو اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ”مفتی یہ کیسا پانی ہے۔ اتنا ٹھنڈا، اتنا تازہ. شہر میں تو میں نے ایسا پانی کبھی نہیں دیکھا۔ ایسے لگتا ہے آج میں زندگی میں پہلی مرتبہ نہایا ہوں۔

کیا کنویں کے پہلو میں نور شاہ ولی اب بھی اسی اطمینان اور سکون سے اپنے مزار میں لیٹے ہوئے ہیں۔ " نور شاہ ولی جو محلے کے محافظ تھے۔ مشہور تھا کہ چور مفتیاں محلے سے باہر نکلتے ہوئے نور شاہ ولی کے مزار سے گزرتا ہے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ شاید اسی ڈر کے مارے مفتیاں محلے میں کبھی چوری نہ ہوئی تھی۔ کیا نور شاہ ولی اب بھی محلے کے محافظ ہیں۔

کیا چاروں اطراف محلے کے اونچے اونچے چار منزلا مکانوں سے گھرے ہوئے چھوٹی اینٹ کے فرش والے وسیع میدان کو اب بھی منڈی کہتے ہیں۔ کیا اب بھی وہاں بچے کھیلتے ہیں، شور مچاتے ہیں اور کھڑکیوں میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورتیں انہیں ڈانٹتی ہیں۔ سرزنش کرتی ہیں۔ باکھے تو باز نہیں آتا اچھا آ لے گھر۔

کیا اب بھی چھتی گلی کو گلیارہ کہتے ہیں۔ وہاں ہر وقت دل کی دھڑکنوں بھرا معطر اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ کیا اب بھی محلے کے کچے نوجوان وہاں گھنٹوں چھپے رہتے ہیں کہ آتی جاتی لڑکیوں کی خوشبو قریب سے سونگھ سکیں۔

کیا اب بھی محلے کی بڑی بوڑھیاں کام کے بہانے اکٹھی بیٹھ کر سکینڈل کے جال بنتی رہتی ہیں۔ اسی طرح ہتھ پنکھیاں گھومتی ہیں، ہاتھ چلتے ہیں، ہونٹ کانوں میں گھس جاتے ہیں، پھر قہقہے گونجتے ہیں۔

ہاں گزشتہ چونتیس برس میں کئی بار جاتے میں ان جانے میں میں بٹالے کے تنگ بازاروں میں گھومتا پھرا۔ داروغے والے کھوہ کے قبرستان میں اپنے دادا کی قبر پر بیٹھا رہا۔ باولی کے تالاب کے کنارے گیند بلا کھیلتا رہا۔

پھر دفعتاً میں جاگ اٹھتا۔ نہ۔ نہ میری جان ان ہونے سپنے دیکھنے کا فائدہ۔

رنگ پچکاری

پھر وہ اے حمید ہے۔ امرتسر کا دیوانہ۔ اے حمید۔ اب میں اس کی شکایت کیسے کروں، کس سے کروں۔ وہ میرا ساتھی قلم کار جو ہوا۔ اے حمید بڑا ظالم ہے۔ ہر چند ماہ بعد اپنی کسی نا کسی تحریر میں امرتسر کا تذکرہ چھیڑ دیتا ہے۔ اس کی تحریروں میں اتنی جان ہے۔ اتنی زندگی ہے، اتنی رنگینی ہے کہ امرتسر میرے سامنے پھر سے انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا ہے۔ جی

اٹھتا ہے۔ وہ کمبخت مجھے امرتسر کو بھولنے نہیں دیتا۔

میں نے زندگی کے چند ایک سال امرتسر میں گزارے ہیں۔ مجھے امرتسر سے عشق ہے۔ میں امرتسر کی رنگ پچکاری سے ایسا بھیگا کہ آج تک رنگ نہیں چھوٹا۔

ہاں کئی مرتبہ میرا جی چاہا کہ امرتسر جاؤں۔ وہاں اس ریل کی لائن کو دیکھوں جو بٹالے کو جاتی ہے۔ ہال بازار میں گھوموں۔ کٹڑہ گھنیاں میں چوری چوری کانی آنکھ سے چوباروں کی طرف دیکھوں۔ سُر ہوتے سازوں کی آوازیں سنوں۔ مخملی چہروں کی سج دھج دیکھوں۔

دفعتاً میں ان خوابوں سے جاگتا. چونکتا ۔ امرتسر۔ کون سا امرتسر۔ امرتسر تو اجڑ گیا تھا۔ ختم ہو گیا تھا اب امرتسر کہاں۔

۱۹۴۷ء میں ۳۰رستمبر کو جب میں بٹالے سے واپسی امرتسر سے آخری بار گزرا تھا تو امرتسر کی سڑکیں لاشوں سے بھری ہوئیں تھیں۔ مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہوا میں خون کی بو رچی ہوئی تھی۔ فضا میں مار دھاڑ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ماحول تشدد کی بھڑاس سے متعفن ہو رہا تھا۔

امرتسر میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہمارے ڈرائیور نے فوجی ٹرک کو روک لیا تھا اور پھر اسے سڑک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا تھا۔ پوچھنے پر وہ خوفزدہ آواز میں بولا تھا۔ نہ بائی نہ جو ہم امرتسر میں داخل ہو گیا تو پھر کبھی باہر نہیں نکلے گا۔ بچنے کا صرف ایک راستہ ہے بائی کہ امرتسر کو کاٹ کر نکل جائیں۔ اگر نصیب والے ہیں تو نکل جائیں گے ورنہ ۔ ۔ نکل گئے تو صرف ایک خطرہ باقی رہ جائے گا۔ اٹاری۔

کھون ہی کھون

ہاں ہندوستان جانے کی آرزو کئی بار میرے دل میں ابھرتی لیکن .. .... ساتھ ہی ۳۰رستمبر کا وہ سفر یاد آ جاتا جب ہم ہمیشہ کے لئے بٹالہ چھوڑ کر لاہور آ رہے تھے۔

سڑک کے کناروں پر جا بجا یوں اوجھریوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جیسے علاقے میں عید قرباں منائی گئی ہو۔ فضا ان گلتی سڑتی لاشوں کی سڑاند سے متعفن تھی۔ کتے ان نہ ختم ہونے والی لاشوں کو بھنبھوڑ کر تھک گئے تھے اور اس چھائی ہوئی اکتاہٹ اور بھرے پیٹ کی

پیوست سے خوف زدہ ہو کر رو رہے تھے۔

اور ..... وہ بچہ۔ درخت کے تنے سے لپٹا ہوا۔ وہ بچہ۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پتھرا گئی تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے. کیوں ہو رہا ہے۔ وہ بچہ کیل سے درخت کے تنے میں ٹھکا ہوا تھا۔

دیہات خالی پڑے تھے۔ کھیت ویران تھے۔ جگہ جگہ مکانات سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر سڑک کے عین درمیان میں وہ چٹا سفید پاؤں جس کی مالکہ جھاڑیوں کے پیچھے ٹانگیں پھیلائے برہنہ پڑی ہوئی تھی۔ مسلسل تشدد کی وجہ سے اس کی کوکھ باہر نکل آئی تھی۔

اور ...... وہ دیوانہ خبطی لالہ جو ماحول کے تشدد کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا اور اس گھٹن سے نجات پانے کے لئے ہمارے ٹرک کے سامنے لیٹ گیا تھا۔ ”کچل دو مجھے کچل دو۔ میرے سر کو کھون چڑھ گیا ہے مجھے کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ میں تھک گیا ہوں۔ کھون بہا بہا کر تھک گیا ہوں۔ ہار گیا ہوں۔ مجھے کچل دو۔“

ٹرک رک گیا۔ وہ لالہ سڑک کے درمیان لیٹا ہوا ہچکیاں لے لے کر روئے جا رہا تھا۔ ”میرے سر کو کھون چڑھ گیا ہے۔ مجھے کچل دو۔“

ہاں کئی بار میرے دل میں خواہش ابھرتی کہ ہندوستان جاؤں۔ اپنا گاؤں بٹالہ دیکھوں۔ امرتسر۔ لیکن دفعتاً منظر خون آلود ہو جاتا۔ تشدد کی پچکاریاں چلتیں۔ نفرت اور حقارت کی آوازیں ابھرتیں۔ ہوس تذلیل کی بھڑاس اٹھتی اور پھر بغض و عناد کی خون آلود دیوار کھڑی ہو جاتی۔ نہیں میں ہندوستان نہیں جاؤں گا۔ میں نے جو ایک بار حقیقت میں بیتا ہے اسے دوبارہ ذہنی طور پر بیتنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ نہیں میں ہند نہیں جاؤں گا۔ وہ لاکھوں شہید جن کے خون سے بارڈر کی زمین ابھی تک سرخ ہے، وہ پوچھیں گے کہاں جا رہا ہے تو۔ یہ کیا کر رہا ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ نہیں. میں ہند نہیں جاؤں گا۔

پھر ۱۹۸۱ء میں چونتیس سال کے بعد دفعتاً میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہند جاؤں گا۔ میں یہ بھول گیا کہ ہند کی سرحد ابھی تک لاکھوں مسلمانوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے۔ میں یہ بھول گیا کہ مشرقی پنجاب میں لاکھوں شہید حیرت سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں تو کہاں جا رہا ہے۔ یہ تو کیا کر رہا ہے۔ ساری شرارت ہومیوپیتھی کی

تھی۔ ہومیوپیتھی کی لگن میں میں اتنا سرشار ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔

ہومیوپیتھی

ہومیوپیتھی سے میں ۱۹۴۰ء میں واقف ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے میری بیوی اچی سن ہسپتال میں پڑی تھی اور میں اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی چپ تھی۔ میں بھی چپ تھا۔ ایک دوسرے سے کہنے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہ رہا تھا اور وہ بات جو ہونی بن کر ہمارے سامنے کھڑی تھی، اسے کہنے کی نہ مجھ میں ہمت تھی نہ اس میں حوصلہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ جا رہی ہے۔ مجھے علم تھا کہ وہ رخصت ہو رہی ہے۔ ہمارے درمیان موت کھڑی تھی۔

ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ کوئی امید باقی نہ تھی۔ اس بھری دنیا میں ہم دونوں اکیلے تھے۔ نہ کوئی ہمدرد نہ رشتہ دار نہ ساتھی۔ اس لئے کہ ہم نے بڑے بوڑھوں کی رضا مندی حاصل کئے بغیر ملاپ کر لیا تھا۔ ہم نے مروجہ رسوم و روایات کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس کا بھیانک نتیجہ بھگت رہے تھے۔ اس زمانے میں بغاوت کو تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہم دونوں تحقیر کی دنیا میں رہتے تھے۔ وہ اور میں اور تحقیر سے بوجھل بے پایاں فضا نے ہم دونوں کو کبڑا کر دیا تھا___ کبڑا اور تنہا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔ پھر وہ مدھم سی آواز میں بولی "اب ہم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں"

"کچھ بھی نہیں" میں نے جواب دیا۔ "اب کرنے کو کیا رہ گیا ہے شان"

"کچھ بھی نہیں" وہ بولی۔

ہسپتال کے اس وسیع مگر ویران وارڈ نے آہ بھری۔ "کچھ بھی نہیں"۔

"چلو گھر چلیں" وہ بولی۔ "جو ہونا ہے وہیں ہو"

"چلو" میں نے کہا۔

پھر ہم ریل گاڑی میں بیٹھے قصور جا رہے تھے جہاں میں سکول ماسٹر تھا۔ گاڑی، کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں، ہو کتی ہوئی چل جا رہی تھی۔

پھر دفعتاً اس چھائی ہوئی مسلط و محیط ’کچھ بھی نہیں. سے امید کی ایک کرن

پھوٹی۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ لودھیانے کے کسی ڈاکٹر محمود کے حیرت انگیز معجزات کا ذکر کر رہے تھے۔

میں نے زیر لب کہا۔ "شان سن رہی ہو"

"ہاں" وہ بولی "سن رہی ہوں"

"چلو لودھیانے چلیں۔ چلوگی"

"جہاں جی چاہے لے چلو" ۔ وہ بولی۔ "کیا فرق پڑتا ہے"

ڈاکٹر محمود نے ایک پڑیا شان کے منہ میں ڈالی اور بولا۔ "جاؤ۔ جوں جوں گھر پہنچو گے اچھے ہوتے جاؤ گے"۔

ہم گھر پہنچتے گئے، شان اچھی ہوتی گئی____ اچھی ہوتی گئی۔ اور پھر چند ہی دنوں میں وہ کچھ بھی نہیں۔ سبھی کچھ، میں بدل گیا۔ زندگی پھر ہری ہو گئی۔ پھول کھل گئے..............

ہومیو پیتھی کے اس معجزے پر میں حیران تو ہوا لیکن مجھے یہ شعور نہ تھا کہ یہ معجزہ ہومیو پیتھی کا ہے۔ میں اسے معالج کا معجزہ ہی سمجھتا رہا۔ مجھے علم نہ تھا کہ محمود ایک ہومیو پیتھ ہے۔

جاننا ماننا

اگر میں یہ جان بھی لیتا تو شاید ماننے کی نوبت نہ آتی۔ جاننا اور بات ہے اور ماننا اور بات۔

ہم بہت سی باتیں جان لیتے ہیں مگر وہ ہمارا جزو ایمان نہیں بنتیں۔ جاننا صرف ذہن کو متحرک کرتا ہے، دل میں جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ عمل پر اپنا رنگ نہیں چڑھاتا۔ ایسا جاننا ذہن پر بوجھ کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

میری طرح بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سروں پر جاننے کی بھاری گٹھڑیاں اٹھائے پھرتے ہیں لیکن ماننے کی سبک روحی سے محروم ہیں۔

پھر ۱۹۵۴ء میں جب راولپنڈی میں کالج روڈ پر رہتا تھا تو ہمارے گھر کے پاس ہی ایک ہومیو پیتھ کی دکان تھی۔ ان کا نام رشید تھا۔

ایک روز میں نے کہا ”رشید صاحب کیا آپ کے پاس کوئی ایسی دوا بھی ہے جو انسان کی شخصیت کو بدل دے“۔

انہوں نے کہا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا“۔

میں نے کہا۔ ”ایسی دوا جسے کھا کر میں محسوس کروں کہ میں میں نہیں رہا“۔

انہوں نے کہا۔ ”ہاں ہے“۔

میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے“۔

”ہو سکتا نہیں۔ ہوتا ہے“۔ وہ بولے۔

”شرط رہی“۔ میں نے کہا۔

”رہی“ وہ بولے اور مسکرانے لگے۔

”تو دیجئے“۔

انہوں نے کہا۔ ”آج نہیں کسی روز دیں گے“۔

چھ مہینے گزر گئے۔ وہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔

ایک روز رشید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ دفعتاً وہ بولے۔ ”کیا آپ کو زکام کی شکایت ہے“۔

میں نے کہا۔ ”ہاں کچھ کچھ“۔

بولے۔ ”ایک خوراک کھالیں“۔

میں نے خوراک کھالی۔

اگلے روز جب میں سو کر اٹھا۔ تو سب کچھ عجیب سا لگا۔ چائے پینے لگا تو جی نہ چاہا۔ حیران۔ چائے اور اچھی نہ لگے۔ میں تو چائے کا رسیا تھا۔ سگریٹ سلگایا تو وہ کاٹنے کو دوڑا۔ بجھا دیا۔ پڑھنے بیٹھا تو جی نہ چاہا۔ لکھنے لگا تو ذہن خالی سپاٹ۔ میں رشید کے پاس دوڑا دوڑا گیا۔

بولے۔ ”کیا تکلیف ہے“۔

میں نے کہا۔ ”سب گڑبڑ ہے“۔

بولے۔ ”مثلاً“۔

میں نے کہا۔ ”یوں سمجھ لیجئے کہ میں میں نہیں رہا۔“۔

ہنسے۔ بولے۔ ”آپ شرط ہار گئے۔ چھ مہینے پہلے آپ نے پوچھا تھا کہ ہومیو پیتھی شخصیت کو بدل سکتی ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہومیو پیتھی کا اعجاز“۔

ہومیو پیتھی کا اعجاز جان کر بھی میں نے اسے نہ مانا اور میرا یہ تجربہ جزو زندگی نہ بنا۔

۱۹۷۵ء میں مجھے دورے پڑنے لگے۔ ہر آٹھ دس دن کے بعد دورہ پڑتا۔ اٹھا کر مجھے ہسپتال لے جاتے۔ انٹی ہسٹمنک کے ٹیکے لگاتے۔ ای سی جی کرتے۔ قے کی دوا دیتے۔ پھر چار ایک گھنٹے کے بعد میں گھر آ جاتا۔ جاتا تو یقین نہ ہوتا کہ واپس آؤں گا۔ ڈاکٹر کہتے تھے خوفناک قسم کی الرجی ہے۔

مجھے مرنے پر اعتراض نہ تھا۔ ستر سال گزار چکا تھا۔ آخر مرنا تو ہے ہی۔ لیکن مجھے ہسپتال میں مرنے پر سخت اعتراض تھا۔ انسان مرے تو اطمینان سے اپنے بستر میں مرے۔

میں نے اشفاق احمد سے کہا کہ یار کچھ کرو کہ آرام سے گھر میں مروں۔

وہ مجھے احمد خان کے پاس لے گیا۔

احمد خان زراعت کے محکمے میں بڑا افسر تھا۔ اتفاق سے ہومیو پیتھی کا معجزا دیکھا۔ اسے جانا۔ پھر مان لیا اور ساری زندگی ہومیو پیتھی کے لئے وقف کر دی۔

احمد خان کی دوا نے میرے دورے ختم کر دیئے۔ اس بات پر میں اتنا حیران ہوا کہ ہومیو پیتھی کو جاننے کے لئے بے تاب ہو گیا۔

مطالعہ کیا تو مزید حیران ہوا۔ یا اللہ یہ کیسا طریق علاج ہے کہ دوا جس قدر کم ہو گی اتنی ہی طاقت ور ہو گی۔ یہ بات تو کسی درویش ہی کو سوجھ سکتی ہے نہ عالم کو نہ محقق کو۔ یوں میں ہومیو پیتھی کو جاننے میں کھو گیا۔

انہی دنوں اشفاق حسین اسلام آباد گیا۔

اشفاق حسین میرا پرانا دوست ہے جسے میں ۱۹۴۰ء میں ملا تھا تاکہ اس سے راگ ودیا سیکھوں، سر سیکھوں، تال سیکھوں، ردھم جانوں تاکہ میری طبعی تلخی میں مٹھاس پیدا ہو۔

اشفاق حسین یہاں آنے سے پہلے کراچی میں مقیم تھا۔ اسے آٹھ ماہ سے چھوٹا بخار

آتا تھا۔ بیسیوں علاج کر چکا تھا۔ کوئی افاقہ نہ ہوا تھا۔ اشفاق حسین چند سال کیمسٹ کی دکان بھی چلا چکا تھا اس لئے اسے ایلوپیتھی سے واقفیت تھی۔ ضرورت سے زیادہ واقفیت تھی۔

ایک روز اشفاق حسین آیا تو میرے ہاتھ میں ہومیوپیتھی کی کتاب دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”یہ کیا ہے“۔

میں نے کہا۔ ”دیکھ لو“۔

اتفاق سے کتاب کھولی تو نائیٹرک ایسڈ کا بیان نکل آیا۔ لکھا تھا۔ اگر پیشاب سے گھوڑے کے پیشاب کی بو آئے تو نائیٹرک ایسڈ مفید رہتا ہے۔

کہنے لگا۔ ”یار۔ میرے پیشاب سے ایسی بو آتی ہے۔ ایک خوراک مجھے دو“۔

وہ ایک خوراک کھائی تو اشفاق حسین کا آٹھ مہینے پرانا بخار ٹوٹ گیا۔ اس پر وہ تو پاگل ہو گیا اور یوں ہومیوپیتھی کا پروانہ بن گیا۔

پھر ہم دونوں اکٹھے ہومیوپیتھی پڑھنے لگے۔ مسعود کے بیٹے محبوب الٰہی اور خالد نے ہماری رہنمائی کی۔ جتنی کتابیں یہاں دستیاب تھیں سب پڑھ لیں تو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہندوستان میں چھپی ہوئی کتابیں پڑھیں۔ ہندوستان ہومیوپیتھی کا گھر ہے۔ مغرب میں فرانس، مشرق میں ہند۔ وہاں سے کتابیں منگوا نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا سوچا ہند چلیں۔

یوں ہند جانے کا منصوبہ آپ ہی آپ بن گیا اور میں بھول گیا کہ سرحد کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے ابھی تک رنگین ہے اور مشرقی پنجاب کے لاکھوں شہید حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھ رہے ہیں کہ کہاں جا رہے ہو، یہ تم کیا کر رہے ہو۔

عرضی پھر عرضی

بے شک ہم نے ہند جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن فیصلوں سے کیا ہوتا ہے۔ زندگی میں میں نے اتنے فیصلے کئے، مصمم ارادے کئے۔ اگر ان میں سے چوتھائی بھی پورے ہو جاتے تو میری زندگی کا دھارا کسی اور رخ پر بہہ رہا ہوتا۔ میرا کردار فقیر کی گدڑی کی طرح پیوند زدہ نہ ہوتا۔ میری صلاحیتیں یوں زنگ آلود نہ ہوتیں۔ وہ سارے فیصلے نیک خواہشات

سے آگے نہ ابھر سکے۔

اگرچہ ایک جنون اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ لیکن میرا جنون بھی تو نون غنا والا جنوں ہے۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ ہم سرحد پار جاتے۔ کون پاسپورٹ کے جھمیلوں میں پڑے۔ کون ویزا کے دفتر کے پھیرے لگائے۔

اتفاق سے ہمارے پڑوس میں ایک ڈپٹی سیکرٹری رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ یارو۔ کہاں این او سی کے بکھیڑوں میں پڑو گے۔ ویزا کے لئے در در کی خاک چھانو گے۔ زائروں کے کسی جھتے میں شامل ہو جاؤ۔ ایک پنتھ دو کاج۔ بابا کو سلام بھی کر لینا۔ عرس میں حاضری بھی لگوا لینا۔ ہومیوپیتھی کی کتابیں بھی لے آنا۔ امیر خسرو کا عرس اگست میں ہو رہا ہے۔ بس ایک عرضی داغ دو۔ نام نکل آیا تو واہ۔ ورنہ پھر عرضی۔ پھر عرضی۔ پھر عرضی۔

ہم دونوں نے مذہبی امور کے نام دو عرضیاں داغ دیں۔ اسی رات امیر خسرو نظر آئے۔

لٹکا ہوا منہ موڑے بیٹھے تھے۔

میں نے عرض کی، "عالی جاہ ہم تو حاضری کے لئے کوشاں ہیں، آپ منہ موڑے بیٹھے ہیں"۔

بولے۔ "اپنے شوق نبھانے کو آتے ہو۔ ہمارا نام مفت میں بدنام کرتے ہو۔ کوئی بنارسی ساڑھیاں خریدنے آتا ہے۔ کوئی بیٹی کا جہیز بنانے آتا ہے۔ کوئی دلی کا نظارہ کرنے آتا ہے۔ کوئی رشتہ داروں دوستوں سے ملنے آتا ہے۔ کوئی ناجائز کاروبار کی ہوس لے کر آتا ہے۔ ہمارا نام تو مفت میں بدنام ہے۔ ہمارے لئے آؤ تو جانیں"۔

میں نے ایک دوست سے بات کی۔ میں نے کہا۔ "یار بات بنتی نظر نہیں آتی"۔

"کیوں" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "امیر منہ موٹا کئے بیٹھے ہیں، کہتے ہیں ہمارے لئے آؤ تو جانیں"۔

"میں نہیں" مانتا۔ وہ بولا۔ "اگر امیر خالی بزرگ ہوتے تو شاید اس بات پر

آزردہ خاطر ہوتے۔ بھئی وہ تو بزرگ ہونے کے علاوہ بہت بڑے دانشور ہیں، عالم ہیں، فن کار ہیں اور تم بھی تو علم کے حصول کے لئے جا رہے ہو"۔

اس کی بات سے اگرچہ ڈھارس بندھی لیکن میں ڈانواں ڈول ہی رہا۔

دراصل میں خود شرمندہ تھا۔

زندگی بھر میں نے ایسا کیا۔ کام کچھ کیا۔ نام کچھ لیا۔ خود کو دھوکا دیتا رہا۔

دوسروں کو دھوکا دیتا رہا۔

حج آفس

پھر دفعتاً ایک روز ایک لمبا لفافہ موصول ہوا۔ کھولا تو دیکھا۔ لکھا تھا آپ کا نام زائرین کی پارٹی میں قرعہ اندازی سے نکل آیا ہے۔ آپ اپنا پاسپورٹ شناختی کارڈ اور ۷۱۰ روپے کا بنک ڈرافٹ لا کر فلاں تاریخ کو دفتر میں جمع کرا دیں۔

اشفاق حسین اور میں اس پر اتنے حیران ہوئے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ ارادہ اتنی جلدی حقیقت میں بدل جائے۔ اشفاق حسین حیران تھا کہ یہ کیا ہوا۔ اس میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔

مقررہ تاریخ سے پہلے اشفاق حسین نے کہا۔ "یار کاغذات تو دینے ہی ہیں۔ تم جا کر دے آؤ۔ آج ہی۔ تم ایک جانے پہچانے شخص ہو۔ تم نے حج پر ایک کتاب جو لکھی ہے۔ وہ تمہیں فوراً پہچان لیں گے۔ اس طرح آسانی ہو جائے گی"۔

اشفاق حسین کے کہنے پر میں کاغذات لے کر حج دفتر جا پہنچا۔

اسلام آباد کی ایک پر فضا اور پر رونق سڑک پر وہ ایک ویران اور اداس بنگلہ تھا۔ باہر سے یوں نظر آتا تھا جیسے سالہا سال سے غیر آباد ہو۔ ڈرتے ڈرتے میں اندر داخل ہوا۔ ایک مختصر سے خالی خالی کمرے میں دو ٹوٹی ہوئی میزوں پر دو افراد یوں بیٹھے تھے جیسے وفات پر افسوس کرنے آئے ہوں۔

انہوں نے چونک کر میری طرف یوں دیکھا جیسے کسی کا کمرے میں آنا ایک غیر از معمول بات ہو۔ اس ماحول کو دیکھ کر میں خود سہم چکا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے پاس بیٹھ کر صف ماتم میں شریک ہو جاؤں اور فاتحہ پڑھنے کے لئے ہاتھ اٹھالوں۔ لیکن مجھ میں ہمت

نہ پڑی۔ میں نے مدھم آواز میں کہا جناب مجھے سیکشن افسر صاحب سے ملنا ہے۔

ایک نے سامنے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ بولا۔ "اوپر۔ سیڑھیاں چڑھ کر"۔

میں دروازے سے باہر نکل گیا۔

وہ ریسپشن تھی۔ خالی ویران اداس۔ ایک بوسیدہ سا زینہ اوپر جا رہا تھا۔ زینے کے پاس ایک چپڑاسی ٹوٹے ہوئے سٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

حیرانی سے میں اس اداس ویران بے آباد ریسپشن کو دیکھتا رہا۔ یا اللہ اس حسین شہر میں، اس شاداب سڑک پر واقع اس بنگلے کو غیر آباد ویران اور اداس بنانے میں ان لوگوں نے کتنی محنت کی ہو گی۔ کیا یہ حج آفس ہے۔ کیا یہ دفتر ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں مکہ اور مدینے شریف سے بلاوا آتا ہے۔ جہاں حج کے ذوق سے سرشار پروانے آتے ہیں، وہ لوگ خوشی کے مارے جن کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے، جو حاضری کی خوش قسمتی پر پھولے نہیں سماتے۔

کیا یہ جمہوریہ اسلامی کا حج کا دفتر ہے۔ اس خداداد مملکت کا جو اسلام کے نام پر بنی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ضرور میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ اس سے تو مندرہ کے سٹیشن پر چکوال جانے والے مسافروں کا ویٹنگ ہال کہیں زیادہ آباد ہے۔

دفعتہً سٹول پر بیٹھے ہوئے چپڑاسی نے آنکھ کھولی۔ میری طرف دیکھا۔ انگوٹھے سے زینے کی طرف اشارہ کیا اور پھر سے اونگھنے لگا۔

یا اللہ کیا میں کافکا کے کاسل میں آ نکلا ہوں۔ کیا یہ عالم برزخ ہے۔ کیا یہ سب فوت شدہ لوگ ہیں۔ زینہ چڑھتے ہوئے مجھ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔

زینے کے عین پہلو میں سیکشن آفیسر کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

میں نے اندر جھانکا۔ ایک غسلخانہ نما کمرے میں ایک خشونت بھرا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بہت بڑا کاغذ تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص مودب ماتحت کھڑا تھا۔

مجھے دیکھ کر سیکشن افسر چونکا اور خشمگین نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو تم۔ کیوں آئے ہو۔

"جناب میں .... مجھے کاغذ دینے ہیں"۔

اس نے انگلی سے اشارہ کیا "ادھر دو"

چپ چاپ میں انگلی کے اشارے کی سیدھ میں چل پڑا۔ وہاں ایک اور سٹور نما کمرا تھا۔ اسی ماحول میں رنگا ہوا۔ کمرے میں ایک میز تھی۔ کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اپنے کاغذات آگے بڑھا دیئے۔ اور خود اجازت لئے بغیر کرسی پر بیٹھ گیا۔

نور دین

عین اس وقت مجھے اشفاق حسین کی بات یاد آگئی۔ او ہو میں تو ممتاز مفتی ہوں۔ میں نے حج پر ایک کتاب لکھی ہے۔ حج آفس والے ضرور پہچان لیں گے۔ ابھی ابھی یہ شخص کاغذات میں میرا نام پڑھے گا ممتاز مفتی تو اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا آپ! آپ ممتاز مفتی ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھائے گا۔ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرے گا۔ ہمارے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ آپ زائرین پارٹی کے ساتھ عرس پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ غالباً سفر نامہ تو ضرور لکھیں گے۔ میں نے آپ کی لبیک پڑھی ہے۔ چائے کا ایک پیالہ پیش کروں۔

"ہوں" ــــ اس نے کاغذات کا سرسری جائزہ لے کر سر اٹھایا اور یوں میری طرف دیکھا جیسے میں ممتاز مفتی نہیں نور دین تھا۔

میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

"جناب یہ کاغذات میرے ساتھی کے ہیں"۔ میں نے یوں لجاجت سے بات کی جیسے میں واقعی نور دین تھا۔

نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حج آفس کے کارندے نے لبیک نہ پڑھی ہو۔ لازماً حج آفس کی لائبریری میں پڑی ہوگی۔ ضرور کوئی غلطی ہے۔ کہیں نا کہیں کوئی نا کوئی غلطی ہے۔ ورنہ ورنہ ورنہ ــــ

اس نے دوبارہ سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ اکتاہٹ سے سوجا ہوا تھا۔ "ٹھیک ہے"۔ وہ کاغذات دراز میں رکھتے ہوئے بولا۔

“جناب ان کاغذات کی رسید دیں گے”۔ نور دین بولا۔

“رسید”۔ اس نے خشمگین نگاہ ڈالی۔

“ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے”۔ نور دین نے اپنی گستاخی کو رد کرنے کے لئے کہا۔ “کوئی پروگرام۔ میرا مطلب ہے۔ یعنی جانے کا پروگرام”۔

“پروگرام”؟ اس نے پھر گھور کر دیکھا۔

“میرا مطلب ہے ہمیں کب روانہ ہونا ہے۔ کب پہنچنا ہے۔ کیا کیا سامان”۔

اس تے ہاتھ کے اشارے سے نور دین کو خاموش کر دیا۔ پروگرام جب بنے گا بھیج دیں گے۔

نور دین عالم بے بسی میں اٹھ بیٹھا۔ “جی بہت اچھا۔ بہت اچھا”۔

“دیکھو” وہ بولا۔ “کاغذات جمع کروا دینے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ لوگ خود کو زائرین پارٹی میں شامل سمجھنا شروع کر دیں۔ ہم کاغذات کو پروسیس کریں گے۔ پھر آخری فیصلہ ہو گا کہ پارٹی میں کون کون لوگ شریک ہیں۔ سمجھے”۔

“جی سمجھ گیا”۔ بالکل سمجھ گیا۔

میں وہاں سے بھاگا۔ یوں بھاگا جیسے مجرم جائے واردات سے بھاگتا ہے۔

میں نے کہا نہ تھا

مسجد روڈ پر پہنچ کر مجھے گویا پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اسلام آباد کس قدر خوبصورت شہر ہے اور سیکریٹریٹ کو جانے والی وہ سڑک جس پر حج آفس واقع ہے لمبے لمبے سانس لینے کے لئے کس قدر موزوں ہے۔

اشفاق حسین میرا انتظار کر رہا تھا۔ “کیوں دے دیئے کاغذات”۔

“ہاں دے دیئے”۔

“ٹھیک ٹھاک”۔

“ہوں۔ ٹھیک ٹھاک”۔

“انہوں نے تمہیں پہچان لیا ہو گا”۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں۔

"دیکھانا"۔ وہ بولا۔ "میں نے کہا نہ تھا کہ وہ تمہیں پہچان لیں گے اور کاغذات منظور کر لیں گے"۔

"ہاں ہاں"۔ میں نے کہا۔ "تم نے کہا تھا"۔

"جانے پہچانے آدمی کے ساتھ زیارت پر جانے میں بڑی سہولتیں ہوتی ہیں۔ مجھے پتہ ہے۔ پروگرام دیا انہوں نے"۔

"پروگرام ___ ہاں پروگرام"۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "ابھی پروگرام طے نہیں ہوا"۔

"کیا کہا؟ پروگرام طے نہیں ہوا"۔

"کیسے ہو سکتا ہے بھائی۔ ابھی انہیں فارن آفس سے ملنا ہے۔ انڈین ایمبیسے سے بات کرنی ہے۔ ویزے لینا ہیں. این او سی لینے ہیں۔ ان مرحلوں کو طے کرنے کے بعد ہی پروگرام بنے گا نا۔ بیچارے بہت مصروف ہیں"۔

"اوہ" ___ وہ بولا۔ "یہ بھی ٹھیک ہے۔ بہرحال انہوں نے تمہیں تفصیلی اطلاع دے دی۔ ہر کسی کو تفصیلی اطلاع تو نہیں دیتے نا"۔

"اونہوں. بالکل نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ٹھنڈا گرم پوچھا ہو گا"۔

"بالکل بالکل۔ چائے کچھ زیادہ ہی میٹھی تھی"۔

"بہرحال ۱۷ کو روانگی تو طے شدہ بات ہے نا"۔

"بالکل طے شدہ"۔

"تو پھر تم فکر کو اطلاع دے دو نا"۔

فکر تونسوی

فکر تونسوی۔ میرا ایک پرانا دوست ہے۔

تقسیم سے پہلے ہم دونوں مل کر ادب لطیف کو ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ کام کا ایڈیٹر وہ تھا نام کا میں۔ وہ شاعر تھا میں نثر نگار تھا۔ وہ محنتی تھا میں ورشنی تھا۔ وہ خاموش تھا۔ میں تکلم زدہ تھا۔

تقسیم کے بعد اس کا لاہور میں رہنا مشکل ہو گیا۔ چونکہ وہ ہندو تھا۔ نام شائد رام لال تھا یا کیا۔ مکتبہ اردو کے مالک چوہدری برکت علی نے کہا اگرچہ فکر نام کا ہندو ہے پھر بھی فضا بڑی مکدر ہے۔ کوئی نام اور کام کا فرق نہیں رہا۔ فکر ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کی سلامتی ہمارا فرض ہے۔ یہ سن کر ہم سب نے فیصلہ کیا کہ فکر کو ہندوؤں کے ریفوجی کمپ میں چھوڑ آئیں۔ تقسیم سے متعلق واقعات نے فکر اور مجھ پر بے حد اثر کیا۔ فکر جو مذہب سے بے نیاز تھا، بے زار ہو گیا۔ میں جو مذہب سے کورا تھا مسلمان بن گیا۔

ہند میں جا کر فکر نے اپنے قلم کو تلوار بنا لیا اور سماج کے خلاف تیغ زنی کرنے لگا۔ اس کی طنز میں شدت سے کاٹ تھی اس لئے وہ روز نامہ ملاپ کا معروف کالمسٹ بن گیا۔

چند ماہ پہلے فکر پاکستان آیا تھا۔ لاہور میں اس نے مختلف ادبی محفلوں میں شرکت کی تھی۔ دانشوروں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ دعوتیں اڑائیں۔ تنقیدیں کیں۔ تھیں لیکن وہ اسلام آباد تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے پاؤں پر سے رکشے کا ایک پہیہ گزر گیا اور وہ مجبوراً لنگڑاتا واپس دلی جا پہنچا۔

میں نے فکر کو خط لکھا۔ میرے دلی آنے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ میں ہومیوپیتھی کے طالب علم کی حیثیت سے آرہا ہوں لیکن زائر کا روپ دھار کے آؤں گا۔ میں ادیب کی حیثیت سے نہیں آرہا۔ اس لئے خبر دار کسی کو اطلاع نہ کرنا کہ میں آرہا ہوں۔

جنتر منتر

سچی بات یہ ہے کہ میں ہند کی پالیسی سے خائف ہوں۔ ہند کی پالیسی یہ ہے کہ جو آئے چاہے وہ ادیب ہو، گویا ہو۔ مصور ہو، دانش ور ہو. اسے اپنا لو۔ سر آنکھوں پر بٹھاؤ. وارے نیارے جاؤ۔ آنے والے سے کہو ہم تو بھائی بھائی ہیں اور یہ بارڈر کی لکیر جس نے ہمیں الگ الگ کر دیا ہے جھوٹی ہے۔ ہماری زبان ایک ہے۔ لباس ایک ہے۔ رہن سہن ایک سا ہے۔ مسائل ایک سے ہیں۔ پھر تقسیم کیسی بھائی بھائی کو کوئی الگ کر سکتا ہے بھلا۔

صاحبو ہندو قوم ایک عظیم قوم ہے۔ اس میں اپنا لینے کی اتنی قوت موجود ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بڑی بڑی قومیں آئیں۔ بڑے بڑے مذہب آئے لیکن ہندو نے سب کو اپنا لیا، جذب کر لیا۔

مثلاً بدھ مت آیا۔ بدھ مت ایک عظیم مذہب تھا۔ ایک ایسا مذہب جس نے سارے ایشیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام ایشیائی ممالک پر چھا گیا تھا۔

بدھ مت نے آکر اندر کے انسان کو جگایا۔ بڑے چھوٹے کے امتیازات مٹا دیئے۔ سارے انسانوں کو ایک مرتبہ بخش دیا۔ انسانیت کا مرتبہ۔

اس کے برعکس ہندو مت باہر کے انسان کو مانتا تھا۔ بڑے چھوٹے کا قائل تھا۔ امتیازات کے بل بوتے پر قائم تھا۔ اونچ نیچ اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔

بدھ مت سارے ہند پر چھا گیا۔ لیکن پتہ نہیں ہندو نے کیا جادو پھونکا۔ کون سا جنتر منتر پڑھا کہ اتنے عظیم اور منفرد مذہب کو خود میں جذب کر لیا۔ ایسا اپنایا کہ اس کی انفرادیت ختم کر کے رکھ دی۔ آج اس کا نشان تک نہیں ملتا۔

پھر جین مت آیا۔ وہ بھی ہندوازم میں جذب ہو کر رہ گیا۔

پھر سکھ مت ابھرا۔ سکھ کے اوصاف ہندو سے یکسر مختلف ہیں۔ سادہ مزاج، جو شیلا، جذباتی، صحت مند، مخلص، ہندو نے اسے بھی اپنا لیا اور آج سکھ مت کی حیثیت ایسی ہے کہ جیسے وہ ہندوازم کی ایک شاخ ہو۔ وہ تو شکر ہے کہ سکھ اپنی پانچ خصوصیات کچھ، کڑا، کرپان، کیس اور کنگھا سے زبردستی چمٹا ہوا ہے۔

اگر وہ کیس اور پگڑی کی خصوصی انفرادیت کو تیاگ دیتا تو آج ہم ہند میں سکھ کو ڈھونڈتے پھرتے۔

ہندو کی اس اپنائیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے دھرم کو یوں اپنا لیتا ہے کہ اس کی انفرادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے لیکن خود ہندو پر آنچ نہیں آتی۔ وہ دوسروں کو جذب کر لیتا ہے خود جذب نہیں ہوتا۔ وہ اس لئے اپناتا ہے کہ خود کو تقویت دے۔ دوسرے کو معدوم کر کے رکھ دے۔

کوکڑو

ہندو کو مسلمان سے شکایت ہے کہ وہ سالہا سال ہندو کے ساتھ رہا۔ اس قدر قریب جیسے بھائی بند ہوتے ہیں لیکن ہندو اُسے جذب نہ کر سکا۔ ارے یہ کیا شے ہے جو ہند کی دیگ میں اتنی دیر آنچ پر پڑی رہی لیکن گلی نہیں۔ ایسا کوکڑو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہم نے انہیں لاکھ اپنایا لیکن یہ ہم میں جذب نہ ہوئے۔ حالانکہ سکھوں کی طرح مسلمانوں میں کوئی خصوصی جسمانی پہچان بھی نہیں تھی پھر بھی یہ الگ نظر آتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اب ایک اپنا ملک پاکستان قائم کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ صاحبو میں ہندو کے غصے سے نہیں ڈرتا حالانکہ میں نے تقسیم کے وقت اس کا راکشسی روپ دیکھا ہے۔ میں ہندو کے پیار سے ڈرتا ہوں۔

ہند جانے سے گریز کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ڈرتا تھا اپنائے جانے سے۔ ڈرتا تھا سر آنکھوں پر بٹھائے جانے سے میں ایک کمزور آدمی ہوں مجھ میں اخلاقی مضبوطی نہیں ہے۔ اگر کوئی دونوں ہاتھ جوڑ کر کمال عجز سے کہے مہاراج ہم تو ایک ہیں اور بارڈر کی یہ لکیر جو ہمیں جدا کرتی ہے جھوٹی ہے۔ میں اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں مہاراج میں آپ میں سے نہیں ہوں۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ ہمارے رہن سہن الگ ہیں۔

جب میں نے ہند جانے کا فیصلہ کیا تھا تو ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ میں کسی ادبی محفل میں شریک نہیں ہوں گا۔ کسی ہندو قلم کار بھائی سے نہیں ملوں گا۔ میل ملاپ ویسے بھی میری شخصیت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ میں پیدائشی طور پر ایک چھوٹا اور اکیلا آدمی ہوں۔ مجھے گمنامی پسند ہے۔

لیکن اگلے روز ہی جب میں مہدانی سرفراز کے گھر ایک تقریب پر گیا تو دیکھا کہ بھانڈہ پھوٹ چکا ہے۔ اور میرے ہند جانے کی خبر یہاں وہاں سبھی جگہ پہنچ چکی ہے۔

منصور قیصر بولا۔ "مفتی صاحب مبارک ہو"

"کس بات کی؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی ہند جا رہے ہو"۔

"تمہیں کس نے کہا"۔

"اخبار میں نام چھپ چکا ہے۔ مذہبی امور والوں نے زائروں کی فہرست چھپوا دی

ہے "۔ اختر امان بولا۔

"مخول نہ کرو یار "۔ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"سچی "۔ مہارانی سرفراز بولی۔

ادھر سے منشایاد بولا۔ ادھر سے مظہر کی آواز سنائی دی۔ اس پر فراز نے قہقہہ لگایا۔

ساری محفل چہ میگوئیاں کرنے لگی۔

منصور قیصر کہنے لگا۔ "مفتی جی میں نے تو منیر شیخ کو بھی لکھ دیا ہے "۔

"فکر تونسوی سے تو آپ ملیں گے ہی "۔ مظہر ہنسا۔

میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری لٹیا ہی ڈوب گئی ہو۔

ہشیار باش

اگلے روز حج آفس سے ایک خط موصول ہوا۔ جس نے جلتی پر تیل ڈال دیا۔

اس خط میں ہند کے دورے کا پروگرام ملفوف تھا۔ ساتھ ہی لکھا تھا کہ وہاں کسی محفل میں شرکت سے گریز کیا جائے۔ کسی مجلسی تقریب میں شمولیت نہ کی جائے ورنہ وفد کا لیڈر مجاز ہو گا کہ آپ کو بلیک لسٹ کر دے۔ اس صورت میں مستقبل میں آپ ہند میں کسی زیارت پر جانے کے نااہل قرار دے دیئے جائیں گے۔

واہ جواب نہیں۔ میں نے سوچا۔ خود ہی تشہیر کرتے ہیں پھر خود ہی دامن تر مکن ہشیار باش کا مشورہ دیتے ہیں۔ ۔ خبردار بھی کرتے ہیں۔ تادیبی کارروائی کی دھونس بھی دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کمزور اور بے بس کا غصہ بہت شدید ہوتا ہے۔ میں نے دل ٹھنڈا کرنے کے لئے حج آفس کو ایک خط لکھا۔

عالی جاہ۔ زائرین کے نام اخبار میں تشہیر کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ اس طرح جانے پہچانے لوگوں کے لئے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر آپ ڈانٹتے بھی ہیں کہ خبردار دامن تر نہ ہو اور جناب والا! زائرین کے ہر وفد میں ایک نا ایک جانا پہچانا فرد تو ہوتا ہی ہے۔ اللہ کے واسطے اخبار میں زائرین کے نام تشہیر کرنے کی رسم بند کر دیجئے۔

بے بس آدمی کو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی کتنی لجاجت کرنی پڑتی ہے۔

مجھے یقین ہے میرا وہ خط آج بھی جج دفتر کے کسی ٹوٹے ہوئے دراز میں کسمپرسی کی حالت میں پڑا ہو گا اشفاق حسین بہر حال بہت خوش تھا کہ ہند جانے کی بات بالکل پکی ہو گئی لیکن ساتھ ہی وہ سخت گھبرایا ہوا تھا کہ اب کیا ہو گا۔

کیما فلاجی بیماری

اگرچہ اشفاق حسین ہند جانے کے لئے بے حد مشتاق تھا۔ ساتھ ہی وہ ہند خانے سے خائف بھی تھا۔

دراصل وہ بیمار تھا۔ اس کی بیماری بڑی پر اسرار تھی۔

ہومیوپیتھی جاننے سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ بیماری ایک سادہ مزاج اور صاف گو کیفیت ہے۔ وہ آتے ہی الارم بجاتی ہے۔ یا تو درد شروع ہو جاتا ہے یا بخار آنے لگتا ہے۔

اس الارم سے بیماری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرد کو جھنجھوڑ کر جگائے۔ بھائی تمہارے جسم میں کوئی خرابی ہے۔ اس کی طرف توجہ کرو، اپنا علاج کراؤ اور اچھے ہو جاؤ۔

پھر ہم معالج کے پاس جاتے ہیں تو وہ چپکے سے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے، میں فلاں بیماری ہوں، میرا نام یہ ہے۔ جسم کے فلاں عضو کی خرابی کی وجہ سے میں نازل ہوئی ہوں۔

ہومیوپیتھی پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ بیماری اتنی سادہ مزاج اور صاف گو نہیں ہوتی بلکہ عورت کی طرح اپنا اتہ پتہ نہیں دیتی۔ چھپی کہیں ہوتی ہے اشارے کسی اور جگہ کی جانب کئے جاتی ہے تاکہ ہماری توجہ صحیح مقام کی طرف مبذول نہ ہو۔ ایسا زنانہ مزاج پایا ہے کہ پلا مار کر دیئے بجھاتی ہے۔ خود کو کیما فلاژ کرنے میں اس کا جواب نہیں۔ مثلاً میرا دوست احمد بشیر کچھ دیر سے بیمار ہے۔ اس کی بیماری کے کوائف ملاحظہ ہوں۔

سارا دن وہ بڑا خوش باش رہتا ہے۔ پڑھتا ہے، لکھتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے۔ جی چاہے تو چلتا پھرتا بھی ہے۔ ویگنوں میں کھجل ہوتا ہے۔ دیکھنے میں یوں لگتا ہے جیسے صحت مندی کا نمونہ ہو۔

رات کو زینو کے ساتھ شطرنج کھیلتا ہے، گپ لگاتا ہے اور پھر سو جاتا ہے

جب رات کا ایک بجتا ہے تو بیماری کمین گاہ سے نکل کر اپنا دھو تو بجاتی ہے۔

گیس کی وجہ سے پیٹ پھولا ہوتا ہے۔ پھر ڈکار آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ خاموش نہیں متکلم ڈکار — بڑام — بڑو بڑام۔

گھر والے جاگ اٹھتے ہیں۔ محلے والے گھبرا جاتے ہیں۔ یہ کیسا ساز بج رہا ہے۔

احمد بشیر اس دوران میں یوں ابھرتا سمٹتا ہے جیسے کسی دھنکی کی زد میں آ گیا ہو۔

تین بجے تک یہ جل ترنگ بجتا رہتا ہے پھر مدھم پڑ جاتا ہے اور وہ سو جاتا ہے۔

صبح آٹھ نو بجے جب وہ جاگتا ہے تو یوں جیسے سو فیصد صحت مند ہو۔ تکلیف کی کوئی بات ہی نہ ہو۔ سارا دن خوش باش رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اگلی رات پھر ایک بجے بیماری کا گھوگو بجتا ہے۔ اور پھر وہی بڑام — بڑام — بڑو بڑام۔

میری ایک عزیزہ ہیں۔ ادھیڑ عمر کی خاتون ہیں۔ سارا دن وہ باورچی خانے میں بڑے شوق سے اپنی بساط سے زیادہ کام کرتی ہیں۔ رات کو تھک کر سو جاتی ہیں۔

صبح سویرے جب وہ جاگتی ہیں تو یوں محسوس کرتی ہیں جیسے جسم میں جان نہ ہو۔ ناطاقتی اور مردنی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جیسے دو دن سے مری ہوئی ہوں۔ جسم فوت ہو چکا ہو صرف روح باقی رہ گئی ہو۔ گھر والے زبردستی ان کے منہ میں چائے کے چند گھونٹ ڈالتے ہیں۔ پھر اجابت محسوس ہوتی ہے۔ بیٹیاں گھسیٹ گھسات کر باتھ روم میں لے جاتی ہیں۔

دو تین مرتبہ اسہال کی صورت اجابت ہوتی ہے۔ پھر جسم میں پھر سے زندگی کی کرنٹ چلنے لگتی ہے۔ مردہ جسم میں جان پڑ جاتی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھتی ہیں اور پھر بڑے ذوق شوق سے باورچی خانے کے کام میں یوں جت جاتی ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے انہیں کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ اگلی صبح پھر وہی دو گھنٹے کی مردنی انہیں آ دبوچتی ہے۔

یہ کیسی بیماری ہے۔ دو گھنٹے کی موت اور پھر ۲۲ گھنٹے کی بھرپور زندگی۔

جوں جوں ہمیں مرض اور مریضوں سے واسطہ پڑ رہا ہے توں توں بیماری کے انوکھے اور حیرت انگیز روپ سامنے آ رہے ہیں۔

بیمار معالج

اشفاق حسین کی بیماری بھی خود کو فلاج کئے بیٹھی تھی کہ کہیں ڈائیگنوسز نہ ہو جائے۔ بھید نہ کھل جائے۔

اشفاق حسین کے سر میں کوئی جانور چھپا بیٹھا تھا۔ وہ پنجہ مارتا تھا۔ جونہی پنجہ لگتا۔ سارے جسم کی طنابیں ڈھیلی پڑ جاتیں۔ جان نکل جاتی اور پیچھے دھڑ ہی دھڑ باقی رہ جاتا۔

اشفاق حسین نے اپنے گھر میں خیراتی مطب کھول رکھا ہے۔ مریض آتے ہیں دوا کھاتے ہیں۔ پرانے لاعلاج امراض ۶۰ فی صد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسے اپنے مرض کا پتہ نہیں چلتا۔ بڑی کاوش سے اپنے سمپٹم لکھتا ہے۔ کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ دواؤں کی خاصیتیں دیکھتا ہے۔ داوئیں کھاتا ہے۔ لیکن ہر دوا تکلیف کو بڑھا دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سر میں پنجہ مارنے والا جانور غصے میں آ جاتا ہے علاج مت کرو ورنہ خمیازہ بھگتو۔

ہمارے ایک درویش صفت دوست کوئٹہ سے آئے تھے۔ اشفاق حسین کی بیماری کے کوائف سن کر مسکرائے۔ بولے۔ جو اللہ کے نام پر لوگوں میں شفا بانٹتا ہے۔ وہ خود صحت مند نہیں رہ سکتا۔

اسے تو صحت مند رہنا چاہئے تاکہ زیادہ خدمت کر سکے۔ میں نے کہا یہ تو الٹی بات ہوئی۔

وہ مسکرائے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ چاہے الٹی چلائے چاہے سیدھی۔ اسے کون پوچھ سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ بیماری رحمت ہو۔

"بیماری۔ رحمت ہو"؟ میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں"۔ وہ بولے۔ "اللہ تعالیٰ کسی کے ہاتھ میں شفا بخش دیں تو یہ امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ معالج کے دل میں شوکت نفس پیدا ہو جائے کہ میری دوا سے شفا ہو رہی ہے۔ اگر معالج کو ایک بیماری لگ جائے جو دور نہ ہو تو اسے ہر وقت احساس رہتا ہے کہ میری تجویز شدہ دوا کچھ بھی نہیں"۔

خیر چاہے کوئی بھی وجہ ہو اشفاق حسین گذشتہ چھ ماہ سے بیمار تھا اور چونکہ وہ طبعی طور پر ایک محتاط معالج کی ذہنیت کا مالک ہے۔ اس لئے اس نے چھ ماہ سے احتیاطی تدبیریں عمل

میں لا رکھی ہیں۔

چار مہینے سے وہ مسلسل دو وقت ابلا ہوا کدو کھا رہا ہے جس میں نہ گھی ہوتا ہے۔ نہ نمک۔ ناشتے میں وہ صرف وہی کھاتا ہے۔

بے شک اسے بند جانے پر بہت خوشی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اسے اپنی غذائی احتیاط کا فکر دامنگیر تھا۔ کیا سفر وہ اپنی احتیاطیں قائم رکھ سکے گا۔ سفر کی دقتیں برداشت کر سکے گا۔ دلی پہنچ کر چل پھر سکے گا۔ اور اگر سر کے پنجہ باز نے شرارت کی تو کیا ہو گا۔

بہر طور یہ تھا میرا ہم سفر۔ احتیاطوں کی گٹھڑی۔ اندیشوں کا پلندہ۔ کچ کے گلاس کی طرح نازک۔ ٹھوکر کھانے کے خوف میں مبتلا۔

اس سفر میں ہم دونوں ساتھی تھے۔ اشفاق حسین اور میں۔

روانگی

ہدایات کے مطابق تمام زائرین کو لاہور میں سترہ اگست کی صبح ۸ بجے داتا کے دربار میں اکٹھے ہونا تھا۔

۸ بجے ہم داتا کے دربار پہنچ گئے۔

بھیڑ بکریاں

اشفاق حسین کا خیال تھا کہ دربار کے باہر حج دفتر کا نمائندہ ہماری راہ دیکھ رہا ہو گا۔ تاکہ ہمیں ہدایات دے سکے فلاں جگہ آپ اپنا سامان رکھ دیں. فلاں جگہ تشریف رکھیں۔ اپنے نام ہمارے کارکنوں کو لکھوا دیں۔ اس سے اپنے نمبر پوچھ لیں تاکہ آئندہ حوالے میں آسانی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس کا خیال تھا کہ اگر نمائندہ نہ ہوا تو دربار سے باہر نمایاں جگہ پر ایک بڑا سا بورڈ لگا ہو گا۔ جس پر جلی حروف میں ہدایات درج ہوں گی۔

داتا کے دربار کے صدر دروازے پر نہ کوئی بورڈ لگا ہوا تھا اور نہ ہی کوئی نمائندہ کھڑا زائرین کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "اب بولو"۔

وہ کہنے لگا۔ "نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی نا کوئی انتظام تو ہو گا۔ اتنی بڑی وزارت کا انتظام ہے۔ اتنے بڑے محکمے کا کام ہے۔ اتنا بڑا جتھا جا رہا ہے۔ بھئی نوے زائرین ہیں، دو چار نہیں۔ کیا انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح چھوڑ دیا جائے گا کہ اپنا راستہ خود

تلاش کریں۔

دراصل اشفاق حسین ایک آئیڈیلسٹ ہے۔ وہ باقاعدگی، اصول اور قانون کا دلدادہ ہے۔ وہ RIGHTS کی دنیا میں رہتا ہے کہ یوں ہونا چاہیے۔ لہٰذا یوں ہو گا۔ لازماً ہو گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بالکل غلط بات ہے افسوسناک بات ہے۔

چونکہ عام طور پر ویسا نہیں ہوتا جیسا وہ سمجھتا ہے کہ ہونا چاہیے، اس لئے یہ امر اس کے لئے باعث تکلیف ہوتا ہے اور بار بار تکلیف میں مبتلا رہ کر وہ اپنی صحت بگاڑ لیتا ہے۔

میں نے اس کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دوسروں کے قصور پر خود کو سزا نہ دو۔ میں نے خود کو سکھی رکھنے کے لئے یہ اصول بنا رکھا ہے کہ جو ہونا چاہیے اس کی توقع نہ رکھو۔ اگر نہ ہو تو غم نہیں ہو گا۔ ہو جائے تو مفت کی خوشی۔

اس کے برعکس اشفاق حسین نے بہت توقعات استوار کر رکھی ہیں۔ جو ہونا چاہیے اگر وہ نہ ہو تو اسے دکھ ہوتا ہے اور اگر ہو بھی جائے تو بھی اسے خوشی نہیں ہوتی۔ چونکہ پھر وہ اس کی تفصیلات پر نقطہ چینی شروع کر دیتا ہے۔ اگر یہ تفصیل یوں ہوتی تو بہتر رہتا۔ اگر وہ بات اس طریقے پر منظم کی جاتی تو مناسب رہتا۔ ہر صورت میں وہ انتظامات میں کیڑے نکالتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے زندگی میں خوشی حاصل کرنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ یا شاید جان بوجھ کر اس نے اہتمام کر رکھا ہو کہ زندگی میں خوشی حاصل ہونے کے امکانات پیدا نہ ہو جائیں۔

ہمارے ساتھی نذیر قیصر نے کہا۔ یار اندر چلو۔ چونکہ دربار میں مسجد کے قریب کچھ لوگ سامان لئے بیٹھے ہیں۔ ضروری بات ہے کہ وہ زائر ہوں گے۔ کیونکہ دربار میں سامان کا کیا کام۔

ہم نے سامان اٹھایا اور دربار کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں دوسرے لوگوں سے پوچھا۔ کیوں جناب آپ امیر خسرو کے زائر ہیں۔

"جی"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"کیا پروگرام ہے"۔

"کیا پتہ" وہ بولے، "شاید ہو۔ یہاں کوئی بتانے والا نہیں ہے"۔

"یہاں کوئی منتظم نہیں کیا"؟۔

"ایک آدمی ہے جو نام لکھ رہا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح لاعلم ہے"۔

"آپ نے نام لکھوالیا"۔ اشفاق حسین نے پوچھا۔

"جی لکھوالیا"۔

اس سے پوچھا کہ پروگرام کیا ہے۔

"جی پوچھا"۔

"کیا کہتا ہے"۔

"کہتا ہے ابھی لیڈر اور منتظمین آئیں گے تو اعلان ہو گا۔ جب تک آپ بیٹھ کر انتظار کریں"۔

دربار کے اس کونے میں ہم یوں بیٹھے تھے جیسے ریلوے پلیٹ فارم پر مسافر بیٹھے ہوتے ہیں۔ سامنے داتا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ یہ داتا لوگ بھی خوب لوگ ہیں۔ صرف دو کام جانتے ہیں دینا اور مسکرانا۔ دیتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ دیئے جاتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں۔

داتا

ایک ہزار سال پہلے حضرت علی ہجویری کو حکم ملا تھا کہ لاہور جاکر بیٹھ جاؤ۔ جو بھی تمہارے در پر آکر مانگے اسے دو۔ اتنا دو۔ اتنا دو کہ داتا بن جاؤ۔ یہ نہ دیکھنا کہ مانگنے والا کون ہے. کیسا ہے. ہندو ہے. بودھ ہے. عیسائی ہے. یا مسلمان ہے. نیک ہے یا بد ہے۔ اچھا ہے یا برا ہے۔ دینے والا دینا جانتا ہے۔ پرکھنا نہیں جانتا۔

داتا اس ہندو نگری میں آبیٹھے جسے لاہور کہتے ہیں۔ سائل کو دیا۔ اور اس خوش اخلاقی محبت اور ایثار سے دیا کہ لاہور میں داتا کی دھوم مچ گئی۔ اور لوگ مسلمان ہونے لگے ہوتے گئے۔ یہ داتا کے کردار کی عظمت تھی۔

داتا زندگی بھر دیتے رہے پھر مرنے کے بعد بھی دیتے رہے۔ یہ دینے کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے۔ پہلے چٹائی پر بیٹھ کر دیتے تھے اب مزار کے مرقد پر بیٹھے دیئے جا رہے ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ سچ کہتے ہیں۔ لیکن وہ تلوار لوہے کی تلوار نہیں تھی۔ کردار کی تلوار تھی۔ ایثار کی تلوار تھی۔ خدمت کی تلوار تھی۔ یہ سامنے جو داتا بیٹھا ہوا ہے یہی وہ تلوار ہے جس نے شمالی ہند میں اسلام پھیلایا۔ ایک ایسی ہی تلوار اجمیر شریف میں پڑی ہے ایک پاک پٹن میں۔ ایک قطب مینار کے پاس دلی میں ہے۔ ایسی کئی ایک تلواریں ہیں۔ انہیں زنگ نہیں لگا یہ آج بھی کاٹ کر رہی ہیں۔ صرف غیر مسلموں کو ہی نہیں مسلمانوں کو بھی مسلمان بنا رہی ہیں۔ ان تلواروں نے ہند میں آکر غدر مچا دیا۔ اندر پرست کو دلی بنا دیا۔ اجودھن کو پاک پٹن بنا دیا۔ لاہور کو داتا کی نگری میں بدل دیا۔

میں نے اس داتا کے کئی روپ دیکھے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں دسویں پاس کرنے کے بعد میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تو بھاٹی دروازے میں اپنے عزیزوں کے گھر ٹھہرا۔

وہاں صاحب خانہ ایک معزز محترمہ تھیں۔ اس کے بال لمبے تھے چہرا باوقار تھا۔ سرخ و سفید تھا۔ چہرے پر اس قدر رعب تھا کہ ان سے بات کرنا بھی مشکل تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تن تنہا رہتی تھیں۔ ہر دو ایک گھنٹے کے بعد ان کے کمرے سے ایک پروقار للکار قسم کا نعرا سنائی دیتا۔ "داتا" اس زمانے میں مجھے داتا کا علم نہ تھا نہ ہی میں اس لفظ کے مفہوم سے شناسا تھا۔

میں نے محترمہ کی بیٹی سے پوچھا۔ یہ کیسا نعرا لگاتی ہیں۔ داتا کون ہے۔ وہ کہنے لگی یہ داتا کی پرستار ہیں۔ کبھی داتا کے دربار پر جاؤ اور داتا کو دیکھ لو۔

تب میں نے پہلی مرتبہ داتا کی خدمت میں حاضری دی۔ میں نے دیکھا داتا تو ایک مزار ہے۔ جہاں قبر پرست لوگ ماتھا ٹیکتے ہیں۔

پھر میں نے وہ رنگ بھی دیکھا جب لاہور میں جمعرات کی شام کو ہیرا منڈی کی حسین طوائفیں بن ٹھن کر داتا کی حاضری کے بہانے جلوس کی صورت میں چلتیں۔ نام داتا کا لیتیں۔ نمائش اپنی کرتیں۔ ان کے پیچھے تماش بینوں کا ایک ہجوم ہوتا۔

پھر وہ دن بھی دیکھے جب داتا کا دربار شوقین مزاجوں کے لئے ملاقات کی جگہ تھی۔ "راندے وو" تھی اور وہ دن بھی جب داتا کے ارد گرد کے مکانات دھندے کے لئے برتے جاتے تھے اور اب بھی جب اوقاف کے تحت داتا کا دربار واقعہ میں دربار بنا ہوا ہے۔

یہ داتا لوگ بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں جو ماحول کی پراگندگی سے آزردہ نہیں ہوتے۔ جو متولیوں کی حرص و ہوس پر چیں بر جبیں نہیں ہوتے۔ جو ہنسنے اور مسکرانے کی سوا کچھ نہیں کرتے۔

زائر تاجر

پھر دفعتاً ایک عجیب سی آواز میرے کان میں پڑی "سو کے اسی" میں نے اس نوعیت کا آوازہ پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ وہاں تمام زائر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بیچارے انتظار میں بار بار دربار کی بڑی ڈیوڑھی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ کب کوئی اہل کار یا لیڈر آئے اور انہیں بتائے کہ اب کیا کرنا ہے۔

کچھ دیر بعد پھر وہی زیر لبی آوازہ بلند ہوا "سو کے اسی" میں پھر چونکا۔ میرے بائیں ہاتھ بیٹھا ہوا زائر اپنا سر گھٹنوں میں دیئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک پوٹلی سی پڑی ہوئی تھی۔ شاید اس پوٹلی میں یہ اپنا ناشتہ باندھ کر لایا ہو۔ میں نے سوچا۔ لیکن وہ آوازہ۔

چند ایک منٹ بعد کاغذوں کی کھڑ کھڑ سنائی دی۔ میں نے دیکھا تو پوٹلی کھلی پڑی تھی اور اس میں نوٹوں کے بنڈل تھے جسے وہ زائر گن رہا تھا پھر بھی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ ابھی میں حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ زائر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سو کے اسی"

"کیا"۔ میں نے پوچھا۔

"پاکستانی سو کے ہندوستانی اسی"۔ وہ مسکرایا۔

ارے یہ شخص زائر ہے یا دکاندار ہے۔ اور پھر اتنے بڑے دربار میں نوٹ بدلنے کا کام کرنا۔

"آپ زائر ہیں کیا"۔ میں نے پوچھا۔

"جی"

"ہمارے ساتھ دلی جا رہے ہیں"۔

"جی ـــ جا رہا تھا"۔

"کیا مطلب"؟

یہاں آکر پتہ چلا کہ میرا نام لسٹ میں سے خارج ہو گیا ہے۔ یہ تھوڑی سی رقم میں ساتھ لایا تھا۔ سوچا اب اسے ڈسپوز آف ہی کر دوں۔ آپ لیں گے "سوکھے اسی ہیں۔ "

میں نے جواب میں نفی میں سر ہلا دیا۔

اس دوران میں دو زائر اس کے قریب آ بیٹھے تھے اور سودا کرنے لگے تھے۔

یہ دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔

میں نے داتا کی طرف دیکھا۔ داتا صاحب یہ آپ کے دربار عالیہ میں جو کچھ ہو رہا ہے دیکھ لیجئے۔ میں اس میں شریک نہیں ہوں۔ شاید یہ شخص مجبوری میں یہاں دوکان کھولے بیٹھا ہو۔ بیچارے پر ظلم ہوا ہے۔ پہلے بلایا گیا پھر اس کا نام لسٹ سے کاٹ دیا گیا

دائیں بازو پر میں نے نرم سا دباؤ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا۔ ایک زائر کے ہونٹ میرے دائیں کان کو ٹٹول رہے تھے۔ پھر اس کی سرگوشی سنائی دی۔

یہ چڑے چڑی کی کہانی۔ مان نہ لینا۔

"کون سی کہانی"۔ میں نے پوچھا۔

"یہی جو یہ سنا رہا تھا"۔

"کون"۔

"نام لسٹ سے کوئی نہیں کٹتا۔ ہاں"۔

"اچھا ـــ لیکن"۔

اس کا یہی دھندا ہے۔ ایک گھنٹہ یہاں بیٹھے گا ہزار دو ہزار کمالے گا"۔

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"یہ اسے یہاں ایسا کام کرنے کیوں دیتے ہیں"۔

"شاید انہوں نے خود اسے یہاں بٹھایا ہو"۔

"کیا مطلب"۔

"بھئی ففٹی ففٹی اور کیا"۔

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔ اشفاق حسین کی آواز سنائی دی۔

"بابو جی آپ کو نہیں پتہ اس دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے"۔

"داتا جی آپ بن رہے ہیں"۔ میں نے داتا صاحب کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں سرگوشی کی۔ داتا ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جو لاوارث بھیڑوں کی طرح بیٹھے منہ اٹھا اٹھا کر رکھوالوں کا انتظار کر رہے تھے۔

بھیڑیں اور رکھوالے

مجھے یاد ہے جب میں ایوب خان کے دور میں صدر گھر میں ملازم تھا تو ایک شخص مدینہ منورہ سے صدر کے نام ایک پیغام لایا تھا۔ اس نے کہا تھا مسجد نبوی کے چابی بردار نے صدر کے نام پیغام بھیجا ہے۔ کہ "بھیڑوں کے رکھوالے خود چھاؤں میں نہیں بیٹھتے"

ہمارے ہاں تو رکھوالے ہمیشہ چھاؤں میں بیٹھے رہے اور بھیڑیں آوارگی کی عادی ہو گئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالباً اس مملکت خداداد کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

دفعتاً مسجد کا لاؤڈ سپیکر بولنے لگا۔ زائرین کے کان کھڑے ہو گئے۔

"امیر خسرو کے زائرین مسجد میں اکٹھے ہو جائیں۔" سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھا کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ مائیک پر غالباً وہی شخص کھڑا ہم سے مخاطب تھا جو باہر زائرین کے نام قلمبند کر رہا تھا۔

"حضرات"! اس نے تقریر شروع کی۔ "یہ آپ کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ حضرت امیر خسرو کے عرس پر حاضری دینے جا رہے ہیں۔ لیکن آپ فرد کی حیثیت سے نہیں جا رہے۔ جماعت کی حیثیت سے جا رہے ہیں اور آپ کا فرض ہو گا کہ آپ ہند میں جماعت کے رکن کی حیثیت سے رہیں اور جتھے کے قائد کے احکامات کے مطابق عمل کریں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ میں سے ہر فرد وہاں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے جا رہا ہے۔ آپ وہاں کسی ایسی ویسی حرکت کے سزاوار نہ ہوں جو پاکستان کے وقار کے منافی ہو۔

پھر ایک اور صاحب تشریف لے آئے۔ بشرے سے ظاہر تھا کہ وہ اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ انہوں نے حضرت امیر خسرو کی زندگی سے واقعات سنانے شروع کر دیئے۔ ان کی تقریر بڑی

عمدہ تھی لیکن اس میں تاثر نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ اہل کار تھے۔ انداز میں برتری تھی، نمائش تھی۔

تقریر ختم کرنے کے بعد اہل کار نے اعلان کیا کہ اب جتھے کے لیڈر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

“لیڈر صاحب ابھی تشریف نہیں لائے”۔ کارکن صاحب کی آواز سنائی دی۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری۔ “یار یہ سب لوگ باری باری بھیڑوں کو ہدایات دے رہے ہیں کہ وہاں جماعت کی حیثیت سے رہنا۔ لیڈر کے احکامات کی پیروی کرنا۔ کیا کوئی صاحب لیڈر کو نہیں بتائیں گے کہ ان کو وہاں کیا کرنا ہے۔

“لیڈر ہدایات سے بے نیاز ہوتے ہیں”۔ ہمارے پاس بیٹھے ہوئے صاحب بولے۔ “نہیں نہیں، ایسی بات نہیں۔ ضرور انہیں بریف کیا ہو گا”۔ ایک اور صاحب نے کہا۔

“جبھی تو وہ ابھی تک نہیں آئے”۔

“کیا مطلب”؟ اشفاق حسین نے پوچھا۔

“بھائی صاحب! ضرور انہیں سمجھایا ہو گا کہ پہلے زائرین کو اکٹھا ہونے کی مہلت دینا۔ جب پنڈال بھر جائے پھر صورت دکھانا۔ یہی لیڈر کے شایان شان ہے”۔

“تو پھر، ہمیں کیوں ساڑھے سات کا وقت دیا تھا”۔ اشفاق حسین بولا۔

“بھئی ہم زائر ہیں لیڈر نہیں۔ اگر لیڈر بھی عوام کا سا رویہ اختیار کر لیں تو وہ لیڈر کیسے رہیں”۔

دفعتاً شور مچ گیا۔ “آ گئے۔ آ گئے”۔

ایک نہایت معزز جانے پہچانے صاحب تشریف لے آئے۔ ان کا چہرہ نورانی تھا۔ بشرہ پر وقار تھا۔ آواز میں رعونت تھی۔ بات میں خود اعتمادی تھی۔ بات کا انداز تقریری تھا۔ تقریر کا انداز رسمی تھا۔ کتابی تھا۔ یوں جیسے وہ شخص جو جانتا ہے ان جانوں سے بات کر رہا ہو۔ ہدایات میں سند تھی۔ انداز میں مٹھاس تھی۔ اخلاق تھا۔ تقریر میں سبھی کچھ تھا لیکن تاثر نہیں تھا۔ وہ تاثر جو عجز سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ عجز جو ہونٹوں پر نہیں کھیلتا بلکہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔

بہر حال لیڈر کی آمد پر مجمعے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ رکھوالا آ گیا۔ وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے لیڈروں پر نقطہ چینی کر رہے تھے، ان کے چہرے بھی خوشی سے دمک اٹھے۔ پھر ہار پہنانے اور دستار بندی کی رسم شروع ہو گئی اور ہمیں پتہ چلا کہ جتھے کا ایک لیڈر نہیں چار ہیں۔ کوئی ڈپٹی ہے۔ کوئی اسسٹنٹ ہے، کوئی خازن ہے۔ کوئی کچھ اور کوئی کچھ۔

لیڈران کرام کی دستار بندیوں کے بعد فرداً فرداً زائرین کو بلا کر انہیں دستاریں پیش کی گئیں۔ اور پاکستانی زائر کے بلے لگائے گئے۔ پھر اعلان کیا گیا کہ باہر بسیں کھڑی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ ان بسوں میں تشریف رکھیں۔ سامان ساتھ لے جائیں چونکہ بہت جلد ہم واہگہ کے بارڈر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

قلیوں کا جلوس

زائرین نے اپنے اپنے بستر اور سوٹ کیس اٹھائے اور دربار سے باہر نکل گئے۔

دربار سے باہر کوئی بس نہ تھی۔

"یہاں باہر تو کوئی بس نہیں ہے"۔ اشفاق نے کہا۔

"یقیناً ہو گی"۔ میں نے جواب دیا۔ "اس بازار سے باہر ہو گی۔ ممکن ہے اس علاقے سے باہر ہو۔ بہر حال بسیں باہر ہیں"۔

"کیا مطلب"؟۔ وہ سامان سنبھالتے ہوئے بولا۔

"سارا لاہور دربار سے باہر ہے"۔ میں نے کہا۔

بازار کی طرف چند زائرین جا رہے تھے۔ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

سارا بازار زائرین کے جلوس سے بھرا ہوا تھا۔ سروں پر بسترے۔ ہاتھوں میں سوٹ کیس، ٹوکریاں، تھیلے۔ بازار والے حیران تھے کہ قلیوں کا یہ جلوس کہاں سے آ گیا۔

بازار کے اختتام پر باہر سڑک پر پہنچے تو واقعی دو بسیں کھڑی تھیں۔ بسوں پر سامان لاد دیا گیا۔ لوگ بیٹھ گئے۔ لیڈر بس کے باہر کھڑے ہدایات دے رہے تھے۔ احتیاط سے اپنا سامان رکھئے اور اس کی حفاظت کیجئے۔ اب آپ بس میں تشریف رکھئے چونکہ ہم روانہ ہونے

ہی والے ہیں۔

جب سب لوگ بیٹھ گئے تو لیڈر صاحب بس میں تشریف لائے اور بڑے اخلاق سے فرداً فرداً پوچھنے لگے۔ آپ آرام سے بیٹھے ہیں نا۔ سامان رکھوا دیا گیا۔ پھر وہ دوسری بس میں داخل ہو کر یہی سوال پوچھنے لگے۔

دم پخت

اس پر بس والے یک زبان ہو کر بولے جناب کی مہربانی ہے۔ ہم سب ٹھیک ہیں۔ البتہ شدت کی گرمی ہے۔ اور ہم یہاں گرمی میں یوں دم پخت ہو رہے ہیں جیسے دیگ میں پڑے ہوں۔ روانگی کا حکم دیجئے۔ تاکہ بس چلے تو ہوا لگے۔

”بس اب تو روانہ ہونے والے ہیں“ یہ کہہ کر لیڈر بس سے نیچے اتر گئے اور زائرین اس امید پر مطمئن ہو گئے کہ یقیناً اب بس کو روانہ ہونے کا حکم دینے کا اہتمام کرنے میں مصروف ہوں گے۔

دیگ میں پڑے پڑے آدھ گھنٹہ گزر گیا۔

بھیڑیں ممیانے لگیں۔

”کیوں بھئی اب کس کا انتظار ہے“۔

”پتہ نہیں“۔

”پوچھو تو سہی یار کہ تاخیر کیوں ہو رہی ہے“۔

”کس سے پوچھیں“۔

”لیڈر کہاں ہیں؟“

”پتہ نہیں“۔

”بھئی بسوں کی روانگی کے اہتمام میں مصروف ہیں“۔

”کہیں گئے ہیں غالباً“۔

”حد ہو گئی یار“۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔

بھیڑیں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔ ہماری بھیڑوں کی خصوصیت ہے کہ وہ بے قابو

ہو کر بھی قابو میں رہتی ہیں۔

دفعتاً ایک ویگن نما کار بسوں کے قریب آ کر رکی گئی۔ لیڈر نیچے اترے اور بڑی محبت سے پوچھنے لگے۔ کیوں حضرات آپ تیار ہیں۔ کوئی صاحب بس کے باہر تو نہیں نکلے ہوئے۔

"واہ جواب نہیں"۔ اشفاق نے کہا۔ "ہم سے روانگی کی اجازت طلب کی جا رہی ہے"۔

"ہمیشہ سے یہی دستور ہے۔ فیصلوں کے بعد عوام سے انگوٹھا لگوایا جاتا ہے۔
بھائیو۔
منظور کہ نہ منظور۔

لیڈروں کی ویگن چل پڑی۔

اس کے پیچھے دونوں بسیں چل پڑی۔

ایک صاحب بولے۔ "یار ہمارے لیڈر تو ہمارے ساتھ بس میں بیٹھے تھے۔ ان کی جگہیں ابھی خالی ہیں"۔

"ہاں وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ بیٹھتے ہیں اور ان کی جگہیں ہمیشہ خالی پڑی رہتی ہیں"۔ پیچھے سے آواز آئی۔

کسٹم ہاؤس

زندگی بھر کسٹم ہاؤس کو میں نے کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ اس ضمن میں میرے تجربات بے حد محدود تھے۔ میں صرف ایک بار ملک سے باہر گیا تھا وہ بھی حج کے لئے۔ کسٹم ہاؤس کے ایک خوش اخلاق افسر نے دبی آواز میں مجھ سے پوچھا تھا۔ "سونا تو نہیں لائے"۔

"لایا ہوں"۔ میں نے کہا تھا۔

اس پر وہ بے حد محظوظ ہوئے۔ جھک کر زیر لب بولے۔ "کہاں چھپایا ہے"۔

"یہ تو ون ملین ڈالر سیکرٹ ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

”بھئی بہت منگا ہے“ ۔ وہ بولے اور پھر سوٹ کیس کھولے بغیر اس پر چاک سے نشان ڈال کر قلی سے کہا لے جاؤ۔

پھر ایک روز میں نے ٹیلی ویژن کا مشہور پروگرام ففٹی ففٹی دیکھا۔

ایک حسین و جمیل لڑکی کا سوئمبر رچا ہوا تھا۔

تین امید وار تھے۔ ایک اہلکار. ایک دوکاندار اور ایک گنوار۔ لڑکی ہاتھ میں رضا مندی کی مالا اٹھائے چل پڑی۔ اہلکار کے پاس رکی۔ اس کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ پھر دکاندار کو غور سے دیکھا۔ ابھی وہ دکاندار کو دیکھ ہی رہی تھی کہ تیسرے امیدوار گنوار نے جیب سے ایک تختی نکالی جس پر لکھا ہوا تھا ”کسٹم کا چپڑاسی“ یہ دیکھ کر لڑکی نے لپک کر گنوار کے گلے میں پریم مالا ڈال دی۔

اس روز سے میرے دل میں کسٹمز کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

واہگہ کا کسٹمز ہاؤس دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا۔ دیر تک چپڑاسیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ لیکن وہ چپڑاسی نظر نہ آیا جس کے گلے میں لڑکی نے پریم مالا ڈالی تھی۔

واہگہ کے کسٹم ہاؤس میں دو ہال کمرے تھے۔ ایک آنے والے مسافروں کے لئے. دوسرا جانے والے مسافروں کے لئے. ایک بڑا کمرا فاریز کے لئے مخصوص تھا اور دو ایک چھوٹے کمرے سٹاف کے لئے۔ عمارت کے سامنے ایک لمبا برآمدہ تھا۔ اس کے سامنے ایک وسیع پلاٹ۔ پلاٹ کے قریب سڑک پر کوئی چالیس پینتالیس نئے نکور چمکتے ہوئے سوٹ کیس اور بیگ قطار میں پڑے ہوئے تھے۔ قریب ہی بہت سے فانیرز کا ایک جتھہ کھڑا تھا۔

پھر میں نے کسٹمز کے دوسرے عملے کی طرف توجہ کی۔ چند ایک خوش لباس نوجوان پی آئی اے کے سٹاف کی طرح چاق و چوبند چل پھر رہے تھے۔۔

پلاٹ میں ایک جانب دو لمبی میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ دو اہلکار ان میزوں کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ چپڑاسی نے اعلان کیا۔ ”زائرین اپنا اپنا سامان لے کر باری باری آتے جائیں“ ۔ یہ سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

کہاں چھپاؤں

اسلام آباد سے روانگی سے پہلے ہی اشفاق حسین اور میں نے مل کر بڑی محنت سے ہومیو پیتھی کی کتابوں کی ایک فہرست بنائی تھی۔ دلی کے ہومیو پیتھک پبلشرز کے دو ایک پرانے کیٹلاگ ہمارے پاس موجود تھے۔ ہم نے قابل خرید کتابوں کی قیمتوں کو جمع کیا تھا تا کہ اندازہ لگا سکیں کہ کتنی رقم ہمیں ساتھ لے جانی پڑے گی۔

اک روز جب ہم اسی سلسلے میں حساب کتاب میں مصروف تھے تو ہمارے پڑوسی آ گئے۔

ہمارے اندازے کو دیکھ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔ بولے۔ قانون کے مطابق آپ اتنی رقم ساتھ نہیں لے جاسکتے۔

"اچھا"۔ اشفاق حسین بولا۔ "کتنی رقم ساتھ لے جاسکتے ہیں"۔

"یہی کوئی پچاس ساٹھ روپے"۔

"لیکن لوگ تو بڑی بڑی رقمیں لے کر جاتے ہیں"۔

"چرا چھپا کر لے جاتے ہیں۔ ویسے نہیں لے جاسکتے"۔

"اور اگر پکڑے جائیں تو"۔

"تو رقم ضبط ہو جاتی ہے"۔

یہ خبر ہمارے لئے سخت پریشان کن تھی۔ جب پڑوسی چلا گیا تو میں نے اشفاق حسین سے کہا۔ "اب بولو"۔

"رقم تو لے کر جانی ہی پڑے گی ورنہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا"۔

"اور اگر پکڑی گئی تو"۔

"یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا"۔ اشفاق حسین ہنسا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ رقم کہاں چھپائیں۔

پرانی کہانیوں میں سنتا آیا تھا کہ ماں بیٹے کو سفر پر بھیجنے کے وقت روپے اس کی صدری میں سی دیا کرتی تھی کہ اگر ڈاکوؤں سے مڈھ بھیڑ ہو جائے تو رقم محفوظ رہے۔

میں نے سوچا چلو روپے میں بھی واسکٹ میں سی لوں گا۔ بات تو بڑی معقول تھی۔ دقت یہ تھی کہ واسکٹ پہننے کا موسم نہ تھا۔ اتنی گرمی میں بھلا واسکٹ کون پہنے اور پہن لے تو غیر از معمول بات نشان دہی کر دے گی۔

پھر میں نے سوچا کہ جوتے میں رکھ لوں۔ عرصہ دراز سے میں دیسی جوتا پہنتا ہوں۔ جو بہت ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ جوتے میں نوٹ چھپانے کے لئے میں نے دو پتاوے خریدے۔ نوٹوں کو کاغذ میں لپیٹ کر میں نے پتاوں تلے چھپا دیا۔

اس طریق کار سے میں مطمئن نہ ہوا چونکہ جب بھی چلتا تو پتاوے کے نیچے سے کاغذ کا کوئی نا کوئی کونا نکل آتا۔

اس بات کو جانچنے کے لئے دو روز میں نوٹوں کو پتاوے تلے چھپا کر چلنے پھرنے کی ریہرسل کرتا رہا پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا واقعی کاغذ کا کونا باہر نکل آتا تھا یا مجھے ہی نکلا ہوا نظر آتا تھا۔

دو روز کی مشق کے بعد میں نے اس طریق کار کو رد کر دیا۔ جوتے میں نوٹ چھپانے کی بات نہیں چلے گی۔ اونہوں۔

صاحبو قانون کے خلاف کام کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

حالانکہ مجھے پسینہ نہیں آتا۔ یہ ایک طبعی نقص ہے۔ شاید تو راثی ہو۔ لیکن ان دو دنوں کے دوران مجھے اتنے پسینے آئے کہ ساری زندگی نہ آئے ہوں گے۔

ایک عزیزہ نے کہا۔ او یہ تو آسان کام ہے میرے پاس ایک ایسی شلوار ہے جس میں جیب لگے ہوئے ہیں۔ خفیہ جیب۔

میں نے وہ جیب دیکھے۔ بہت ہی موزوں تھے لیکن دقت یہ تھی کہ شلوار کاٹن کی نہیں تھی ریشمی تھی اور اس کی بناوٹ زنانہ تھی۔

پھر ایک نوجوان آگئے۔ بولے یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

"تو پھر حل کر دو"۔ میں نے کہا۔

بولا۔ "پہلے سامان دکھایئے"۔

سامان ایک بیگ اور ایک سلیپنگ بیگ پر مشتمل تھا۔

اس نے بیگ کو ٹٹولا۔ "اس میں کتابیں ہیں کیا"۔

"ہاں تین کتابیں ہیں"۔

مجھے تو شاید خود خیال نہ آتا۔ "اشفاق نے کہا یار فکر تونسوی کے لئے کوئی تحفہ نہ لے چلیں"۔

"ضرور"۔ میں نے جواب دیا۔ "لیکن کیا لے کر جائیں"۔

دو ایک دن میں اس موضوع پر سوچتا رہا۔ آخر ایک صاحب بولے۔ "بھئی ادیب آدمی ہے۔ کتابیں لے جاؤ۔ تازہ بہ تازہ قسم کی"۔

میں نے بازار سے تین تازہ ترین کتابیں خرید لیں۔ وہ بیگ میں پڑی تھیں۔

نوجوان نے کہا بس کام بن گیا۔

اس نے کتابوں کے سرورقوں کے نیچے نوٹ رکھ کر اوپر لئی لگا دی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا جب کسٹم والوں نے آواز دی کہ زائرین اپنا اپنا سامان لے کر باری باری معائنے کے لئے آتے جائیں تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

وہ چپڑاسی

وہ ایک عجیب صورت حال تھی۔

ہر زائر کے پاس رقم حسب توفیق موجود تھی۔ کسی کے پاس ایک ہزار کسی کے پاس دس ہزار۔ پردیس میں بھلا رقم کے بغیر کون جاتا ہے۔

حج آفس نے روانگی سے پہلے ہر زائر سے ۱۰۷ روپے وصول کر لئے تھے۔ یہ رقم اخراجات کے لئے تھی اور اس رقم میں سے انہوں نے ہمیں بھارتی کرنسی میں گزارہ الاؤنس دینا تھا۔

داتا کے دربار میں اعلان کیا گیا تھا کہ زائرین کو بھارتی کرنسی میں رقم امرتسر میں دی جائے گی۔ کسی نے اس بات کی وضاحت نہ کی تھی کہ کتنی رقم دی جائے گی۔ اس لئے زائرین سب ڈانواں ڈول تھے۔ بہرحال ہر زائر کے پاس رقم موجود تھی جو اس نے اپنے سامان میں چھپا رکھی تھی۔

ادھر کسٹمز کے اہلکاروں کو بھی علم تھا کہ ہر زائر کے پاس رقم موجود ہے۔ جو سامان میں چھپائی گئی ہے۔ کسٹمز کے اہلکاروں کا کام ہی یہ ہے کہ وہ بوجھیں کہ رقم کہاں چھپائی گئی ہے۔

سامان اور سامان والے کو دیکھ کر وہ اندازہ لگاتے کہ رقم کہاں ہے۔ مسکراتے اور سرسری طور پر ان جگہوں کو دیکھ کر جہاں رقم نہ ہوتی۔ سامان پر چاک سے نشان لگاتے۔

جانے دو۔

میں حیران کھڑا دیکھتا رہا۔ واہ کیا صورت حال ہے۔ اہلکاروں کو پتہ ہے لیکن وہ چشم پوشی کر رہے ہیں اور مسافر خوش ہیں اور مونچھ پر تاؤ دے رہے ہیں کہ واہ ایسی ذہانت سے رقم چھپائی کہ سالا بوجھ ہی نہیں سکا۔

پھر دفعتاً پتہ نہیں کس بات پر کسٹمز کا ایک چپڑاسی بپھر گیا۔ جلال میں آ گیا۔ زائر سے بولا بستر کھولو۔

زائر نے بڑی بے نیازی سے بستر کھول دیا۔

چپڑاسی بولا۔ تکیہ مجھے دو۔ زائر نے ہچکچاتے ہوئے تکیہ دے دیا۔ چپڑاسی نے تکیے کا ایک کونہ پھاڑ دیا۔ اندر ہاتھ ڈالا اور دو ہزار کے نوٹ باہر نکال کر رکھ دیئے۔

یہ سارا عمل یوں ہوا جیسے سڑک پر تماشہ کرنے والے مداری کیا کرتے ہیں۔ انگوٹھی آپ کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں اور پھر وہی انگوٹھی سامنے کھڑے بابو کی جیب سے بر آمد کر دکھاتے ہیں۔ لیکن کسٹمز کے چپڑاسی کا یہ عمل شعبدہ بازی نہیں تھا بلکہ تجربہ تھا۔ نگاہ تھی۔

پھر جو میں نے غور سے چپڑاسی کی طرف دیکھا تو فوراً پہچان گیا۔ ارے یہ تو وہی ہے جس کے گلے میں ففتی ففتی کی دوشیزہ نے پریم مالا ڈالی تھی۔

کسٹمز سے فارغ ہو کر ہم اپنا اپنا سامان اٹھا کر ہندی بارڈر کی طرف چل پڑے۔

پاکستانی بارڈر پر کوئی قلی دستیاب نہ تھا۔ چونکہ سارے قلی فارنیرز کے ٹولے کا سامان اٹھانے پر لگے ہوئے تھے۔ وہاں انہیں دس کی جگہ بیس پچیس روپے کی توقع تھی۔ بخشش الگ۔ اس لئے ہم دیسی لوگ ان کے لئے گھاٹے کا سودا تھے۔

پاکستانی حد سے ہند حد تک کافی لمبا فاصلہ تھا۔

اشفاق بولا۔ " یار آج تو مارے گئے "۔

"کیا مطلب " ؟۔

" اپنا کباڑہ ہو گیا۔ سامان اٹھا اٹھا کر ۔ میں تو یوں محسوس کرنے لگا ہوں جیسے میں اسلام آباد کا زائر نہیں بلکہ بارڈر کا سامان اٹھانے والا قلی ہوں "۔

" خیر یہاں تو مجبوری ہے لیکن وہاں ہم پر ناحق زیادتی کی گئی "۔

"وہاں کہاں" ۔

داتا کے دربار سے سڑک پر کھڑی بسوں تک ۔

"ہاں" ۔ وہ بولا۔ "وہاں انتظام ہو سکتا تھا۔ کوئی ریڑا کروا لیتے۔ بسوں کو دربار کے سامنے لا کھڑی کرتے" ۔

"رکھوالے بھیڑوں کی نظر سے نہیں دیکھتے" ۔ میں نے کہا۔

"کیا وہ دیکھتے ہیں!" اشفاق نے پوچھا۔

"ہاں دیکھتے ہیں۔ رکھوالے کی نظر سے دیکھتے ہیں" ۔

"اچھے رکھوالے ہیں" ۔ اشفاق بولا۔

آج کی دنیا میں رکھوالوں کو ماسٹرز کہتے ہیں۔

سکھ ہی سکھ

"ارے" ۔ وہ چلایا "لو ہندی سرحد آ گئی" ۔

ہمارے سامنے سڑک پر زنجیر لگی ہوئی تھی۔

میں نے بستر سرکا کر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

سامنے زنجیر کے پیچھے سکھ ہی سکھ بیٹھے تھے۔ سکھ قلیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

یا اللہ کیا ہند کے سارے ہی سکھ قلی بن گئے۔

ایک سکھ نے لپک کر ہمارا سامان اٹھا لیا۔

"یار پہلے پیسے تو طے کر لے" ۔ اشفاق نے کہا۔

"جو مرجی ہے دے دینا جی" ۔

"ہمارے پاس تو بھارتی کرنسی ہی نہیں ہے" ۔

"او چھڈو جی" ۔ کوئی کرنسی دے دینا۔

قلی نے ہمیں لے جا کر ایک بارک کے برآمدے میں بٹھا دیا۔

"یہ لے اپنی مزدوری" ۔ اشفاق نے جیب سے رقم نکالتے ہوئے کہا۔

"نہ جی" ۔ وہ بولا۔ "لوہ وات میں پیسے نہیں لینڈا۔ میں بس میں بٹھا کر لوں گا" ۔

میں نے حیرت سے سکھ قلی کی طرف دیکھا۔ یہ اصلی قلی معلوم نہیں پڑتا۔ فلمی قلی سی باتیں کر رہا ہے۔

برآمدے میں ایک سکھ آ کھڑا ہوا۔ بھئی اپنے پاسپورٹ اندر جا کے دیدیو۔ پاسپورٹ لے کر میں اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں ایک بہت ہی لمبی سی میز پر دو رویہ سکھ ہی سکھ بیٹھے ہیں۔ چست پگڑیاں پہنے۔ چہرے پر صحت کے بورڈ سجائے۔ آنکھوں میں چمک، انداز میں بے تکلفی۔

میں سکھ سے بہت متاثر ہوں۔ اسے مل کر یوں محسوس کرتا ہوں جیسے اپنوں میں بیٹھا ہوں۔ سکھ میں سادگی ہے۔ بے تکلفی ہے، خلوص ہے۔ وہ جذباتی ہے، غصیل ہے، صحت مند ہے، کھاتا ہے پیتا ہے، بولتا ہے، چالتا ہے، گم سم نہیں رہتا۔ جوشیلا ہے۔ اس میں زندگی ہے، روانی ہے۔ سکھ میں صرف ایک خامی ہے۔ وہ یہ کہ انہیں آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ وصف ہر سادہ مزاج جذباتی قوم میں ہوتا ہے۔

حالانکہ تقسیم کے وقت جو کچھ مشرقی پنجاب میں ہوا تھا۔ اس کے بعد میرے دل میں سکھ کے خلاف انتقامی جذبہ یا کم از کم بغض پیدا ہو جانا چاہئے تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ بغض جڑ پکڑ جائے لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی کہ سکھ میں لوک کردار کا عنصر غالب ہے اور لوک کردار سے مجھے عشق ہے۔ لوک کردار کے حامل لوگ ڈھکے چھپے نہیں ہوتے۔ ان میں دو دھاری پن نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ منہ پر کچھ بغل میں کچھ۔

بہر صورت میں نے سکھ سے دور رہنے کی جتنی بھی تدبیریں کیں سب ناکام ہو گئیں۔ جب بھی سکھ پاکستان میں آتے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے اپنے آ گئے ہوں۔ انہیں دیکھ کر مجھے سکھ سا محسوس ہوتا۔ خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔

پاسپورٹ چیکنگ کے بعد۔ سامان چیک کرنے کا کام شروع ہوا۔ ہند کے کسٹمز کو بھی علم تھا کہ ہر مسافر نے سامان میں پاکستانی کرنسی چھپائی ہوئی ہے۔ مگر انہوں نے توجہ نہ دی۔ سرسری طور پر دیکھا اور پاس کرتے گئے۔ ان کا معائنہ پاکستانی کسٹمز کی نسبت زیادہ سرسری تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں پتہ تھا کہ یہ سارا روپیہ ہند میں خرید و فروخت پر صرف ہو گا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ شام ہونے والی تھی لیکن زائرین کے کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کوئی سیب کھا کھا کر گزارہ کر رہا تھا۔ کوئی پکوڑوں سے پیٹ بھرے جا رہا تھا۔

فرنچ ریوولیوشن

جب ہم اسلام آباد سے چلے تھے تو میرا خیال تھا کہ زائرین کے کھانے پینے کا بندوبست حج دفتر والے سرانجام دیں گے۔ جو سات سو دس روپے ہر زائر نے ادا کیے تھے۔ یہ انتظام اسی رقم میں سے ہو گا۔

لاہور روانہ ہونے سے پہلے اتفاقاً ایک صاحب مل گئے۔ کہنے لگے۔ بے شک کھانے اور رہائش کا انتظام وہی کریں گے لیکن کھانے کے دام زائر خود ادا کریں گے۔

اشفاق حسین یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ ہند جانے سے پہلے اسے ایک ہی فکر دامنگیر تھا۔ یار میرے پرہیزی کھانے کا بندوبست کیسے ہو گا۔ کیا مجھے وہاں بے نمک مرچ کا کدو پکا ہوا مل جائے گا۔ کیا ناشتے میں دہی میسر آئے گا۔ کیا

اشفاق حسین بولا۔ اگر کھانے کا انتظام حج آفس کرے گا پھر تو سمجھو موج ہو گئی۔ دلی پہنچتے ہی میں منتظمین کو اپنی ضروریات کی لسٹ بنا کر دے دوں گا۔ دہی۔ بے نمک کا کدو اور پودنے کی چٹنی جس میں نمک نہ ہو۔ بس میری یہی ضروریات ہیں۔

لاہور پہنچ کر اشفاق حسین نے مجھے فون کیا۔ بولا۔ یار دلی میں تو کھانے کا انتظام منتظمین کریں گے لیکن سفر میں ہم کیا کھائیں گے۔

میں نے کہا۔ ہاں یار۔ اس کا کوئی انتظام کرنا چاہیے۔

اشفاق حسین نے جواب دیا۔ ”کیا میں یہاں سے کھانے بنوا کر ساتھ لے چلوں۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لے چلو“۔

”تم کوئی انتظام نہ کرنا“۔ اس نے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے“۔ میں نے بات سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔

اس وقت جب ہندوستانی بسوں میں بیٹھے ہوئے زائر ہند کے بارڈر سے خریدے

ہوئے پکوڑے اور آلو چھولے کھا رہے تھے تو اشفاق حسین نے فاتحانہ نگاہ مجھ پر ڈالی اور بولا۔ کھانے نکالوں۔

یہ سن کر دفعتاً مجھے شدت کی بھوک لگ گئی۔ میں نے کہا۔ "لائے ہو"۔

بولا۔ "کیسے نہ لاتا"۔

میں نے کہا۔ "تو نکالو"۔

اس نے تلے ہوئے آلو یوں نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے جیسے مرغ پلاؤ ہو۔

میں نے جو نوالہ منہ میں ڈالا تو میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نہ ان آلوؤں میں نمک تھا نہ مرچ اور وہ گھی میں نہیں بلکہ پانی میں تلے ہوئے تھے۔ چونکہ اشفاق حسین بلڈ پریشر کے عارضے کی وجہ سے گھی سے بھی پرہیز کرتا تھا۔

میرا تو کباڑہ ہو گیا۔

اس وقت میں زندگی میں پہلی مرتبہ روٹی روٹی کے ساتھ کھا رہا تھا۔ سالن کے ساتھ نہیں۔ اس سے تو پکوڑے ہی کہیں اچھے تھے۔

صاحبو! کیا آپ نے کبھی اخلاق کی مار کھائی ہے۔ نہیں کھائی تو آپ اسے نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس وقت میں روٹی نہیں اخلاق کی مار کھا رہا تھا۔

پھر جو اتفاقاً میں نے ہندوستانی کسٹم ہاؤس کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہاؤس کے برآمدے میں ایک لمبا میز بچھا ہے جس پر کھانے کی چیزیں چنی ہوئی ہیں۔ اور ہمارے لیڈرانِ کرام مہمانوں کی حیثیت سے ہندی اہل کاروں کے ساتھ بوفے لنچ اڑا رہے ہیں۔

یہ دیکھ کر میرے منہ کا نوالہ اور بھی بدمزا ہو گیا۔ ہاتھ کی روٹی چھان بورے میں بدل گئی۔

میری نظروں میں ماحول بھی دھندلا گیا۔

صبر و تحمل کی دھجیاں اڑ گئیں۔ اخلاق بے معنی لفظ بن گیا۔ فرنچ ریولیوشن (FRENCH REVOLUTION) کی ابتدا کچھ ایسے ہی ہوئی ہوگی۔

کسٹم سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں بس میں بٹھا دیا گیا۔ بس بڑی کشادہ تھی۔ صاف ستھری تھی۔ اس کا ڈرائیور بھی سکھ تھا۔ بانکا سجیلا سکھ۔ جس کی آنکھوں سے مسرت کے شرارے نکل رہے تھے۔ جب اور اب میں کتنا فرق تھا۔

جب سکھوں کے اوصاف تو یہی تھے لیکن ان میں بانکپن بہت کم کم تھا۔ ان کی پگڑی اس قدر طرح دار نہ تھی۔ چہرے پر صحت تو تھی پر اتنی چمک نہ تھی۔

میں بس کے ڈرائیور کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ شاید یہ چمک اور رنگ پروفیشن کی وجہ سے ہو۔ شاید۔

دفعتاً ہمارے آگے ایک پولیس ویگن آنکلی اور ڈرائیور نے بس چلا دی۔ میرا سلسلہ خیال ٹوٹ گیا۔

سڑک کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیت تھے۔ تا حد نظر ہرے بھرے۔ ان میں سکھ کسان کام کر رہے تھے۔ ان کے بشرے سے ظاہر تھا کہ ساری ہریالی ان کے زور بازو کا نتیجہ ہے۔

اٹاری

"اٹاری اٹاری" میرے ساتھیوں نے شور مچا دیا۔ سامنے اونچی اٹاری پنجوں کے بل کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ کتنا پیارا لفظ ہے۔ اٹاری۔ کتنا خوبصورت نام ہے۔

حویلی سے زمیندار کی بو آتی ہے۔ ظلم واستبداد، دھاندلی، اونچ نیچ۔ مالک ہاری۔ اٹاری میں بو نہیں صرف حسن ہے۔ اونچی، نازک، حسین۔

ریل گاڑی میں جب میں امرتسر سے لاہور آیا کرتا تھا تو اٹاری پہنچ کر بڑے شوق سے اس اونچی عمارت کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ اب وہ عمارت اتنی اونچی نہ تھی۔ اتنی حسین نہ تھی مگر اٹاری کے لفظ میں وہی حسن تھا وہی رنگینی تھی۔ جب میں حیران ہوا کرتا تھا کہ یہ نام کسے سوجھا۔ کس نے اس گاؤں کا نام اٹاری رکھا۔

ان دنوں ریلوے سٹیشنوں کے ناموں پر میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا۔ امرتسر کتنا خوبصورت نام تھا۔ امرت کا چشمہ پٹھان کوٹ لائن پر اس سے آگے ویرکا آتا تھا۔ وہ بھی خیر قابل قبول تھا۔ شاید وہ ویڑھکا سے بنا ہو۔ لیکن کتھو ننگل۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی نام

ہوا۔

جب بھی میں امرتسر سے بٹالے کی طرف جاتا تو راستے میں کتھوننگل دیکھ کر تمسخر سے میری ہنسی نکل جاتی کیا بیہودہ نام ہے۔ ایک دفعہ جب میں ریل گاڑی میں بٹالے سے امرتسر آ رہا تھا تو کتھوننگل کے سٹیشن پر میں نے اپنے ایک ہمراہی سے کہا۔ کیا آپ نے اس سٹیشن کے نام پر غور کیا ہے کبھی۔ کتنا مہمل نام ہے کتھوننگل۔

ڈبے میں دوسری طرف سے ایک کسان بولا۔ "بابو جی سٹیشن کا نام تو بالکل ٹھیک ہے جی۔ سٹیشن کے اس طرف جو گاؤں ہے اس کا نام ہے کتھو اور سٹیشن کے اس طرح جو گاؤں ہے اس کا نام ہے ننگل۔ سرکار نے دونوں گاؤں کے بیچ میں ٹیشن بنا دیا۔ کتھوننگل نام رکھ دیا کہ کتھو والے بھی برتیں ننگل والے بھی برتیں۔

اس روز گویا میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ پھر کئی ایک سٹیشنوں کے نام واضح ہو گئے۔ مثلاً چھانگا مانگا۔ راجہ سانسی۔ ہیچیچو کی ملیاں۔

مجھے یاد ہے میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت گاڑی ایک سٹیشن پر رکی۔ جس کا نام تھا چیچو کی ملیاں۔ اس زمانے میں قلیوں کی ڈیوٹی تھی کہ رات کے وقت جب گاڑی رکے تو سٹیشن کا نام باآواز بلند بولتے رہیں۔

گاڑی رکی تو قلی چلایا۔ چیچو کی ملیاں۔ یہ سن کر میرا ایک ساتھی ہڑبڑا کے جاگ اٹھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر دونی نکالی اور کھڑکی سے سر نکال کر چلایا۔ بھئی دو آنے کی دے جاؤ۔

میں نے کہا۔ "جناب آپ کیا خرید رہے ہیں"؟۔

"چیچو کی ملیاں"۔ وہ بولا۔

"بھائی میرے! چیچو کی ملیاں تو سٹیشن کا نام ہے"۔

"اچھا"۔ وہ مایوس ہو کر بولا۔ "میں سمجھا کسی پھل کا نام ہے۔ میں نے کہا چلو نیا نیا پھل ہے چکھ لو"۔

دور اناری دو رویہ درختوں کی اوٹ سے ہمیں یوں جھانک رہی تھی جیسے گاؤں کی کوئی "کچی کڑی" کوٹھے پر چڑھ کر بنیرے سے جھانک رہی ہو۔

◆

امرتسر

پھر دفعتاً سڑک پر امرتسر کے مضافات شروع ہو گئے۔ ریلوے لائن کی طرف چھوٹے چھوٹے کارخانے دوسری جانب گھروندے۔

"امرتسر۔ امرتسر" بس میں زائرین کی زیر لبی گونجی۔

امرتسر میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرے دل کی دف پر ضرب پڑی ہو۔

کھجور میں گٹھلی

سامنے اے حمید کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پھوار اڑ رہی تھی۔ واقعی اے حمید امرتسریا ہے۔ امرتسریئے کی سب سے بڑی پہچان اس کی آنکھیں ہیں۔ جب امرتسریئے کی آنکھیں متبسّم ہوتی ہیں تو گرد و نواح میں گویا رنگ پچکاری چل جاتی ہے جس طرح عبدالحق تھا۔

جب عبدالحق مسکراتا تھا تو گھنیاں کے کٹڑے کے جنگلوں میں بیٹھی گوپیوں کی ساری بن ٹھن چو جاتی تھی. مائع اتر جاتی. کھڑکھڑ ختم ہو جاتی. لٹھے ململ بن جاتے. مطلوب طالب بن جاتیں۔

عبدالحق کٹڑہ گھنیاں کا دولہا تھا۔ اس کی رنگ پچکاری نے سارے کٹڑے کو بھگو رکھا تھا۔

ان دنوں امرتسر کے زیادہ تر لوگ کشمیری تھے۔ پتہ نہیں یہ کشمیری کب کشمیر چھوڑ

کر امرتسر میں آ بسے تھے۔ اور پھر امرتسریئے بن گئے تھے۔ ان میں حسن تھا. رنگینی تھی. سخاوت تھی، دلیری تھی، چمک تھی. خلوص تھا۔ وہ جذباتی تھے. غصیل تھے. دل پھینک تھے. بے نیاز تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ پہننے میں بانکے تھے۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ عیاش تھے۔ رندے تھے لیکن ان کے اندر مسلمان یوں ٹھک کر گڑا ہوا تھا جیسے کھجور میں گٹھلی گڑی ہوتی ہے۔

تقسیم کے وقت جب انہیں احساس ہوا کہ کرائے کے بلوائی مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں تو وہ تن کے کھڑے ہو گئے۔ ہاں ہم مریں گے لیکن چار چار کو مار کر مریں گے۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے اپنی جانیں بچا سکتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ امرتسر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر جانا لازم ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ بلوائیوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے. طاقت ہے لیکن وہ اڑ گئے۔ اس لئے نہیں کہ دشمن نے امرتسریوں کو للکارا تھا بلکہ اس لئے کہ دشمن نے مسلمانوں کو للکارا تھا اور ان کا ایمان تھا کہ مسلمان بھاگتا نہیں. مرتا ہے. لڑ کر مرتا ہے۔ اسی بات پر انہوں نے محاذ کھول لیا۔ لڑے اور مر گئے۔

عبدالحق کی پیٹھ پر گولی لگی تھی۔ سامنے کھڑے ہو کر کسی کو عبدالحق پر گولی چلانے کی ہمت نہ تھی۔ چھپ کر کمین گاہ سے گولی چلائی تھی۔

"وہ خالصہ کالج۔" بس میں کوئی بولا۔

میں چونک اٹھا ــــ ہاں سامنے خالصہ کالج تھا۔ پروفیسر رام سہائے کالج کے گیٹ میں کھڑا مجھے ویو کر رہا تھا ــــ پروفیسر رام سہائے ہفتے میں ایک بار ہمارے ہندو سبھا کالج میں آ کر لیکچر دیا کرتا تھا۔

رام سہائے ان لوگوں میں سے تھا جو علم کے دیوانے ہوتے ہیں۔ پڑھ پڑھ کر پتھر ہو جاتے ہیں۔ پھر دفعتاً سے ایک چنگاری پھوٹتی ہے۔ پتھر ریزہ ریزہ ہو کر پگھل جاتا ہے۔ روح چھلکنے لگتی ہے۔ پھر احساس ہوتا ہے کہ پتھر بن جانا تو مقصود نہیں تھا۔ کتاب تو منزل نہیں. زندگی منزل ہے۔ پروفیسر رام سہائے فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ان کا لیکچر کتابوں سے ماورا ہوتا تھا۔

ٹین ایج محبت

۱۹۲۷ء کی بات ہے جب میں امرتسر میں ہندو سبھا کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ان دنوں

میں کمپنی باغ سے پرے ایک ویران کوٹھی میں رہتا تھا جسے آموں والی کوٹھی کہتے تھے۔ یہ جگہ ہندو سبھا کالج کا ہوسٹل تھی۔ کالج شہر کے عین بیچ میں واقع تھا۔ ہوسٹل امرتسر سے میلوں دور کمپنی باغ سے پرے تھا۔

امرتسر میرے لئے ایک متبرک شہر تھا۔ چونکہ وہاں میری اولیں محبوبہ رہتی تھی۔ ٹین ایج کی محبوبہ ایک ہیولہ ہوتی ہے۔ ایک دھندلی تصویر۔ وہ جسم نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں اس شوخ اور رنگین تصویر کو سینے پر لگائے سارے امرتسر میں بادیہ پیمائی کرتا پھرتا تھا۔

میں نے محبوبہ کو انبالے میں صرف ایک بار دیکھا تھا اور اس کے بارے میں صرف دو ایک باتیں جانتا تھا کہ وہ صوفی کی بہن ہے اور اس کا پیار کا نام تانی ہے اور وہ امرتسر میں رہتی ہے اور یہ بھی کہ وہ چٹی سفید ہے گلابی اور گوری۔ اس کی آنکھیں کالی سیاہ ہیں۔ اس کے بال گھنگھریالے ہیں۔ مسکراتی ہے تو اس کی گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے ہونٹ یوں مڑے رہتے ہیں جیسے ابھی ابھی لطیفہ سن کر بیٹھی ہو۔

کئی ایک مہینے میں امرتسر کی بادیہ پیمائی کرتا رہا۔ ہر کھڑکی کو دیکھ کر امید بندھ جاتی کہ ابھی چق اٹھا کر کوئی کہے گی۔ میری طرف دیکھو میں تانی ہوں صوفی کی بہن۔ ہاں میں ہی ہوں تانی۔ میں اور پھر آنکھیں جھپکا کر شرمانا شروع کر دے گی۔

امرتسر میں بڑا حسن تھا. بڑا رنگ تھا. بڑی چمک تھی۔ میں وہاں ایک سال گھومتا پھرتا رہا. مجھے اس تصویر نے بچالیا: جو میں نے سینے پر لٹکا رکھی تھی۔ اس ہیولے نے بچالیا جو مجھ پر مسلط تھا۔

اب میں نے جانا ہے کہ ٹین ایج محبت کتنی بڑی رحمت ہوتی ہے۔

سوٗ کے کتنے:

موٹریں رک گئیں۔ ہم امرتسر کے ریلوے سٹیشن کے سامنے ریسٹ ہاؤس کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اشفاق حسین مجھے کہنیاں مار رہا تھا۔ چلو سامان اٹھاؤ۔ اترو۔

لیڈر صاحب اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں اعلان کر رہے تھے۔ آپ چند گھنٹے یہاں آرام فرمائیں گے۔ اپنا سامان حفاظت سے اتار لیں۔

ریسٹ ہاؤس کے سامنے پلاٹ میں ایک خیمہ لگا ہوا تھا جس میں چار پیڈسٹل پنکھے چل رہے تھے۔ نیچے دری بچھی ہوئی تھی۔ خیمے کے دروازے پر ایک ٹب پانی سے بھرا ہوا تھا جس میں برف ڈالی جا رہی تھی۔

ابھی ہم خیمے میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک سرگوشی چلنے لگی "سو کے کتنے سو کے کتنے"

یہ سرگوشی دراصل داتا کے دربار میں ہی چل پڑی تھی۔ دربار کے بیرونی صحن میں جب ہم لیڈروں کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے تو سو کے کتنے. کی سرگوشی ابھری تھی۔

اسلام آباد سے روانہ ہونے سے پہلے ایک صاحب نے کہا تھا۔ روپیہ کہیں اور نہ بدلوانا۔ امرتسر میں بدلوانا۔ وہاں اچھا ریٹ ملے گا۔

واگہ میں بھی یہی سرگوشی ابھری تھی۔ "سو کے اسی"۔ جب ہمارے پاسپورٹوں کا معائنہ ہو رہا تھا تو چند ایک زائر دکانوں کی طرف اٹھ بھاگے تھے۔ "سو کے

اب پھر سے وہی سرگوشی ابھری تھی۔

"سو کے پچاسی مل رہے ہیں"۔

"کہاں سے مل رہے ہیں"۔

"ریسٹ ہاؤس سے باہر"۔

"باہر کہاں"۔

"بھئی باہر نکلو تو"۔

"باہر نکل کر کہاں ڈھونڈیں"۔

"بھائی صاحب پیاسا کنویں کو ڈھونڈتا ہے۔ کنواں پیاسے کو نہیں ڈھونڈتا"۔ ہم دونوں ریسٹ ہاؤس سے باہر سٹیشن کی پورچ کے قریب پہنچے تو ایک سکھ نوجوان آ گیا۔ بولا۔

"پچاسی لینے ہیں تو لے لو"۔

"اور جو زیادہ لینے ہوں تو"؟ ایک زائر بولا۔

”تو لے جا کر لو“ ۔ سکھ نے کہا۔ ”کوئی مناعی تھوڑی ہے۔ میرے پاس تو سجنو سو کے پچاسی ہیں“ ۔

ہم نے روپے بدلوا لئے۔

اس وقت ہم امرتسر کے سٹیشن کی پورٹیکو میں کھڑے تھے۔ وہی پورٹیکو، وہی ڈیوڑھی، وہی بکنگ کی کھڑکیاں، ۳۵ سال میں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سامنے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ تھا جہاں لوہے کے جنگلوں میں بیٹھ کر میں اکثر بٹالے والی گاڑی کا انتظار کیا کرتا تھا۔

امرتسر کا اسٹیشن باہر سے بالکل وہی سٹیشن تھا جس سے میں پورے طور پر واقف تھا۔

سانپ کی لکیریں

ہم نے دو پلیٹ فارم خریدے اور اندر داخل ہو گئے۔ دروازے میں بیٹھا ہوا ریلوے بابو اسی طرح اونگھ رہا تھا۔ اندر قلی اسی طرح ادھر سے ادھر چل پھر رہے تھے۔ یوں جیسے پیچ ڈھیلے ہو چکے ہوں۔ سٹالوں پر بیٹھے ہوئے سیلز مین اونگھ رہے تھے۔ چائے والا اسی طرح ہاتھ میں کیتلی اٹھائے چائے انڈیل رہا تھا۔ وہی ویٹنگ روم، وہی ریفرشمنٹ روم، وہی پارسل آفس۔ دفعتاً میری نگاہ سامنے اٹھ گئی۔

سامنے سائیڈنگ پر بٹالے جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ میں یہ بھول گیا کہ زائر ہوں۔ دلی جانے کے لئے گاڑی کا منتظر ہوں۔ بھول گیا کہ میرے ساتھ اشفاق حسین ہے۔ میرا جی چاہا کہ دوڑ کر گاڑی کو پکڑ لوں۔ چلتی گاڑی میں سوار ہو جاؤں اور پھر وہی ویرکا، وہی کتھونگل، وہی جیتی پور، وہی بٹالہ، وہی سٹیشن کے باہر کھڑے بمبو کاٹ۔ وہی منڈی، وہی تیلی دروازہ اور شہر کے ارد گرد بنی ہوئی چار دیواری۔

اشفاق حسین ہنسا ”تمہیں یاد ہے“ ۔ وہ بولا۔

”کیا“ ۔ میں نے پوچھا۔

”جب ہم اکٹھے گورداسپور میں رہتے تھے۔ تم، میں اور قاضی“ ۔

”ہاں۔ سب باتیں میری آنکھوں کے سامنے یوں گھوم رہی تھیں جیسے کل کی بات

ہو"۔

یاد ہے جب ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ گورداسپور میں تم میرے گھر آئے تھے۔

ہاں یاد ہے"۔

"تم نے کہا تھا۔ میں طبلہ سیکھنا چاہتا ہوں اور میں نے تمہیں ٹالنے کے لئے کہا تھا طبلہ سیکھنا ہے تو پہلے جوڑی خرید کر لاؤ۔ اور اگلے روز رات کے دس بجے تم نے آکر میرا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور جب میں نے دیکھا تھا کہ تم نے ہاتھ میں جوڑی اٹھا رکھی ہے تو میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ کیسا آدمی ہے جو جوڑی خرید کر لے آیا ہے۔ اتنا جنون ___"

"ہاں یاد ہے"۔ میں نے کہا۔ "اگلے روز میں صبح سویرے گاڑی میں بیٹھ کر یہاں امرتسر آگیا تھا اور یہاں سے جوڑی خرید کر رات کو واپس گورداسپور پہنچا تھا۔ پتہ ہے جوڑی ۳۰ روپے کی ملی تھی اور ان دنوں میری تنخواہ کل ۴۵ روپے تھی۔

وہ قہقہہ مار کا ہنسا۔ "کیا دن تھے"۔

اسی گاڑی میں بیٹھ کر میں گورداسپور پہنچا تھا۔ یہ جو سامنے سائیڈنگ میں کھڑی ہے۔ جب بھی یہ اسی وقت چلتی تھی۔ اسی پلیٹ فارم سے"۔

گاڑی میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے فکر. مطمئن. بے پردا۔ عورتیں بچے اٹھائے انہیں بہلا رہی تھیں۔ کھڑکیوں میں لٹکتے ہوئے بچوں کو ڈانٹ رہی تھیں۔ بالکل اسی سر تال میں جس طرح سے پینتیس سال پہلے ڈانٹا کرتی تھیں۔ انہیں خود نمائی کا خیال نہ تھا۔ دیکھتی تھیں۔ لیکن دکھنے کی خواہش نہ تھی۔

مجھے ایسے لگا جیسے وقت کا دھارا رک گیا ہو۔ پینتیس سال سے رکا پڑا ہو جیسے تبدیلی ترقی DEVELOPMENT سب منہ زبانی باتیں ہوں۔

میرا جی چاہتا تھا کہ پلیٹ فارم پر دھمال ناچوں اور چلا چلا کر گاؤں
"او جانے والے رے دہیں ہے میرا گاؤں"

میرا جی چاہتا تھا کہ ہر ڈبے میں داخل ہو کر ایک ایک مسافر کو گلے سے لگاؤں تُو ادھر جا رہا ہے نا۔ جدھر کی مٹ کی خشبو ابھی تک میرے انگ انگ میں بسی ہوئی ہے۔

زندگی بھر میں نے اپنی جنم بھومی سے کبھی اس قدر پیار محسوس نہ کیا تھا۔ میں نے کبھی اس مٹی کی خشبو کو اپنے تن بدن میں رچی بس نہ جانا تھا جتنا ۳۵ سال کی جدائی کے بعد

آج میں اس سائیڈنگ پر گاڑی کے سامنے کھڑے ہو کر محسوس کر رہا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ واقعات اہم نہیں لگتے۔ یادیں انہیں اہم بنا دیتی ہیں۔ سانپ گزر جاتے ہیں لیکن لکیریں نہیں مٹتیں۔

اشفاق حسین نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ ” آؤ بیٹھ جائیں “۔ وہ بولا اور اس نے مجھے گھسیٹ کر ایک بنچ پر بٹھا دیا۔ ”میں تھک گیا ہوں “۔ وہ بولا۔

”گورداسپور یاد آ رہا ہو گا“۔ میں نے کہا۔

” ہاں گورداسپور یاد آ رہا ہے۔ کتنی بھیانک یاد ہے “۔

” بھیانک “۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ تمہیں پتہ نہیں تم تو نوکری چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں اس وقت گورداسپور سے نکلا تھا جب گھر گھر سے دھواں نکل رہا تھا۔ سڑکوں پر خون جما ہوا تھا۔ خوف زدہ عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے۔ لوگوں کو اتنی مہلت نہیں دی جا رہی تھی کہ وہ ریفیوجی کیمپ تک پہنچ سکیں۔

دفعتاً پٹھان کوٹ جانے والی گاڑی نے کوک ماری اور وہ اہستہ اہستہ رینگنے لگی۔ رینگتی رہی رینگتی ـــــ اور امرتسر کا پلیٹ فارم خالی رہ گیا۔ خالی اور ویران۔ دور گاڑی کی سسکیاں لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اجڑے ہوئے پلیٹ فارم پر دو بٹالے اور گورداسپور کے دیوانے تن تنہا بیٹھے تھے۔

نو آبجکشن

جب ہم دونوں سٹیشن سے باہر نکلے تو پورٹیکو کے پاس بڑی رونق تھی۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ ۳۵ سال قبل تو وہاں صرف چند ایک بمبو کاٹ اور تانگے کھڑے نظر آتے تھے۔ اب تانگے بھی تھے۔ ٹیکسیاں بھی. موٹر اور سائیکل رکشا بھی۔

عین اس وقت لیڈر صاحب تشریف لے آئے۔ ان کے چہرے پر بشاشت کا دبیز غلاف چڑھا ہوا تھا۔ حسب معمول بڑے اخلاق سے ملے۔ آنکھیں چمکا کر بولے۔ ” دیکھا ہم نے ساڑھے اٹھاسی روپے وصول کیے “۔

ایک ساعت کے لیے ہم بھنا گئے۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ پھر انہوں نے خود ہی

وضاحت کی کہنے لگے۔ "اگر آپ نے روپے بدلنے ہیں تو سامنے چوک میں چلے جایئے۔ وہاں ایک سردار صاحب کی دوکان ہے۔ منی اکسچینجز کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ وہ سو پاکستانی کے ساڑھے اٹھاسی ہندوستانی دیں گے"۔

"شکریہ جناب۔ ہم نے تو سب بدل لئے"۔ میں نے کہا۔

"ہماری گاڑی کب جائے گی"۔ اشفاق حسین نے پوچھا۔

"رات کو ساڑھے نو بجے"۔ وہ بولے۔ "ابھی بہت دیر ہے"۔

"اگر قابل اعتراض نہ ہو تو ہم امرتسر کا ایک چکر لگا لیں"۔ میں نے پوچھا۔

"بالکل بالکل"۔ وہ بولے۔ "سیکوریٹی نے اجازت دے دی ہے زائرین چاہیں تو وہ گھوم پھر سکتے ہیں۔ بس وقت کا خیال رکھئے۔ نو سے پہلے سٹیشن پر پہنچ جایئے۔ باقی نو آبجکشن"۔

ہم نے تانگہ کیا اور اس میں بیٹھ کر ہال بازار کا چکر لگانے چل پڑے۔

سامنے ریلوے کا اوور برج تھا۔

وہی پل جہاں سے گزر کر میں روز کالج جایا کرتا تھا۔ آموں کی کوٹھی سے کالج تک چار پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ لیکن وہ فاصلہ ہمارے لئے باعث کلفت نہ تھا۔ پھر یہ مشکل بھی دور ہو گئی۔

پرنسپل میرے ابا کے دوست تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو لکھا کہ بورڈنگ کالج سے بہت دور ہے۔ پیدل آنے جانے میں لڑکے کا وقت ضائع ہوتا ہے اس لئے بہتر ہو گا کہ آپ اسے ایک سائیکل خرید دیں۔ اس پر والد صاحب نے مجھے ایک سائیکل خرید دیا تھا۔

نیا نیا سائیکل ملا تو سائیکل چلانے کی خوشی اس قدر طاری ہوئی کہ سب کلفتیں دور ہو گئیں۔

سائیکل پر میں سارے امرتسر میں گھومتا پھرتا تھا۔ ہر بند کھڑکی کی طرف اس امید پر دیکھتا کہ ابھی وہ کھلے گی اور چق کی اوٹ سے ایک متبسّم چہرا جھانکے گا۔ ہاں میں ہی ہوں۔ میں تانی ہوں صوفی کی بہن۔ وہی جسے تو نے انبالے میں دیکھا تھا۔ پھر وہ شرما کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ جائے گی اور زندگی میں اس شبھ لگن سے بہار آ جائے گی۔

وہ بھیڑ یہ بھیڑ

"یہ ہے جی ہال دروازہ"۔ تانگے والے سکھ نے کہا۔ "لیکن اب اسے گاندھی گیٹ کہتے ہیں۔ بازار کا وہی نام ہے ہال بازار۔ صرف دروازے کا نام بدل گیا ہے"۔

میرے روبرو وہی ہال گیٹ تھا جسے میں امرتسر گیٹ سمجھا کرتا تھا۔

ہال گیٹ میں داخل ہوکر مجھے سکون سا مل جاتا کہ میں امرتسر میں آپہنچا ہوں۔ اور دل پر اک ایسا اطمینان ساطاری ہو جاتا جیسے بچہ ماں کی گود میں محسوس کرتا ہے۔

ہال بازار وہی ہال بازار تھا وہی دکانیں، وہی کھلی سڑک، وہی گہما گہمی، وہی بھیڑ۔ لیکن یہ بھیڑ وہ بھیڑ نہ تھی۔ اس بھیڑ میں ایک فراغت تھی، ایک رنگینی، تھی ایک بے نیازی۔ اس بھیڑ میں وہ رنگینی نہ تھی۔ لوگ خرید و فروخت کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ سیروتفریح کا انداز نہ تھا۔ ٹہل لگانے والی چال نہ تھی۔

ہال بازار کمرشل ہو گیا تھا۔ لیکن امرتسر تو ہمیشہ سے کمرشل تھا۔ بہت بڑی منڈی تھی۔ کپڑے کی منڈی، زیورات کی منڈی، اجناس کی منڈی، جنرل مرچنٹس کی منڈی — پتہ نہیں کیا بھید تھا کہ ان دنوں کمرشل ہونے کے باوجود وہ کمرشل محسوس نہیں ہوتا تھا —

لیکن اب وہ بات نہ تھی۔ وہ احساس فراغت نہ تھا۔ آنکھوں میں رنگین چمک نہ تھی۔ چالوں میں وہ ٹھمک نہ تھی۔

"یہ ہے مہاراج گھنیاں دا کٹڑہ"۔ تانگے والے نے کہا۔

میرا دل اچھل کر منہ میں آگیا۔

راگ کی مینڈھ

گھنیا کا کٹڑہ تو امرتسر کا دل تھا۔ اف اتنی رنگینی، اتنی لے، اتنی مٹھاس، اتنی سر، جیسے امرتسر راگ ہو اور گھنیا کا کٹڑا راگ میں لگی ہوئی مینڈھ ہو۔ حالانکہ اس زمانے میں گھنیاں کا امیرے لئے ببرجت تھا۔ ٹیبو تھا۔

اس زمانے میں میں اس عمر میں تھا جب بے پردہ عورت لاحول پڑھنے کے لائق شے

ہوتی ہے۔ ایک ناپاک ممنوع موضوع۔ زندگی کا ایک ایسا پہلو جس پر جلی قلم سے "مت" لکھا ہوتا ہے۔ خبردار قسم کا مت۔

اس دور کے ٹین ایج میں زندگی کے دو پہلو ہوا کرتے تھے۔

ایک کرو۔ ضرور کرو۔ لازماً کرو۔ ورنہ ...

اور دوسرا مت کرو۔ خبردار ورنہ ___

ٹین ایجرز کے لئے کٹڑا گھنیاں پر جلی حروف میں مت لکھا ہوا تھا۔ مت گزرو۔ مت دیکھو۔ مت سنو۔ مت مت مت۔

کٹڑا گھنیاں طوائفوں کا کٹڑا تھا۔ اونچی ذات کی طوائفوں کا۔ ان کے انداز میں ایک وقار تھا ایک بے نیازی تھی۔ ان کے چوباروں میں مشرقی تمدن کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ طوائفیں تھیں جن کے ہاں بادشاہ اور راجے مہاراجے اپنے بچوں کو تہذیب اور اخلاق سیکھنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ ان کے پاس شائستگی تھی، حسن تھا. لے تھی. رنگ تھا. راگ تھا۔

جب میں کٹڑے سے گزرا کرتا تھا تو میری گردن جھک جاتی تھی۔ وہ مت جو بچپن سے مجھ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ اس کا بوجھ اس قدر بڑھ جاتا کہ گردن نہ اٹھتی لیکن میرے کان کھل جاتے یوں جیسے ریکارڈر کا بٹن کھل جاتا ہے تا کہ وہ ساری دل آویز آوازیں سمیٹ کر اپنے دل کا دامن بھر لو۔

کٹڑے سے گزرتے ہوئے میری تمام حسیات جاگ اٹھتیں۔ اس وقت میرے دل میں صرف ایک خواہش ابھرتی کہ کاش میں گردن اٹھا کر ایک نظر اوپر دیکھ سکتا۔

جب میں کٹڑے سے گزرتا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے سبھی دوکاندار اور راہ گیر مجھ پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔ وہ حیران ہیں، خشمگیں ہیں کہ یہ ادھر سے کیوں گزر رہا ہے. کیوں۔ اس پر مجھے پسینہ آ جاتا۔

وہ تو شکر ہے کہ کٹڑے کے عین درمیان میں ایک سینما ہال بنا ہوا تھا۔ اگر وہ ہال نہ ہوتا تو شاید میں کٹڑے سے گزرنے کی بھی جرأت نہ کرتا۔

گزرتے ہوئے خود کو تسلی دینے کے لئے اندر سے آوازیں اٹھتی رہیں۔ میں تو سینما دیکھنے جا رہا ہوں۔ میں تو فلم دیکھنے میں .... کٹڑے سے تو نہیں گزر رہا۔

یہ وہی کٹڑا تھا جس کے عقب میں پچاس سال پہلے ایک کھڑکی کھلی تھی اور اس کھڑکی سے ایک متبسم چہرے نے جھانک کر کہا۔ یہ میں ہوں۔ میں تانی صوفی کی بہن۔ تو تو جب بھی ادھر سے گزرتا ہے اوپر دیکھتا ہی نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے کھڑکی بند کر دی تھی۔

یوں ٹین ایج محبت کے خواب کی تعبیر ہو گئی تھی۔

تانگے والے نے کٹڑا گھنیاں کے موڑ پر تانگا روک لیا۔ میں نے کٹڑے کی طرف نگاہ دوڑائی۔

چوبارے سب بند پڑے تھے۔ بازار میں لوگ چل پھر رہے تھے۔ اس کے باوجود بازار ویران تھا۔ نہ وہ رنگ تھا نہ رس تھا۔ وہ ایک عام سا بازار تھا۔

موڑ پر خود اے حمید کھڑا تھا۔ اس کی گردن لٹکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں رنگ پچکاری کی پھوار کی بجائے آنسو تھے۔

”دیکھا“۔ اے حمید نے کہا۔ ”ظالموں نے کیا کر دیا۔ سب اجاڑ کر رکھ دیا۔ اب یہاں نہ رنگ ہے نہ رنگ پچکاریاں ہیں۔ امرتسر کی بوتل میں وہ شوں نہیں رہی“۔

تانگے والا پھر چل پڑا۔ بولا۔ ”بابو جی بٹوارہ ہوا تو امرتسر کے ڈپٹی کمشنر نے کٹڑے کی سب گانے والیوں کو حکم دیا کہ وہ کٹڑہ خالی کر دیں۔ یہ دربار صاحب کا شہر ہے۔ اسے ایک پاک صاف شہر ہونا چاہئے۔ یہاں طوائفوں کا بازار نہیں ہو گا۔ اب کٹڑے کے چوباروں میں گھر والیاں رہتی ہیں“۔

وہ بھی تو گھر والیاں تھیں۔ میں نے سوچا۔ وہ گھر والیوں سے بھی زیادہ گھر والیاں تھیں۔ انہیں پتہ تھا کہ گھر والی کسے کہتے ہیں۔

میرے سامنے ممتاز بیگم آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بولی۔ ”دیکھ لو۔ کوئی بھی طوائف کو نہیں سمجھتا۔ کوئی سمجھتا ہے کہ کھلاڑی ہے۔ دوسروں کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کھلونا ہے جس سے تماش بین گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لئے کھیل لیتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں طوائف نے عورت کو اپنی کنی میں باندھ رکھا ہے۔ گھر والی بننے کی آرزو اس کے اندر یوں بھری ہوتی ہے جیسے مالٹے میں رس بھرا ہوتا

ہے۔ اوپر سے دیکھو تو سخت چھلکا کاٹو تو شرابور ہو جاؤ۔

ہائے —— گھر والی ہوتی

ممتاز بیگم عبدالحق کے عشق میں دھندہ چھوڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے حواری سازندے نوکر چاکر سب اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ چوبارے میں وہ تن تنہا رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد عبدالحق کی راہ دیکھنا تھا۔ انتظار، انتظار، انتظار اور عبدالحق طبعًا اتنا بے نیاز تھا کہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ چار چار دن ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔

میں نے ممتاز بیگم سے پوچھا۔ ”تو نے دھندا کیوں چھوڑ دیا“۔

”جی نہیں چاہتا“۔ وہ بولی۔

”کیا جی چاہتا ہے تیرا“۔

”میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کی گھر والی بن جاؤں۔ اس کا انتظار کروں۔ اس کے لئے ہانڈی پکاؤں۔ اس کی جرابیں دھوؤں۔ جب وہ تھکا ہوا گھر آئے تو اس کے بوٹ اتاروں۔ پاؤں دباؤں“۔

”حیرت ہے“۔ میں نے کہا۔ ”طوائف گھر والی بننا چاہتی ہے“۔

”تم طوائف کو نہیں جانتے“۔ وہ ہنسی۔ ”یہ جتنی بھی طوائفیں کٹڑے میں بیٹھی ہیں، ان سب کے دلوں میں یہی آرزو ہے کہ کسی اپنے چناؤ کے مرد کی گھر والی بن جائیں“۔

”وہ تو شہزادیاں ہیں“۔ میں نے کہا۔ ”وہ تو سب کے دلوں پر راج کرتی ہیں“۔

”اونہوں“۔ وہ آہ بھر کر بولی۔ ”راج ایک کے دل پر ہوتا ہے سب کے دلوں پر نہیں۔ اور ایک کے دل پر راج کرنے کے لئے اس ایک کی باندی بننا پڑتا ہے“۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان آنسوؤں نے مجھے چپ کرا دیا۔ اور ہم دونوں دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”ایک بات پوچھوں“۔ میں نے کہا۔

"پوچھ۔ پوچھتا جا۔ میں جواب دیتی جاؤں۔ ہئے میری کتنی آرزو ہے کہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ وہ بھی جب بھی آتا ہے تو اپنی کہتا ہے۔ میری نہیں پوچھتا۔ پوچھ تو چپ کیوں ہو گیا"۔

"میں پوچھنا چاہتا تھا کہ تو بن ٹھن کر کیوں نہیں رہتی۔ اتنے میلے کپڑے پہنے بیٹھی ہے"۔

"بہت بن ٹھن لیا۔ بن ٹھن کر مولبھانا جو ہوتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ میراجی کرتا ہے میرے منہ پر توے کی کالک لگی ہو۔ ہاتھ کام کاج کی وجہ سے لت پت ہوں۔ جگہ جگہ الیاں بلیاں لگی ہوں۔ بالکل ہی گھر والی نظر آؤں"۔

"آتی ہے۔ بالکل ہی آتی ہے تو"۔ میں نے کہا۔

"سچ"۔ خوشی سے اس کے منہ پر سرخی جھلکی۔

"ہاں تجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تو چوبارے کی ہے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ والہانہ انداز سے اس نے ہاتھوں کے مندرہ بنائے۔ نرحت کی اور پھر ایک پوز بنا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں کتنی خوش ہوں"۔ وہ بولی۔ "پر تو میرا دل تو نہیں رکھ رہا۔

"سہیں"۔ میں نے کہا۔ "پر میں خوش نہیں"۔ "کیوں"۔ وہ بولی۔

"یہ سب کب تک چلے گا"۔ میں نے پوچھا۔

"نہ نہ نہ نہ —— یہ بات نہ کر"۔ وہ بولی۔ "جب تک چلے گا چلے گا"۔

"پھر" —— میں نے پوچھا۔

"چپ۔ مت بول۔ پھر نہیں سوچا کرتے۔ جو میں پھر کے چکر میں آ گئی تو یہ ساری روشنی رنگ رس ختم ہو جائے گا۔ اندھیرا چھا جائے گا"۔

"وہ تیرا ہو جائے گا کیا"۔ میں نے بات کا رخ بدلا۔

کون۔

عبدالحق۔

"صرف ایک دن کے لئے بھی میرا ہو جائے تو بس میرے لئے یہی بہت ہے"۔

میرے سینے میں ایک ٹھیس لگی۔

اس نے آہ بھری۔ بولی۔ "ایک ہفتہ، ایک دن. ایک گھنٹہ. ایک گھڑی کے لئے وہ مجھ میں گھل جائے جیسے شکر پانی میں گھل جاتی ہے۔ پھر نہ پانی رہتا ہے نہ شکر"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری۔ "کہاں ہے تو"۔ وہ بولا۔ "دیکھتا کیوں نہیں تو"۔

"کیا دیکھوں"۔ میں نے کہا۔ "کچھ دیکھنے کو ہے کیا"۔

"یہ اتنے سارے لوگ جو چل پھر رہے ہیں"۔

"یہ سب کامے ہیں۔ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بزی ہیں۔ انسان اس وقت باہر نکلتا ہے جب کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان دنوں بازاروں میں انسان گھومتے پھرتے تھے۔ اب کامی ہیں۔ اونہوں۔ یہ وہ امرتسر نہیں"۔

اشفاق حسین بولا۔ "ہاں یار! یہاں کسی عورت کی خشبو نہیں آئی"۔

پدمنی

"ارے"۔ میں چونکا۔ "واقعی نہیں آئی"۔

"کیا امرتسر کی عورتیں باہر نہیں نکلتیں"۔

"نکلتی ہیں۔ کیوں نہیں نکلتیں۔ ہال بازار میں میں نے چار ایک دیکھی تھیں"۔

"سچ"۔ وہ بولا۔ "میں نے تو نہیں دیکھیں"۔

"عورتیں تو تھیں لیکن ان میں خشبو نہیں تھی۔ اس لئے وہ گزر گئیں اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلا"۔

ہمارے زمانے میں امرتسر عورت کی خشبو سے یوں بھرا رہتا تھا جیسے گرمیوں میں پھل منڈی آموں کی خشبو سے بھری رہتی ہے۔

اس زمانے میں امرتسر حسن سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کشمیری آباد تھے۔
بے شک کشمیر میں رنگ ہوتا ہے. روپ ہوتا ہے. خدوخال ہوتے ہیں. مگر حسن

نہیں ہوتا۔ رنگ روپ اور خدوخال میں جب تک ذہن شامل نہ ہو حسن نہیں بنتا۔

کشمیری کو کشمیر سے نکال کر پنجاب میں لے آؤ۔ پنجاب کی ہوا میں اسے سکھاؤ. پھر پنجاب کے پانی کے چھینٹے دو تو ایک عجیب سا خمیر اٹھتا ہے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

صرف عورتوں کی بات نہیں کشمیری مرد بچے. بوڑھے سبھی امرتسر میں آکر حسین بن گئے تھے۔ مردوں کی آنکھوں سے رنگ کی پھوار اڑنے لگی تھی. بوڑھوں کے چہرے نورانی ہو گئے تھے. بچے معصومیت کے حسن سے لد پھند گئے تھے۔ کشمیریوں میں شعور پیدا ہو گیا کہ وہ حسین ہیں۔ حسن کا شعور پیدا ہو جائے تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

پھر لالائیں تھیں شمالی ہند کی شمالی ہندو قوم اپنے حسن کی وجہ سے مشہور ہے۔ لالائیں بڑی کومل ہوتی ہیں۔ ان کے حسن میں معصومیت ہوتی ہے. دھیما پن ہوتا ہے. ٹھہراؤ ہوتا ہے. چھلک نہیں ہوتی۔ بھڑک نہیں ہوتی۔ یہ سب ہندو روایات کی وجہ سے ہے. رہت بہت اور خوراک کی وجہ سے ہے۔

ہندو قوم ایک قدیم قوم ہے۔ ہندو کردار میں بڑے مثبت عناصر ہیں۔ ان میں تحمل ہے. مٹھاس ہے. عجز ہے۔ رکھ رکھاؤ ہے۔ خودداری ہے. سبھی کچھ ہے بس وہ ایک منفی وصف کی وجہ سے مار کھا گیا۔ ہندو کی ہڈی میں اونچ نیچ ایسی رس بس گئی کہ نکالے سے نہیں نکلتی۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے. ہندو بڑی خوددار قوم ہے۔ ان کے کلچر نے عورت کو آنکھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ جبھی تو ہندو عورت جھکی جھکی آنکھوں والا حسن رکھتی ہے. لاج بھرا حسن۔

ہندو عورت میں حسن تو عام ہوتا ہے لیکن عورت کم کم ہوتی ہے۔ حسن اور چیز ہے عورت اور چیز۔

اس عظیم حقیقت کو سب سے پہلے پنڈت کوکا نے محسوس کیا تھا۔ صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اپنے کام شاستر میں اس کی وضاحت بھی کر دی۔

پنڈت کوکا کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ حسین عورت پدمنی ہوتی ہے۔ لہٰذا جب بھی شادی کرو۔ پدمنی سے کرو۔

پتہ نہیں کہ ایسا کیوں ہے مگر ایسا ہے کہ عورت جتنی حسین ہو گی اتنی ہی اس میں

عورت کم کم ہوگی۔ جتنی عورت زیادہ ہوگی اتنا ہی حسن کم کم ہوگا۔

عورت میں مانگ ہے۔ وہ سراسر مطالبہ ہی مطالبہ ہے۔ اتنا مطالبہ کہ اسے پورا کرنے کی مرد میں توفیق نہیں۔

حسینہ میں مطالبہ کم ہے ممتا زیادہ۔

حسینہ ایک خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے۔ عورت آگ سلگا دیتی ہے۔ جبھی ہندی میں اسے ناری کہتے ہیں۔

آج کی دنیا میں پدمنی پیش پیش نہیں ناری پیش پیش ہے۔ پدمنی سے یہ خوشبو نہیں آتی۔ وہ یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ رک جاؤ۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ دیکھو میں ناری ہوں۔ دیکھو اور سلگو۔

بشر سیمابی

دفعتاً تانگے والا چلایا۔ ”مہاراج یہ چوک فرید ہے“۔

”چوک فرید“ —— میں چونکا۔

”اونہوں۔ یہ تو چوک فرید نہیں۔ یہاں تو سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ وہ نعرا مستانہ ہے۔ نہ وہ للکار ہے۔ نہ وہ غنڈہ بازی ہے۔ نہ کوئی شعر پڑھ رہا ہے نہ ماہیا گنگنا رہا ہے۔ یہ تو کوئی شریف آباد لگتا ہے“۔

چوک فرید میں بشر کونے سے لگا کھڑا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ پچپن برس پہلے کھڑا ہوتا تھا۔ شرمایا شرمایا۔ لجایا لجایا۔ ڈرا ڈرا، سہما سہما۔

بشر میرا ہم جماعت تھا۔ اونچا۔ لمبا گورا چٹا۔ حسین۔

حسن نے اس کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔

چوک فرید کی ہر نوجوان لڑکی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ پتہ نہیں بشر کی کونسی خصوصیت انہیں بھا گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ اونچا لمبا تھا۔ گورا چٹا تھا یا اس لئے کہ وہ بات بات پر شرما جاتا تھا۔

چوک کی ہر لڑکی کی خواہش تھی کہ وہ صبح سویرے اس کا منہ دیکھے اور سلام کرے۔ یہ بات بشر کے لئے سوہان روح تھی۔ کالج میں میں بشر کا واحد دوست تھا۔ اس لئے وہ اپنی

جملہ مصیبتوں کا رونا میرے سامنے رویا کرتا تھا۔ آج سلطانہ نے مجھے چھ سلام کیئے۔ آج بانو نے مجھے فلائنگ کس پھینکا۔ آج صبوحی نے دور سے باہیں پھیلا کر مجھے سینے سے لگالیا۔ ہائے اب کیا ہو گا۔ ضرور کسی نے دیکھ لیا ہو گا۔

بڑی واہیات لڑکیاں ہیں جو ایسی بیہودہ حرکتیں کرتی ہیں۔ میں منہ زبانی اس سے ہمدردی کرتا اور دل ہی دل میں آہیں بھرتا۔ کاش کوئی مجھے بھی سلام کرتی۔ کوئی فلائنگ کس میری طرف پھینکتی۔

پھر وہ دن بھی تھا جب بشر نے گھنیاں کے کنٹرے کی سینما میں مشاعرہ کروایا تھا۔ بشر خود شاعر تھا۔ بشر سیمابی تخلص کرتا تھا۔ اس مشاعرہ میں ساغر سیمابی آیا تھا۔

توبہ اس قدر چنچل جوان اور پھر اتنا ان جھک اس میں ذرا جھجھک نہ تھی۔ سینما کے مقابل کے چوبارے والی گلابی طوائف کو دیکھ کر یوں مست ہو گیا جیسے سانپ بین پر ہوتا ہے۔ ہال چھوڑ کر سینما کے صدر دروازے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھا اور ترنم سے گلابی کو شعر سنانے لگا۔

نظر کو ہے عادت تماشہ، جہاں ہو۔ جیسا ہو۔ جس طرح ہو
کوئی یہ حسن ازل سے کہہ دے کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو

نہیں نہیں یہ تو چوک فرید نہیں ہے یہ تو چوک مستقیم ہے۔ یہاں کوئی ٹیرھی لکیر نہیں ہے۔ سب سیدھی۔ سیدھی ٹُتک — نہ کوئی نعرا لگا رہا ہے۔ نہ بلّے کا بول گا رہا ہے۔ نہ راہ چلتی کو چھیڑ رہا ہے۔ نہ مونچھ پر تاؤ دے رہا ہے۔ نہ بڑھک مار رہا ہے۔ نہ آوازہ کس رہا ہے۔ نہیں یہ چوک فرید نہیں ہو سکتا۔

اسی چوک فرید میں پہلی بار میں اُس ڈرے ڈرے بھا ماجھے سے ملا تھا۔ جسم صاف ستھرا۔ لباس بانکا۔ کڑھی ململ کا کرتا۔ لٹھے کی شلوار، اڑتے بال۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ ذہین تیز ادیب۔

ان دنوں وہ روسی کہانیوں کے ترجمے کرنے میں مصروف تھا۔
میں نے کہا۔ "یہ کیا کر رہا ہے تو"۔
تنک کر بولا— "ترجمہ"
"ترجمہ کیوں"۔

“ترجمہ کیوں نہیں”۔ اس کی پیشانی پر تیوری پڑ گئی۔

“طبع زاد کیوں نہیں”۔ میں نے کہا۔

“نہیں ابھی نہیں”۔

“کیوں نہیں”۔

“بس نہیں”۔

“وجہ”۔

“ابھی برتن نہیں بھرا”۔

“کون سا برتن”

“پہلے برتن بھرتا ہے پھر چھلکتا ہے”۔ اس نے پنی عینک کے بڑے بڑے شیشوں سے مجھے گھورا۔

“کتنی دیر سے تو برتن بھر رہا ہے”۔ میں نے پوچھا۔

“برتن جو بڑا ہے”۔

وہ گورا چٹا سہما سہما برتن سعادت حسن تھا جو بھر کر منٹو بن گیا اور چھینٹے اڑانے لگا۔

جب تانگا دوبارہ اوور برج پر پہنچا تو اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری۔ “دیکھو” وہ بولا۔ “ہندنی”۔

پل کے جنگلے کے ساتھ ساتھ ایک پدمنی سمٹی سمٹائی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی جھکی تھیں۔ سفید رنگ پر لاج کی سرخی جھلملا رہی تھی۔

امرتسر میں وہ واحد حسینہ تھی جسے ہم نے دیکھا۔ مڑ مڑ کر دیکھا۔ بار بار دیکھا۔ لیکن اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔

اشفاق حسین گنگنانے لگا۔

“ماتھے پہ بندی آنکھ میں جادو”

سٹیشن پر پہنچے تو تانگے والا سکھ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مہاراج کوئی اور سیوا۔ اس وقت اس میں ہندو کا عجز تھا اور سکھ کا خلوص تھا۔ میرا جی چاہا کہ بڑھ کر اسے گلے سے لگا لوں لیکن مجھ میں جرات نہ پڑی۔ بہر حال ہم تانگے والے سے یوں جدا ہوئے

جیسے سالہا سال اکٹھے رہنے کے بعد بچھڑ رہے ہوں۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے، مگر ایسا ہوتا ہے. اکثر ہوتا ہے۔ ایک شخص کے ساتھ آپ گھنٹوں بلکہ دنوں رہتے ہیں اور جدا ہوتے وقت کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے کچھ فرق نہ پڑا ہو۔ ایک شخص کے ساتھ آپ چند گھڑیاں اکٹھی گزارتے ہیں اور جدا ہوتے وقت اور بعد میں بھی دنوں احساس جدائی سے چھلکتے رہتے ہیں۔

اس وقت شام ہو چکی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیا کھائیں. کہاں کھائیں۔

ہم میں سے ـــــــ مگر نہیں

ابھی اس مسئلے پر سوچ ہی رہے تھے کہ ریسٹ ہاؤس سے بلاوا آ گیا۔ آؤ آؤ اپنے حصے کی رقم وصول کر لو۔

"رقم ـــ کون سی رقم"۔ میں نے پوچھا۔ "رقم تو ہم لے چکے"۔

اشفاق حسین ہنسا۔ "یار ہمیں فارن ایکس چینج دینے کی ذمہ داری جج آفس پر ہے نا۔ ۱۰۱ روپے کی جو رقم ہم نے جمع کرائی تھی اس میں سے وہ ہمیں ہندی کرنسی بھی تو دیں گے"۔

جب ہم ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تو خیمے کے مقابل میں ایک پلاٹ میں جملہ لیڈران بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے رجسٹر کھول رکھا تھا۔ اس کے روبرو زائرین کی قطار لگی ہوئی تھی۔

"یہ لوگ خیمے میں کیوں نہیں بیٹھے"۔ میں نے پوچھا۔

"خیمے میں زائرین کے درمیان میں بیٹھیں کیا"۔ اشفاق حسین نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ـــــ"

"کیوں نہیں ہو سکتا"۔

"کیا وہ ہم میں سے نہیں ہیں"۔

"بھئی وہ لیڈر ہیں"۔ وہ ہنسا۔

اشفاق سچ کہتا تھا۔ وہ ہم میں سے ہونے کے باوجود ہم میں سے نہیں تھے۔

جب داتا کے دربار میں زائرین کو ہار پہنائے گئے تھے تو انہیں وہ ہار نہیں پہنائے گئے

تھے جو باقی زائرین کے گلوں میں ڈالے گئے تھے۔ ان کے ہار خصوصی تھے۔

جب دستار بندی ہوئی تھی تو لیڈران کرام کی دستاریں خصوصی تھیں۔

جب ہم لاہور سے واہگہ کی طرف بسوں میں روانہ ہوئے تھے تو ان کے لئے خصوصی ویگن کا انتظام تھا حالانکہ بسوں میں بہت سی جگہیں خالی تھیں۔

جب ہم ہندوستانی بارڈر سے روانہ ہونے والے تھے اور ہماری آنتیں بھوک کے مارے قل ہواللہ پڑھ رہی تھیں تو وہ ہمارے سامنے ہندوستانی اہلکاروں کے ساتھ کھڑے ہو کے لنچ کھا رہے تھے۔

جب ہم نے امرتسر کے سٹیشن پر ریسٹ ہاؤس کے خیمے میں اڈا جمایا تھا تو انہوں نے خیمے سے دور مگر سامنے پلاٹ میں ڈیرا جمالیا تھا۔ حالانکہ وہاں الگ بیٹھنے میں بظاہر کوئی امتیاز نہ تھا۔ پھر بھی وہ ہم میں نہیں بیٹھے تھے۔

پتہ نہیں اس علیحدگی کی کیا وجہ تھی۔ بہر حال ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے زائرین کے اس جتھے میں دو قومیں موجود تھیں۔ ایک زائر دوسرے لیڈر۔ اللہ جسے چاہے عزت دے۔

چوگا

"نمبر ۴۰" رقم بانٹنے والے لیڈر کی آواز آئی۔ ارد گرد کھڑے ساتھیوں نے اسے دہرایا۔ ایک صاحب بولے "چالیس نمبر یہاں نہیں ہے"۔

"یہ کھڑے ہیں"۔ دوسرے زائر چلائے اور میری طرف اشارہ کیا۔ پھر مجھ سے بولے۔ "آپ چالیس نمبر ہیں نا"۔

"میں" ـــــ میں نے چونک کر کہا۔ "میں کیا نمبر ہوں"۔

"نمبر یاد رکھئے، اس میں سہولت رہتی ہے"۔ لیڈر اپنے معمول کے مطابق بڑے اخلاق سے بولے۔

"جی میں یاد رکھوں گا۔ دراصل میں نے نہ تو کبھی پولیس میں نوکری کی ہے نہ جیل میں رہا ہوں، اس لئے نمبر سے مانوس نہیں ہوا"۔

خزانچی لیڈر نے ایک سو روپے کا بھارتی نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور دستخط

کرنے کے لئے رجسٹر آگے بڑھا دیا۔

اشفاق حسین کا نمبر ۱۴ تھا۔ میرے بعد وہ رقم لینے کے لئے آگے بڑھا۔ زائرین میں چہ مےگوئیاں ہو رہی تھیں۔

"یہ کیا۔ سو روپیہ دے کر ٹال دیا"۔

"نہیں نہیں ابھی اور دیں گے"۔

"ڈھائی سو دیں گے ڈھائی سو"۔

"کب دیں گے قسطوں میں دیں گے کیا"۔

"بالکل بالکل۔ بڑے بوڑھے بچوں کو تھوڑا تھوڑا دیتے ہیں تاکہ ایک دم سارا کھا پی کر اڑا نہ دیں"۔

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

چھوٹی ڈاڑھی

پیارے بچو صبر کرو۔ صبر کرو۔ ضرور ملے گا۔ تھوڑا تھوڑا ملے گا۔ جیسے چوگا ملتا ہے۔

اگلی قسط دلی میں ملے گی۔ ایک نوجوان آدمی بڑی بے تکلفی سے زائرین کے ہجوم میں آ داخل ہوا۔

میں نے اسے غور سے سے دیکھا۔ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔

وہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی۔ لمبا منہ۔ بے جھجک انداز۔ بے تکلف گفتگو۔ بے چین۔ ابھی یہاں تھا اب وہاں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ہر بات کا علم تھا۔

میں نے اشفاق حسین کو کہنی ماری۔ "یار یہ شخص کون ہے۔"

"پتہ نہیں" وہ بولا۔

"یہ ہم میں سے ہے کیا؟"

"ہمارے ساتھ تو نہیں آیا۔"

"لیکن اس وقت تو یہ ہم میں سے دکھتا ہے۔"

“ہاں” وہ بولا “اس کا بیگ خیمے میں پڑا ہے۔ ”

“شاید لیڈران کرام میں سے ہو۔ ”

“اونہوں۔ لیڈروں میں سے ہوتا تو کیا زائرین کے خیمے میں بسیرا کرتا۔ ”

“چلو ہٹاؤ ہو گا کوئی۔ ” میں نے کہا۔

رقم وصول کرنے کے بعد پھر وہی سوال ابھرا۔ کیا کھائیں کہاں کھائیں۔

“میں تو بھئی کسی مسلمان کی دکان سے کھاؤں گا۔ ” اشفاق حسین نے کہا۔

“ارے تم تو ہندو بن گئے۔ ”

“کیوں” وہ بولا۔

“تقسیم سے پہلے مسلمان نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ ہندو دکان ہے کہ مسلمان کی دوکان ہے۔ مسلمان نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ ہندو پانی ہے یا مسلمان پانی ہے لیکن ہندو ہمیشہ یہی سوچتا تھا چاہے کتنی بھی پیاس لگی ہوتی وہ ہندو پانی کا انتظار کرتا تھا۔ مسلمان کی دوکان سے کھانے پینے کی کوئی چیز لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو مسلمان کریانے سے بھی سودا نہیں خریدتا تھا۔ ”

“تم جو بھی چاہے کہو لیکن میں تو مسلمان کی دوکان سے کھاؤں گا۔ ” اشفاق حسین بولا۔

“یہاں مسلمان ہوٹل کہاں” میں نے کہا۔

دفعتاً جھاڑیوں سے وہی چھوٹی داڑھی والا نوجوان نکل آیا۔ بولا مسلمان کا ہوٹل ہے۔

“یہاں امرتسر میں؟”

“ہاں یہاں امرتسر میں۔ ریلوے سٹیشن کے سامنے وہ جو سامنا چوک ہے نا۔ وہاں سے بائیں ہاتھ مڑ جاؤ۔ دائیں طرف چوتھی دکان۔

“دال مل جائے گی وہاں۔ ” اشفاق حسین نے پوچھا۔

“دال ہی ملے گی۔ گوشت بھی ہوتا ہے۔ نہ ہونے کے برابر۔ ” چھوٹی داڑھی والا بولا۔

“کیا مطلب” میں نے پوچھا۔

“بوٹی توڑ سکو تو کھالو۔ ” وہ ہنسا اور کیمپ کی طرف چلا گیا۔

“واہ” میں نے کہا۔ “عجب آدمی ہے یہ۔ ہم میں سے نہیں پھر بھی ہم میں سے ہے۔ لیڈروں میں سے نہیں پھر بھی لیڈروں سے گاڑھی چھنتی ہے۔ انفریشن افسر نہیں پھر بھی معلومات کا پلندہ ہے۔ ”

ابھی ہم ہوٹل کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وہ پھر سے واپس آ گیا۔

“کیوں واپس آ گئے” میں نے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ “ہاں۔ وہ آدمی جو ریسٹ ہاؤس کے دروازے میں کھڑا ہے نا۔ اسے دیکھ کر واپس آ گیا۔ وہ مجھ سے لیس ہو جائے گا۔ جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ وہ ہر کسی سے لیس ہو جاتا ہے۔ آپ سے ہو۔ تو احتیاط رکھیں۔ ”

“کیوں۔ ” میں نے پوچھا۔

“سی۔ آئی ڈی کا ہے۔ ”

“ارے۔ اسے یہ بھی پتہ ہے کہ کون کیا ہے۔ ”

ریسٹ ہاؤس میں کھڑے آدمی سے ڈرنے کی بجائے مجھے چھوٹی داڑھی والے نوجوان سے خوف آنے لگا۔ پتہ نہیں یہ کس کا آدمی ہے۔

“آیئے کھانا کھانے چلیں۔ ” اشفاق حسین بولا۔

میرا دل ڈوب گیا۔ کہیں یہ ساتھ نہ چل پڑے۔

“نہیں نہیں شکریہ۔ ” وہ بولا میں ذرا پلیٹ فارم پر جاؤں گا۔

“چلو چلیں۔ ” اشفاق حسین نے کہا۔

میرا دل پھر سے ڈوب گیا۔

پک نِک

صاحبو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ کبھی کسی بیمار کے ساتھ پک نک پر نہ جانا۔

پک نک کے متعلق ہر کسی کا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کار میں پک نک سپاٹ پر جاتے ہیں۔ وہاں کسی اونچے ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔ اور پھر برآمدے میں بیٹھ کر احساسِ فراغت اور شوکتِ نفس سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔

شاید اس لئے کہ میں چھوٹا آدمی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پکنک میں کار اور بڑا ہوٹل نہیں چلتے۔ پیدل کے بغیر پکنک نہیں ہوتی۔ اجلے کپڑوں کے بغیر پیدل نہیں ہوتا۔ تھیلا اٹھا رکھا ہو۔ کپڑے استری سے بے نیاز ہوں۔ ایسے کہ جہاں جی چاہا زمین پر گھاس پر بیٹھ گئے۔ یہ غم نہ ہو کہ لباس میلا ہو جائے گا۔ لباس میلا نہ ہو جانے کا احساس ہو تو پک نک نہیں ہو سکتی۔

پھر یہ بھی ہے کہ میرے ذہن میں پک نک کو کھانے سے بہت تعلق ہے۔ ہوٹل کی میز پر چینی کی رکابیوں میں نہیں۔ چلتے پھرتے کھانے سے۔ چیز ریہڑی والے سے خریدو. چھابڑی والے سے خریدو۔ کھوکھے سے خریدو۔ اور بلا تکلف کھاتے جاؤ۔ چلتے پھرتے کھاؤ۔ کھڑے کھڑے کھاؤ۔ زمین پر بیٹھ کر کھاؤ۔

کہیں بھی کھاؤ مگر کھاؤ ضرور۔ گنڈیریاں کھاؤ۔ ان چھلا سیب کھاؤ۔ ریوڑیاں کھاؤ۔ مونگ پھلی کھاؤ۔ آئس کریم چاٹو۔ لفافے سے نکال کر کباب کھاؤ۔ چاٹ کھاؤ۔ چنے کھاؤ۔ پکوڑے کھاؤ۔ بھول جاؤ کہ لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ بھول جاؤ کہ تہذیب سے کھانا کیا ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کہ تم ایک لق و دق صحرا میں ہو۔ اکیلے آوارہ۔ تم نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ کوئی تمہیں دیکھ نہیں رہا۔ تم سب کو دیکھ رہے ہو۔

بے شک ہند کا ٹرپ ایک مقصد کے لئے تھا۔ ہم ہومیوپیتھی کی کتابیں خریدنے جا رہے تھے۔ بے شک ہم نے زائرین کا روپ دھار رکھا تھا۔ بے شک قدم قدم پر اب دیکھ کر جب کا خیال آتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ہند کا وہ سفر ایک پک نک تھا۔

پکنک میں دو باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ ایک احساس فراغت دوسرے دیکھنے کو بہت کچھ۔ یہ دیکھو وہ دیکھو. ادھر دیکھو. ادھر دیکھو. دیکھتے جاؤ۔

اس ٹرپ میں دونوں باتیں موجود تھیں۔ دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ ہند کی ہر چیز ہمارا دامن تھام لیتی تھی۔ دیکھو میری طرف دیکھو ساتھ احساس فراغت تھا۔ اس کے علاوہ ایک ساتھی بھی تھا۔ پرانا ساتھی لیکن اس کی بیماری نے سب ملیا سیٹ کر رکھا تھا۔ منہ بند چلتے جاؤ۔ خالی پیٹ دیکھو۔ خالی پیٹ دیکھنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔

ام بی بی ایس

دقت یہ تھی کہ میرا ساتھی بیمار نہ بھی ہوتا تو بھی مجھے منہ بند ہی رہنا پڑتا۔ اس لئے کہ اشفاق حسین پیدائشی طور پر ایک ام بی بی ایس ہے۔

یا اللہ کوئی ام بی بی ایس ساتھی نہ بنے۔
یہ نہ کھاؤ گلا خراب ہو جائے گا۔
یہ نہ کھاؤ کھانسی لگ جائے گی۔
اونہوں یہ کھا جانگا پڑا ہے۔

لوگ کہتے ہیں وہ شخص جس نے جراثیم دریافت کئے بہت بڑا آدمی تھا۔ میں کہتا ہوں اس شخص نے بنی نوع انسان پر بڑا ظلم کیا۔ انہیں جراثیم کا احساس دلایا۔ جراثیم نے اتنی بیماریاں پیدا نہیں کیں جتنی جراثیم کے احساس نے پیدا کیں۔

بے شک دنیا میں بڑی بڑی مہلک بیماریاں ہیں لیکن پتہ ہے ان سب سے بڑی بیماری کون سی ہے۔ ان سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ آپ ہر وقت صحت کا احساس سینے سے لگائے رکھیں۔ انگریزی میں اس بیماری کو ہیلتھ کنسرن کہتے ہیں۔

تقسیم کے بعد جب میں ایئر فورس میں تھا اور ہم ہونے والے افسروں کی نفسیت کا تجزیہ کیا کرتے تھے تو ڈاکٹر لطیف اور ڈاکٹر ثناء اللہ نے مجھے بلا کر کہا تھا کہ امیدواروں کا رورشاک ٹسٹ لیتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ کوئی ہیلتھ کنسرن کا مریض ایئر فورس میں داخل نہ ہو جائے۔ ایئر فورس میں باقی سب ذہنی الجھنیں چل جاتی ہیں. ہیلتھ کنسرن نہیں چلتی۔ ڈاکٹر لطیف اور ثناء اللہ ام بی بی ایس ڈاکٹر نہ تھے بلکہ پی ایچ ڈی اور ڈی ایس سی ڈاکٹر تھے۔

میرا ساتھی اشفاق حسین صرف ایم بی بی ایس زاویہ نظر کا مالک نہ تھا۔ بدقسمتی سے وہ بیشتر بیماریوں سے واقف تھا۔ بیشتر سے زیادہ ایلوپیتھک دوائیوں سے واقف تھا۔ تمام پرہیزوں اور احتیاطوں سے واقف تھا۔ اور جراثیم سے تو اس قدر واقف تھا جیسے بچپنے سے ان کے ساتھ کھیل کھیل کر جوان ہوا ہو۔ اس کے علاوہ اخلاق کے بارے میں اس کے خیالات بہت وسیع و عریض تھے. لہٰذا گھومتے پھرتے ہوئے کھانے پینے کو اچھا نہیں جانتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہند کا یہ ٹرپ میرے لئے پک نک نہ بن سکا۔ کھانا خارج از امکان ہو گیا۔ صرف دیکھنا ہی دیکھنا باقی رہ گیا۔

امرتسر میں مسلمان کا وہ ہوٹل ایک میلی سی تنگ سی دوکان تھی۔ پتہ نہیں دال کیسی تھی۔ گوشت واقعی "توڑ سکو تو کھالو" قسم کا تھا لیکن اس وقت میں اس قدر بھوکا تھا کہ میں نے کھانے کی بجائے نگلنا شروع کر دیا۔

* * *

فرنٹیئر میل

جب مجھے پتہ چلا کہ ہم فرنٹیر میل سے دلی جا رہے ہیں۔ تو میں اس قدر مشتعل ہوا کہ مجھے پسینہ آگیا۔

ارے تو ہم فرنٹیر میل سے سفر کر رہے ہیں۔

میری زندگی میں فرنٹیر میل کی حیثیت ہمیشہ ایسے رہی جیسے دیہاتی کے لئے میلا ہو۔ بالکل ایسے جیسے گوجرانوالے کے ارد گرد کے دور دراز گاؤں والوں کے لئے بیساکھی کے میلے کی ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے ۱۹۳۲ء میں ٹریننگ کرنے کے بعد میری پہلی تعیناتی خانے وال میں ہوئی تھی۔

وہ خانے وال یہ خانے وال نہ تھا۔ جو آج دکھائی دیتا ہے۔ ان دنوں ابھی نہر نہیں چلی تھی۔ سبزے کا نام نشان نہ تھا۔ ریت ہی ریت، ریت ہی ریت۔

زمین کی جگہ ریت کے ٹیلے تھے۔ جو روز شکل بدلتے رہتے تھے۔ قصبہ خود ریت کا ٹیلا تھا جہاں ہر جگہ ریت ہی ریت تھی۔ ہوا میں ریت، سڑکوں پر ریت، گھروں میں ریت، الماریوں میں ریت، کھانے میں ریت، منہ میں ریت، آنکھوں میں ریت

زمین کی جگہ ریت کے ٹیلے تھے۔ جو روز شکل بدلتے رہتے تھے۔ قصبہ خود ریت کا ٹیلا تھا جہاں ہر جگہ ریت ہی ریت تھی۔

طوفان رنگ و بو

وہ مدرسہ جہاں میں پڑھا تھا۔ ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب تھا ریلوے ٹائم ٹیبل بنانے والوں نے ہم پر یہ احسان کر رکھا تھا کہ فرنٹیئر میل کی آمد کا وقت تفریح میں پڑتا تھا۔

جونہی ریس کی گھنٹی بجتی دو ایک ٹیچر تفریح کے لئے سٹیشن کی طرف اٹھ بھاگتے۔

پلیٹ فارم خریدنے کی ضرورت نہ تھی چونکہ ریلوے کے بابوؤں کے بچے خانیوال کے اکلوتے مدرسے گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ سٹیشن پر پہنچ کر ہم اطمینان کا سانس لیتے کہ ابھی فرنٹیر میل نہیں آئی ساتھ ہی فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کہیں زیادہ لیٹ نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تفریح تفریح کے بغیر ہی گزر جائے۔

ان دنوں خانے وال کا سٹیشن بہت بڑا سٹیشن تھا۔ جتنا بڑا تھا اتنا ہی ویران۔

خانے وال خالی سٹیشن ہی سٹیشن تھا۔ پیچھے قصبہ برائے نام تھا لیکن سٹیشن جتنا بڑا تھا۔ اتنا ہی ویران تھا۔ اڑتی ریت میں بابو بھوت بنے پھرتے۔ قلی منہ پر صافہ باندھے پھرتے۔ مسافر تو کبھی کبھار نظر آتے تھے۔ پلیٹ فارم آہیں بھرتا رہتا۔ ہوا سیٹیاں مارتی۔ ماحول دھند آلود۔

جب دور سے فرنٹیر میل کی کوک سنائی دیتی تو ہم یوں اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ جیسے آج کل کے نوجوان کو کوک کی بوتل مل گئی ہو۔ پھر ایک چٹی سفید ٹرین زوں سے سٹیشن میں داخل ہو جاتی جیسے مٹیالے اندھیرے میں سے روشنی کی کرن نکل آئے۔ اس پر ہمارے دل دھک دھک کرنے لگتے اور ہم دیوانہ وار اٹھ کر ٹرین پیمائی کرنے لگتے۔

چہرے ہی چہرے۔ گورے چہرے۔ تیکھے چہرے۔ کتابی چہرے۔ گول چہرے۔ غمگین چہرے۔ متبسم چہرے۔ آنکھیں ہی آنکھیں۔ شرباتی آنکھیں۔ ڈولتی آنکھیں۔ جھکی جھکی آنکھیں۔ چار آنکھیں۔ مرچیلی متکلم دیکھتی چھیڑتی آنکھیں۔

دفعتاً اس رتیلے صحرا میں ایک طوفان رنگ و بو انگڑائیاں لینے لگتا۔

ہم ان نظاروں کو بھوکی نظروں سے یوں سمیٹتے تھے جیسے بکری درختوں کے پتوں کو نگل کر سمیٹتی ہے تاکہ فرصت میں جگالی کر سکے۔

خانیوال میں ہمارے دو ہی مشاغل تھے۔ فرنٹیر میل کی پھل پتیاں پھر جگالی ہی

جگالی۔

جب ہم امرتسر سٹیشن میں داخل ہوئے تو پلیٹ فارم پر سواریاں بیٹھی تھیں۔ میں نے غور سے ان کا جائزہ لیا۔ اونہوں۔ یہ فرنٹیر میل کی سواریاں نہیں ہو سکتیں۔ یہ تو کسی لوکل کی سواریاں نظر آ رہی ہیں۔ کسی برانچ لائن کی۔

پھر جب گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو اس کی چال دیکھ کر ہی مجھ پر اوس پڑ گئی۔ اونہوں۔ یہ فرنٹیر میل نہیں۔ وہ تو مورنی کی طرح چلا کرتی تھی اور یہ۔ یہ تو یوں چھک چھک چلی آ رہی ہے جیسے مال گاڑی ہو۔ پھر اس کا رنگ بھی تو سفید نہیں۔ ارے یہ تو بالکل ہی ڈب کھڑبی ہے اور پھر سواریاں. اتنی صحت مند سواریاں. نہ دھان پان نہ نخرا. نہ نزاکت۔ صحت تو بڑی ان اٹریکٹو چیز ہے۔

بوگیاں

اتنے میں ہمارے لیڈر صاحب آ گئے۔ السلام علیکم. انہوں نے گرم جوشی میں کہا۔ سب لوگ آ گئے کیا۔ اونہوں۔ ابھی آپ سوار نہ ہوں۔ ہم نے دو بوگیاں ریزرو کرائی ہیں۔ وہ عام بوگیاں نہیں۔ بلکہ سلیپر ہیں تاکہ آپ آرام سے سو سکیں۔ ذرا ٹھہریئے ابھی بوگیاں لگیں گی۔

پہلی بوگی لگی تو تمام زائر اس کی طرف لپکے۔ اشفاق حسین نے میری آستین پکڑ لی۔ "اونہوں" وہ بولا۔ "اس میں بے صبروں کو جانے دو۔ ہم دوسری بوگی میں بیٹھیں گے۔"

میں رک گیا اور بوگی کو دیکھنے لگا۔ بوگی کا رنگ نہ کریم تھا نہ براؤن۔ پتہ نہیں کیا رنگ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پینٹ کی جگہ زنگار لگایا ہوا ہو۔

یہ بوگی فرنٹیر میل کو لگا رہے ہیں کیا۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں فرنٹیر میل کا اپمان ہے۔ فرنٹیر میل تو رنگ روپ کی گاڑی ہے۔ اس میں زنگار کیسے لگ سکتا ہے۔

زائرین سامان اٹھائے بوگی پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ لیڈر اپنی شیریں آواز میں ہدایات جاری کر رہے تھے۔ "حضرات بہتر ہو گا کہ آپ اپنے اپنے گروپ بنا لیں تاکہ سفر

میں آسانی ہو۔

ہم نے آپ کے آرام کے لئے عام بوگیاں ریزرو نہیں کرائیں بلکہ سلیپر ریزرو کرائے ہیں تاکہ آپ سفر میں آرام سے سو سکیں۔

"شاباش۔ آرام سے اطمینان سے سوار ہوں۔ بہت جگہ ہے۔ وقت بھی کافی ہے شاباش۔ "

لیڈر کے قریب ہی انڈین سیکوریٹی کا ایک گروپ کھڑا غور سے زائرین کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس گروپ میں چند ایک آدمی وردی میں ملبوس تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی اور اکتاہٹ کی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔

دوسری بوگی لگی تو ہم اس میں داخل ہو گئے۔ ہمیں کھڑکی کے نیچے کی دو سیٹیں مل گئیں. ہم نے ان پر سامان رکھ لیا۔

بوگی کی لکڑی پتہ نہیں کس نوعیت کی تھی۔ بے حد میلی اور ڈگ۔ نفاست نام کو نہ تھی۔ بدرنگ بھدے تختے۔ بالکل ہی ننگے۔ اوپر کوئی گدی نہ تھی۔

بوگی کی ایک سمت لمبی غلام گردش تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ چلنے پھرنے کے لئے ایک کاریڈار تھا۔ برآمدہ قسم کا کاریڈار۔ دوسری طرف کوپے قسم کے کمرے۔ چھوٹے چھوٹے کمرے۔ کمرے اور برآمدے کے درمیان دیوار نہ تھی۔

کوپے میں آمنے سامنے دو لمبی سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔ ہر سیٹ غالباً تین آدمیوں کے لئے تھی۔ سیٹوں کے اوپر ایک دو دو تختے فولڈ کئے ہوئے تھے۔ جنہیں کھولنے پر کل چھ مسافر آرام سے سو سکتے تھے۔

"واہ یہ دیکھو" اشفاق حسین نے مجھ سے کہا۔ "ہندنے کوپے کے اطراف میں دو دو تختے لگا کر سونے کی جگہوں کو ڈیوڑھا کر دیا ہے۔ "

"ڈیوڑھا نہیں دگنا۔ " میں نے اپنی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ہماری سیٹ کوپے کے اندر نہیں تھی بلکہ باہر کاریڈار میں کھڑکی کے نیچے تھی۔ کھڑکی کے نیچے بیٹھنے کی دو سیٹیں تھیں لیکن دونوں طرف سے تختے گرا دو تو وہ سونے کی لمبی سیٹ بن جاتی تھی۔ پھر اس سیٹ کے اوپر ایک تختہ بھی تھا۔

سونے کی چھ جگہیں کوپے کے اندر اور دو جگہیں کاریڈار میں۔ یعنی ایک ڈبے میں

آٹھ سلیپر۔

جیل گاڑی

"واہ کیا دماغ لڑایا ہے۔ " اشفاق حسین نے کہا۔ "ہمارے کوپے میں سونے کی صرف چار جگہیں ہوتی ہیں — لیکن یار " — وہ رک گیا — "یہ کوپے اتنے بھدے اور اداس کیوں ہیں — ایسے لگتا ہے جیسے یہ جیل کی گاڑی ہو۔ "

کوپے کے اندر بیٹھے ہوئے زائر قہقہہ مار کر ہنسے اور یہ جو کھڑکیوں پر لوہے کی سیخیں لگی ہوئی ہیں ذرا انہیں بھی تو دیکھو۔

"ارے " میں نے حیرت سے اپنی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ واقعی کھڑکی پر لوہے کی سیخیں لگی ہوئی تھیں. فریم پر نہیں کھڑکی پر۔ کھڑکی کے راستے اندر داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ نہ ہی سامان اندر آ سکتا تھا۔ "عجیب بات ہے " اشفاق حسین بولا " آخر سیخیں لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ "

"کھڑکی سے چائے کا پیالہ پکڑنا بھی ممکن نہیں " کسی نے کہا۔

"شاید یہ واقعی جیل گاڑی ہو۔ "

"فی الحال تو زائرین کی ہے۔ " ایک نے قہقہہ لگایا۔

"زائرین پر تو اچھا امپریشن ڈالنا چاہئے تھا۔ "

"شاید یہ سیخیں سیکوریٹی کے لئے ہوں۔ "

"بندوق کی گولی تو بہر حال اندر آ سکتی ہے۔ "

ہر کوئی کچھ نا کچھ کہہ رہا تھا۔

"ارے۔ " کچھ دیر کے بعد اشفاق حسین چلایا۔ "سارے کوپے میں صرف ایک پنکھا ہے۔ "

"واقعی۔ صرف ایک ہے۔ "

"کم از کم دو ہوتے ایک کا رخ ادھر ایک کا رخ ادھر۔ "

"آپ کو گرمی لگتی ہے۔ " ایک زائر نے کہا "تو پنکھے کا رخ اپنی طرف کر لیجئے۔ "

اس پر چھوٹی داڑھی والا نوجوان نہ جانے کدھر سے نکل آیا۔ “اونہوں” وہ بولا! “یہ پنکھے گھومتے نہیں۔ میرا مطلب ہے ریوالونگ نہیں۔”

“نہ گھومیں مگر موڑے تو جاسکتے ہوں گے۔ بس منہ موڑ لو۔”

“مڑتے بھی نہیں” چھوٹی داڑھی والا بولا۔ “فکسڈ ہیں۔ ہند میں پیڈسٹلز بھی ریوالونگ نہیں ہوتے. بس کھڑے کھڑے چلتے رہتے ہیں۔”

“آپ کہاں کے ہیں” ایک معتبر زائر نے چھوٹی داڑھی والے سے پوچھا۔

“ہمارے ساتھ تو نہیں آئے” دوسرا بولا۔

“ساتھ نہیں آیا لیکن ساتھ جارہا ہوں۔” چھوٹی داڑھی والے نے کہا۔

“ہم میں سے نہیں ہیں۔” پہلا بولا “لیکن ہم میں سے ہیں یہی نا۔”

“بالکل بالکل” چھوٹی داڑھی والا ہنسا اور پھرتی سے آگے نکل گیا۔

گنتی

چھوٹی داڑھی والے کے جانے کے بعد اس کی بات چلی نکلی۔ ہر کوئی اپنی رائے دینے لگا.....

“یہ کمال کا آدمی ہے ہمارے ساتھ نہیں آیا لیکن ہمارے ساتھ جارہا ہے۔”

“ایسے تو بہت سے ہیں جو ہمارے ساتھ نہیں آئے لیکن ہمارے ساتھ جارہے ہیں مثلاً پولیس کے ہیں۔ سیکوریٹی کے ہیں۔”

“کیا یہ بھی سیکوریٹی کا ہے۔”

“کیا پتہ۔”

“یہاں سیکورٹیاں بھی تو کئی ہیں۔ ممکن ہے پاکستانی سیکوریٹی بھی ہو۔”

“پھر تو ہم بڑے اہم لوگ ہیں۔” اشفاق حسین ہنسا۔ “جن کی خبر رکھنے کے لے اتنے سارے لوگ متعین ہیں۔”

“خاموش۔” ایک زائر بولا۔ “گنتی ہو رہی ہے۔”

“گنتی کیسی گنتی۔”

“ہماری گنتی۔”

جب سے ہم لاہور سے چلے تھے کئی بار ہماری گنتی ہو چکی تھی۔ داتا کے دربار پر بسیں چلنے سے پہلے ڈپٹی لیڈران گنتی فرماتے رہے تھے۔ ایک دو تین چار ـــــ نواسی۔ ٹھیک ہے چلو بھئی۔

پھر جب ہم ہند کے بارڈر میں داخل ہو رہے تھے تو سفید کپڑوں میں ملبوس دو آدمی ہمیں گن رہے تھے۔

ہند کی بس میں سوار ہوئے تو تین چار ہندی ہمیں گننے میں مصروف تھے۔

اب فرنٹیر میل میں گنتی ہو رہی تھی۔

گنتی ختم ہوئی تو کسی زائر کی آواز آئی۔ "اب غالباً دلی کے سٹیشن پر گنتی ہو گی۔ "

" بھائی وہاں تو صبح و شام گنتی ہو گی۔ "

اتنی اہمیت زندگی بھر مجھے کبھی نہ ملی تھی۔ کھڑکیوں پر سیخیں۔ بار بار گنتی۔ ساتھ پولیس والے جن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

دفعتہً سیٹی بجی اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

ننگا کلہاڑا

اشفاق حسین کو چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کہیں سفر کی کوفت کی وجہ سے طبیعت خراب تو نہیں ہو گئی۔

میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ "کیا سوچ رہا ہے تو۔ " میں نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ "

"کچھ تو ہے۔ "

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ "

"کیا؟"

"تو نے وہ قد آدم تصویر نہیں دیکھی۔ "

"کون سی؟"

“وہی جو یہاں امرتسر کے سٹیشن پر باہر پورٹیکو میں بڑے اہتمام سے لگی ہوئی ہے۔ ”

“نہیں۔ میں نے توجہ نہیں کی۔ ”

“وہ ایسی تصویر نہیں جو توجہ کرو تو نظر آئے۔ وہ تو آتے جاتے کے منہ پر تھپڑ مارتی ہے۔ ”

“کہاں لگی ہوئی ہے وہ۔ ”

“بکنگ دفتر کے مقابل۔ ”

“کیسی تصویر ہے ؟ ”

“ایک آدمی کی تصویر ہے۔ ٹانگیں بھی ننگی، دھڑ بھی ننگا. صرف ایک لنگوٹی پہن رکھی ہے۔ ”

“مہاتما گاندھی کی ہوگی۔ ”

“اونہوں ـــــ یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اگر تصویر لگانی ہی تھی تو مہاتما گاندھی کی لگاتے۔ ”

“تصویر ہے کس کی ؟ ” میں نے پوچھا۔

“جس کا مسلک مہاتما گاندھی سے بالکل متضاد تھا۔ تصویر سے تشدد کی بھڑاس نکل رہی تھی۔ ”

“اچھا۔ ”

“ہاں۔ ننگ دھڑنگ شخص۔ ہاتھ میں کلہاڑا۔ وہ تصویر بندہ بیراگی کی تصویر ہے۔ بندہ کو جانتے ہو۔ ”

دفعتاً مجھے یاد آیا ـــــ “ہاں بندہ ـــــ ”

میرے روبرو بٹالے کا مفتیاں محلّہ از سر نو آ کھڑا ہوا۔

ہمارے محلے میں دو عمارتیں بہت پرانی تھیں جو مفتیوں کے جد امجد نے بنائی تھیں۔ ایک کو رنگ محل کہتے تھے دوسری کو شیش محل۔ رنگ محل میں پھر بھی کچھ کچھ رنگ باقی تھا۔ شیش محل میں کوئی شیشہ نہ تھا۔

شیش محل کے نیچے بہت بڑا تہہ خانہ بنا ہوا تھا۔ اتنا بڑا جس میں پچاس ساٹھ آدمی

آسانی سے رہائش کر سکتے تھے۔ ایک دروازہ محلے میں کھلتا تھا۔ جو چور دروازہ تھا۔ باہر سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ دروازہ ہے۔ دوسرا دروازہ بازار میں کھلتا تھا۔ وہ کنواں دروازہ تھا۔ یعنی دروازے کے عین بیچ میں ایک کنواں بنا ہوا تھا جو آدھا باہر تھا آدھا اندر تہہ خانے میں تھا۔ باہر سے یوں معلوم ہوتا جیسے کنویں کے پیچھے دیوار ہو۔

اس وسیع و عریض تہہ خانے میں ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے ایک تالاب۔ جب ہم بچے تھے تو اکثر تہہ خانے میں جا کر اسے غور سے دیکھتے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شیش محل کے نیچے اتنا بڑا تہہ خانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر ہمیں محلے کی بڑی بوڑھیاں بتایا کرتیں کہ جب بندہ بیراگی شہر پر حملہ کیا کرتا تھا تو سارے مفتی محلے کے بڑے بچے جوان عورتیں اس تہہ خانے میں چھپ جایا کرتے تھے۔

“بندہ کون تھا” ہم پوچھتے۔

“تھا تو ڈاکو پر مسلمانوں کا بہت بیری تھا۔ ”

“اسے سرکار کچھ نہیں کہتی تھی۔ ”

“سرکار تو خود اس سے ڈرتی تھی۔ سپاہی بھاگ جاتے اور وہ کئی کئی دن شہر پر براجمان رہتا اور ہم دس دس پندرہ پندرہ دن تہہ خانے میں چھپے رہتے تھے۔ اتنی وحشت تھی بندے کی۔ ”

“وہ تو مسلمانوں کا بیری تھا۔ ” میں نے اشفاق سے کہا۔

“ہاں۔ ” وہ بولا۔ “ڈاکو تھا اور مسلمانوں کا بیری تھا۔ ”

“کیا تمہیں یقین ہے وہ تصویر بندے کی تھی۔ ” میں نے پوچھا۔

“ہاں۔ ” وہ بولا۔ “وہ تو یوں سٹیشن پر ٹنگی ہوئی ہے جیسے کسی نیشنل ہیرو کی ہو۔ ”

“اچھا مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ”

“ہندو تو خود کو سیکولر کہتا ہے۔ ” اشفاق حسین نے کہا۔

“ہاں کہتا تو ہے۔ ”

“پتہ نہیں۔ ”

“یہاں اتنے سارے فاریِنرز آ کر دیکھتے ہوں گے۔ وہ کیا کہتے ہوں گے۔ ”

"ہٹاؤ یار۔" میں نے کہا۔ "جو مرضی ہے کہے۔ جو مرضی ہے کرے۔ ہند بہت بڑا ملک ہے۔ بہت بڑی قوم ہے۔ دنیا کی تیسری طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ جو طاقتور ہوتے ہیں ان پر اخلاق عائد نہیں ہوتا۔ نیکی، شرافت، اخلاق، ضمیر، غریب ملکوں کے زیور ہیں۔"

گاڑی چھکا چھک چلے جا رہی تھی۔

باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

ہوا چل رہی تھی۔

میں نے اپنے پاؤں لوہے کی سیخوں کے ساتھ لگا رکھے تھے۔ پاؤں کو ٹھنڈی ہوا لگ رہی تھی جس کی وجہ سے میں کوپے کے پنکھے سے بے نیاز تھا۔

سیواکار لالہ جی

اس وقت مجھے صرف ایک دکھ لگا ہوا تھا۔ کاش کہ یہ گاڑی صبح کے وقت امرتسر سے روانہ ہوتی۔ امرتسر سے انبالے تک تمام علاقوں سے شہروں کی یادیں میرے دل میں چٹکیاں بھر رہی تھیں۔ ہر علاقے کا رنگ اور خشبو میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا سٹیشن میری یادوں کے آسمان پر تارے کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔

ظالمو یہ کیا کیا کہ مجھے رات کی گاڑی میں سوار کر دیا۔ اگر بتیس سال بعد میں انجانے پہچانے علاقوں کو ایک نظر دیکھ لیتا تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔

یہاں ماجھے کا علاقہ تھا —— دوابے کا علاقہ تھا۔ پرے مالوہ تھا۔

ماجھا پنجاب کا دل تھا۔

پنجاب کے جانے پہچانے لوک گیت "بلئے" کا وہ بول میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

بلئے —— نی ماجھے دی بند بوتلے، کیا خوبصورت تشبیہ تھی۔

یہ وہ علاقہ تھا جہاں شجاعت دلیری اور بہادری سب سے عظیم وصف تھے۔

جہاں صحت مندی حسن سمجھی جاتی تھی۔ جہاں حسین عورت وہ تھی جس کے گال میں خون کی سرخی جھلکتی تھی۔ جو بانہہ پکڑ لیتی تو چھڑانی مشکل ہو جاتی۔ جو شرماتی تھی، لبھاتی

تھی، آنکھیں جھکا لیتی تھی لیکن ہر بات پر نہیں۔ ہر کسی کے سامنے نہیں۔ صرف وہاں جہاں رضامندی اسے مجبور کر دیتی۔

مجھے موگا کا ہسپتال یاد آ گیا۔ لاٹاں یاد آ گئی۔

موگا کا ہسپتال آنکھوں کے علاج کے لئے سارے پنجاب میں مشہور تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر لالہ ہرچرن داس بہت بڑے سیوک تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد عوام کی خدمت کرنا تھا۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اس کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اتفاق سے میرا ماموں زاد بھائی ڈاکٹر امانت علی موگا میں تعینات ہو گیا۔

ان دنوں میں امانت سے ملنے موگا گیا ہوا تھا۔ امانت کا کوارٹر ہسپتال کے احاطے میں ہی تھا۔ وہ صبح ڈیوٹی پر گیا تو میرا خیال تھا کہ جلد فارغ ہو کر گھر آ جائے گا۔ دوپہر کو اس نے ایک کمپاؤنڈر کے ہاتھ کہلوا بھیجا کہ میں کھانے پر نہ آ سکوں گا۔

شام کو وہ پانچ بجے کے قریب گھر آیا تو میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔
”واہ“ میں نے کہا ”یہ عجب نوکری ہے کہ صبح کے گئے اب آئے ہو۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”بولا ڈاکٹر ہرچرن داس نہ خود آرام کرتا ہے، نہ مجھے کرنے دیتا ہے۔ وہ نوکری نہیں کر رہا، خدمت خلق کر رہا ہے۔ کوئی بھی کیس آئے کسی وقت بھی آئے۔ دن ہو یا رات۔ شرط یہ ہے کہ فوری نوعیت کا ہو، لالہ جی ہسپتال میں حاضر ہو جاتے ہیں۔“

ابھی ہم آدھ گھنٹہ اکٹھے بیٹھے ہی تھے کہ باہر شور مچ گیا وہ بازار میں بیہوش پڑی ہے۔

”اس کی حالت اچھی نہیں۔“

”گاڑی بھیجو گاڑی بھیجو۔“

لاٹاں:

لاٹاں ماجھے کی ایک نوجوان بیٹی تھی جو موگا سے پچاس ساٹھ میل دور کھپرا گاؤں میں رہتی تھی، جہاں نہ سڑک تھی نہ پگ ڈنڈی۔ صرف جھاڑیاں اور ریت۔

جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ ایسی جوانی جو صرف غریبوں، محنت کشوں اور آرام و آسائش سے محروم کٹھن زندگی گزارنے والے لوگوں پر آتی ہے۔ وہ حسین تھی لیکن اس کا

حسن مہذب علاقوں جیسا حسن نہ تھا۔ وہ صحت کا حسن تھا، جوانی کا حسن تھا۔ وہ اسم بامسمّٰی تھی۔ جیتی جاگتی لاٹ تھی۔ شاید اسی لئے اس کا نام لاٹاں تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے پنجاب کے اس لوک گیت کے بول کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔

" سلفے دی لاٹ ورگی "

جب وہ جوان ہوئی تو ماجھے کے کئی مردوں نے پیغام بھیجے۔ یہاں تک کہ ماں باپ زچ ہو کر رہ گئے۔

لاٹاں نے سب رد کر دیئے۔
علاقے کے جوان خار کھا کر بیٹھے رہے۔

پھر جب لاٹاں نے دور کے علاقے کے ہیرا کو پسند کر لیا تو گاؤں والے غصے سے بھوت بن گئے اور ایک دن صبح نو بجے کے قریب جب وہ پانی بھرنے جا رہی تھی تو ایک چاہنے والے نے یہ کہہ کر کہ لاٹاں تو میری نہیں ہو گی تو ہیرا کی بھی نہیں ہو گی، اس کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔

لاٹاں نے اپنے کٹے ہوئے پیٹ کو ہاتھ میں پکڑا اور موگا کی طرف اٹھ بھاگی۔ اگر موگے پہنچ گئی تو ہیرا کو دیکھ لوں گی نہیں تو . . .
وہ صبح نو بجے سے بھاگتی رہی بھاگتی رہی۔
وہ شام پانچ بجے وہ موگا کے قصبے میں داخل ہو گئی۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے پر ایسا ہوتا ہے کہ منزل پر پہنچ کر ہمت جواب دے جاتی ہے۔ موگا کے بازار کی پہلی دکان کے سامنے پہنچ کر اس نے "ہیرا" کا نعرہ لگایا اور پھر بازار کے درمیان میں ڈھیر ہو گئی۔

جب لاٹاں کو ہسپتال میں لائے تو وہ پھر ہوش میں آ چکی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اگرچہ اس کے جسم سے سارا خون نکل چکا تھا۔ چہرہ ہلدی کی طرح تھا۔ پھر بھی اس کی آنکھیں لاٹاں مار رہی تھی۔ چہرہ یوں وقار سے بھرا ہوا تھا جیسے کسی شہزادی کا ہو۔

میز پر پڑے ہوئے وہ ڈاکٹر لالہ ہرچرن داس سے کہہ رہی تھی۔ دیکھ ڈاکدارا مجھے شیشی نہ سنگھانا۔ بیہوش نہ کرنا۔ جو میں بے ہوش ہو گئی تو پھر. ہیرے کو کیسے دیکھ سکوں گی۔ تو اسی طرح تروپے لگا دے۔ ڈر نہ ڈاکدارا حوصلہ کر۔ جلدی تروپے لگا۔ جلدی۔ میرے پاس مہلت نہیں۔ پر میں نے ہیرے سے ملنا ہے۔ وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ ایک بار میں اس کے مونڈھے پر سر رکھ دوں پھر جو ہونا ہے ہو جائے۔ لگا تروپے جلدی کر۔ اور لالہ جی اس کے روبرو یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے بچہ سر جھکائے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر آپریشن روم میں دونوں ڈاکٹر. کمپاؤنڈر. نرس اور میں کھڑے تھے۔ لالہ جی نے مجھے وہاں رکنے کی اجازت دے دی تھی۔ انہوں نے لاٹاں کی انتڑیاں سب باہر نکالی ہوئی تھیں اور وہ ادویات سے انہیں دھو رہے تھے۔ اور لاٹاں کھلی آنکھوں سے ٹر بٹر دیکھ رہی تھی۔

خون اور جسم کے اعضاء دیکھ کر میرا سرا چکرانے لگا طبیعت مالش کرنے لگی اور میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ جب ڈاکٹر امانت گھر آیا تو میں نے پوچھا. ”بولو لاٹاں کی بولو۔ “

امانت بولا ” آپریشن ہو گیا۔ “

”ٹھیک ٹھاک۔ “

” ہاں “ وہ بولا۔ ”لیکن ... “

”لیکن کیا؟ “

” مشکل ہے کہ وہ بچے۔ “

”کیوں “ میں غصے میں غرایا۔

” خون بہت نکل چکا ہے۔ صبح نو بجے سے شام تک۔ “

” اونہوں مشکل ہے۔ “

اس رات سونا ممکن نہ تھا۔ میرے لئے تو لیٹنا بھی مشکل تھا۔ ایک اضطراب تھا۔ ایک بے چینی۔ یوں جیسے لاٹاں میری ہو۔

پھر صبح سویرے ایک چنگھاڑ گونجی جیسے زخمی شیر دھاڑتا ہے۔ لاٹاں۔

یہ چنگھاڑ صرف ہسپتال میں ہی نہیں سارے موگا میں سنائی دی۔ میزوں پر پڑے ہوئے گلاس جل ترنگ کی طرح بجے۔ سب لوگ جاگ اٹھے۔

لاٹاں جا چکی تھی۔ اور ہیرا زخمی شیر کی طرح اس کے سرہانے دہاڑ رہا تھا۔

جگنو

ہائیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے میں چونکا۔ یہ کیا باہر گھپ اندھیرے میں لاٹاں روشن تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ روشن لاٹاں جس تیزی سے سامنے آئی تھیں۔ اسی تیزی سے غائب ہو گئیں۔

یہ کیا شے تھی جو گھور اندھیرے میں لاٹاں کی طرح روشن تھی۔ کیا یہ سٹیشن کی روشنی تھی۔ اونہوں۔ چھوٹے سٹیشن تو تمام گل پڑے تھے۔ کیا یہ جگنو تھے۔

دفعتاً پھر لاٹاں چمکیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ لاٹاں بہت تیز تھیں اور سامنے دور سٹیشن کے مقام پر ہٹ کر تھیں۔

تیسری بار جب وہ سامنے آئیں تو گرد و پیش کچھ کچھ نظر آئے۔ وہ گاؤں یا ڈیروں کے کچے گھروندے تھے جن کی چھتوں پر بجلی کی بتیاں لگی ہوئی تھیں۔

خوب بہت خوب۔ میں نے سوچا۔ ہند نے گاؤں گاؤں بجلی پہنچا رکھی ہے۔ اور سکھوں نے سیکورٹی کے لئے چھتوں پر بڑی بڑی بتیاں لگا رکھی ہیں۔

اب ہم دوابے کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ جب میں مدرسے میں پڑھا کرتا تھا تو جغرافیہ کی کتاب میں دوابوں کا ذکر آتا تھا۔ دوابہ وہ علاقہ ہوتا ہے جو دو دریاؤں سے گھرا ہوا ہو۔ یہ دوابہ، دوابہ بست جالندھر کے نام سے مشہور تھا جو بیاس اور ستلج کے درمیان کے علاقے میں واقع تھا۔

دوابہ

مجھے دوابے والوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان میں ایک مٹھاس تھی ایک رواداری تھی۔ ان کے لباس بڑے سادہ ہوتے۔ انداز میں تفاخر نہ ہوتا۔ ان کی میں اخروٹ کے چھلکے کی طرح سخت نہ تھی بلکہ آلو کے چھلکے جیسی نرم نرم تھی۔ ان میں ٹیں نہ تھی، نمائش نہ تھی دکھاوا نہ تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں جالندھر دیکھوں اور کچھ نہیں تو ریل کا سٹیشن ہی سہی۔ مجھے جالندھر کا گڑ بہت پسند تھا۔ اور پھر وہاں کے لوگ۔ ان کی بولی میں روپئے میں اسی گڑ

کی چاشنی تھی۔

جالندھر وابے کا دل تھا۔ وہی سادگی، وہی بے تکلفی، وہی خلوص، وہی قربت۔ پتہ نہیں یہ علاقے کے پانی کا اثر تھا یا ہوا کا۔

پھر پھلور تھا۔ پھلور کے سٹیشن کو میں بڑے اہتمام سے دیکھا کرتا تھا صرف اس لئے کہ اس پر چھت پڑی ہوئی تھی۔ جب گاڑی سٹیشن میں داخل ہوتی تو یوں لگتا جیسے کسی لمبے چوڑے بند ہال میں داخل ہو گئے ہوں۔

جب گاڑی پھلور سے چلتی تو میں کھڑکی سے لٹک لٹک کر دیکھا کرتا کہ کب پھلور کا قلعہ آئے۔ قلعے میں ان دنوں تھانے داروں کی تربیت ہوا کرتی تھی۔ تھانے دار میرے لئے ان دنوں بھی بہت بڑا عہدہ ہوتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر سے بھی بڑا۔ ایک اونچا لمبا مرد۔ بارعب چہرا۔ گھورتی پیشانی شک سے بھری ہوئی آنکھیں اور مروڑی ہوئی مونچھیں۔ مجھے تھانے دار سے ڈر آتا تھا۔ ساتھ ہی وہ میرے لئے بڑا جاذب توجہ عہدہ دار تھا۔ تھانے دار سے ڈر تو مجھے اب بھی آتا ہے لیکن اب وہ جاذب توجہ نہیں رہا۔ اب مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ ڈر اور ترس۔

میرا جی چاہتا تھا میں جالندھر دیکھوں۔ وہاں کا گڑ کھاؤں۔ وہاں کی شدھ بولی سنوں۔ جالندھریوں سے بات کروں۔ ان کے پاس بیٹھوں۔

لاہور کے نور بابا کہا کرتے تھے پتر مٹی تو ایک ہی ہوتی ہے، پھر بھی مٹی مٹی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جالندھر کی مٹی میں اتنی مٹھاس تھی جیسے شکر میں ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ مٹھاس سے چپ چپ کرتے تھے۔ وہاں کی سبزیوں میں تلخی نہیں ہوتی تھی۔ شلغم اتنے میٹھے تھے کہ گورا فوج انہیں دیسی سیب سمجھ کر کھایا کرتے تھے۔ لاہور میں ہنڈیا میں چٹکی بھر مرچ ڈالو تو کھاتے ہوئے سی سی کرو۔ جالندھر میں ہنڈیا میں دو چٹکی مرچ ڈالو تو بھی سالن میٹھا ہی رہتا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا میں پھلور کا سٹیشن دیکھوں کیا۔ اب بھی اس پر وہی چھت قائم ہے۔ کیا اب بھی ایسا لگتا ہے جیسے گاڑی سٹیشن کی جگہ ہال کمرے میں داخل ہو گئی ہو۔ کیا پھلور کا قلعہ اب بھی موجود ہے۔ کیا اس میں اب بھی تھانے دار رہتے ہیں جن کی مونچھیں اسی طرح مروڑی ہوئی ہیں۔

ایک دن میں نے نور بابا سے پوچھا "باباجی تقسیم سے پہلے آپ دوابے میں رہتے تھے کیا۔ "

"ہاں پتر۔ " وہ بولے۔

"تقسیم کے بعد لاہور آئے تھے کیا۔ "

"ہاں پتر۔ " وہ بولے۔

"کیا گاڑی میں آئے تھے۔ "

"پیدل۔ اکیلے۔ "

"نہیں پتر بہت بڑا جتھا تھا۔ ساتھ ہمارے مرید تھے۔ "

"کتنی دیر میں پہنچے۔ "

"مہینہ سے زیادہ ہی لگ گیا تھا۔ "

"سڑک پر رکاوٹیں ہوں گی نا۔ "

"نہیں پتر کھیتوں جھاڑیوں اور رکھوں سے آئے تھے۔ "

"وہ کیسے باباجی۔ "

"پتر ساری رات چلتے تھے۔ سارا دن چھپے رہتے تھے۔ روز ہم پر حملے ہوتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ہم شہیدوں کو دفناتے نماز شہدا ادا کرتے پھر چل پڑتے۔ "

"ایک مہینہ حملے ہوتے رہے باباجی۔ "

"ہاں پتر۔ "

"کتنے شہید ہوئے باباجی۔ "

"جب چلے تو ہزار کے قریب تھے۔ جب پہنچے تو سو سے کم تھے۔ "

یہ تھے دوابہ کے لوگ خود مر گئے۔ اپنے مرشد کو پاکستان پہنچا گئے۔

دودھیا جوڑا

لودھیانے اور انبالے میں میں نے زندگی کے کئی ایک سال گزارے تھے۔

انبالے میں میں جوانی کی اولیں بیداری سے شناسا ہوا تھا۔ کیا اب بھی وہاں پنکھے کا میلہ ہوتا ہے۔ پنکھے کا وہ میلہ جس نے پہلی مرتبہ میرے بے نام، بے منزل جذبات کو ہوا

دی تھی۔ مجھ میں ایک ان جانی بے چینی پیدا کی تھی۔ پھر اس آوارہ بے چینی کو ایک رخ مل گیا تھا۔ ایک مدعا ایک منزل۔

یہ مدعا دو گورے چٹے پاؤں تھے جو یوں تہہ کئے پڑے رہتے تھے جیسے جوتوں کی دوکان میں شوکیس میں پڑا ہوا ہو۔ پاؤں کا یہ جوڑا ہمارے چوبارے کے مقابل کے گھر کی چھت پر دھوپ میں پڑا رہتا تھا۔ میں کالج سے واپسی پر سیدھا کوٹھے پر پہنچتا کہ اس دودھیا جوڑے کو دیکھوں۔

کئی ایک ہفتے میں اس دودھیا جوڑے کو دیکھتا رہا. دیکھتا رہا۔ اس جوڑے کی مالکہ مجھے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ میں اس دودھیا جوڑے میں جو بڑی نفاست سے تہہ کیا دھرا رہتا تھا اس قدر کھو گیا کہ مجھے مالکہ کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ ان دنوں انبالہ چھاؤنی میں میں پیس میموریل کالج میں پڑھتا تھا۔ کیا اب بھی بی ڈی پی ام کالج اسی اصطبل میں واقع ہے. جس میں وہ ان دنوں چل رہا تھا۔ کیا اب بھی شہر کے لڑکے صبح سویرے کالج میں پڑھنے کے لئے چھاؤنی جاتے ہیں۔ کیا اسی طرح سائیکلوں کا ایک جلوس نکلتا ہے جیسا ان دنوں نکلا کرتا تھا۔

اسی انبالے میں میں نے پہلی مرتبہ اپنی ٹین ایج محبوبہ کو بے بی شو میں دیکھا تھا۔ گورا چٹا مسکراتا چہرا۔ متکلم آنکھیں اور گھنگھر والے بال۔ صوفی کی بہن تانی۔

یوں میری ٹین ایج لو۔ پاؤں کے جوڑے سے چل کر چہرے تک آ پہنچی تھی۔ اور میں نے اسے اپنے سینے پر لٹکا لیا تھا۔ اور پھر امرتسر میں جا کر اس کی تلاش میں سرگرداں پھرتا رہا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ انبالے شہر کے سٹیشن کو جی بھر کر دیکھوں۔

گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ باہر نہ جالندھر تھا نہ پھلور تھا نہ انبالہ تھا۔ صرف گھپ اندھیرا ـــــ گاڑھا اندھیرا۔

سٹیشن آتے تو تھے لیکن آتے ہی چل پڑتے۔ گاڑی رکتے ہی پھر چل پڑتی اور ہماری بوگی کا جغرافیہ کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ لازماً سٹیشن کے ویران حصے پر رکتی۔ ایسی جگہ جہاں سٹیشن کے نام کا کوئی بورڈ نہ لگا ہوتا۔ مشکل یہ تھی کہ میں کھڑکی سے سر نکال کر باہر لٹک کر سٹیشن کو اچھی طرح دیکھ بھی تو نہ سکتا تھا۔ کھڑکی پر لوہے کی سیخیں جو لگی تھیں۔

کئی بار میرا جی چاہا کہ بھاگ کر دروازہ کھولوں اور پلیٹ فارم پر اتر جاؤں۔ مصیبت یہ تھی کہ بوگی کا دروازہ بہت دور تھا اور دروازے پر ہندی سپاہی وردی پہنے بندوق ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔

اندر کوپے میں چار زائر سر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے شاید باتوں میں محو تھے یا تاش کی بازی ہو رہی تھی۔

نیند میں چھچھڑا

دوسرے کوپے میں لیڈر صاحبان پڑے تھے۔ سردار لیڈر جن کے چہرے پر وجاہت کی مہر لگی ہوئی تھی پیشانی پر وقار کی جھریاں تھیں۔ داڑھی شخصیت کو نورانی جھال بخش رہی تھی، سلیپر پر چاقو بنے ہوئے پڑے تھے۔ گویا ان کی شخصیت سے ساری مائع اتر چکی تھی۔ استری ٹوٹ چکی تھی ان کی "میں" کی ریوڑی سے کڑا کا ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی پلاسٹک کے گڈے کا اندر کا تاگا ٹوٹ گیا ہو اور اعضا بکھرے پڑے ہوں۔

پتہ نہیں کس بزرگ نے کہا تھا نماز بھی کیا چیز ہے جو بڑے چھوٹے اونچے نیچے سب کو عام دربار میں لا کھڑا کرتی ہے۔

نیند بھی کیا چیز ہے جو شخصیت کے امتیازات کی پھونک نکال کر اسے چھچھڑا بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس وقت سردار لیڈر کے چہرے کی وجاہت ختم ہو چکی تھی۔ پیشانی پر وقار کی جھریاں صاف ہو چکی تھیں۔ اور وہ یوں پڑے تھے جیسے پوٹیٹو چپس سے چپس غائب ہو گیا ہو اور صرف پٹیٹو ہی پٹیٹو باقی رہ گیا ہو۔

اس وقت ان سے لیڈری کی مائع اتری ہوئی تھی۔ عالم دین کی کلغی گری ہوئی تھی۔ صراط مستقیم دکھانے کے زعم کا روغن اترا ہوا تھا۔ سب فیتے کناریاں اتر گئے تھے۔ باقی انسان رہ گیا تھا۔ بے بس. بے کس انسان۔

پہلی مرتبہ میں نے اپنے دل میں ان کے لئے ہمدردی کی ایک رو محسوس کی۔ اس سے پہلے جب بھی میں انہیں دیکھتا تھا مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا۔ میں نے کبھی محسوس نہ کیا تا کہ مرعوبیت کی اس شوگر کوٹنگ کے

نیچے ایک عاجز، مسکین، قابل ترس انسان پڑا ہے۔

اس سے اگلے کوپے میں ہندی پولیس تھی۔ ایک سپاہی ہاتھ میں بندوق تھامے سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ کوپے کے اندر دو ایک افسر سادہ کپڑوں میں سیٹوں پر چاقو بنے ہوئے پڑے تھے۔ نیند میں افسری کی چمک دمک ماند پڑی تھی ٹیں غروب ہو چکی تھی۔ نیچے سے عاجز بے بس انسان نکل آیا تھا۔

ہندی پولیس کا بھی وہی حال تھا۔ اہل کار سو رہے تھے۔ سپاہی اونگھ رہا تھا۔

بے نام سٹیشن

دفعتاً گاڑی رک گئی۔ میرا دل اچھل کر گلے میں آ اٹکا۔ سٹیشن آیا ہے میں نے سوچا۔ پتہ نہیں کون سا سٹیشن ہے۔ چلو اندھیرے میں علاقہ نہیں دیکھ سکتا تو سٹیشن ہی دیکھ لوں۔ پلیٹ فارم ہی سہی۔ شاید پھلور ہے۔ ہئے یہ کمبخت سیخیں جو کھڑکی پر لگی ہوئی ہیں، نہ ہوتیں تو کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھتا۔ سٹیشن کے بورڈ یا لالٹینوں پر کہیں نا کہیں سٹیشن کا نام تو لکھا ہو گا۔

لالٹینیں تو ختم ہو گئیں۔ وہ تو جب کی بات بجلی کا دور نہیں آیا تھا۔ جب ہر سٹیشن پر ایک لمپ روم ہوا کرتا تھا۔ سر شام ہی ایک قلی لمپوں کو صاف کرتا۔ سٹیشن کی لالٹینوں کے دیئے باہر نکالتا۔ ان میں تیل بھرتا، بتیاں کترتا۔ باہر کے شیشوں کو کپڑے سے صاف کرتا۔ اس زمانے میں باہر کے شیشوں پر سٹیشن کا نام لکھا ہوتا تھا۔ جب اندر روشنی ہوتی تو سٹیشن کا نام بڑی وضاحت سے نظر آتا تھا۔ سٹیشن کا نام جاننا ہوتا تو کسی بتی کو دیکھ لیتے۔ اب وہ بات نہ تھی۔ بتیاں تو تھیں لیکن لالٹینیں نہ تھیں۔ باہر کے شیشے نہ تھے۔ نام نہ تھے۔

نام کے تختے تو صرف دو ہوتے ہیں ایک سٹیشن کے شروع ہونے پر زمین میں گڑا ہوتا ہے دوسرا ختم ہونے پر۔ نام کیسے دیکھوں۔ میں مایوس ہو گیا۔

پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ سٹیشن کے مین گیٹ پر بھی تو نام لکھا ہوتا ہے۔ مین گیٹ پیچھے رہ گیا تھا چونکہ ہماری بوگیاں فرنٹیر میل کے آگے لگی ہوئی تھیں

قلی بھی سٹیشن کا نام نہیں پکار رہے تھے۔ پرانے زمانے میں قلیوں کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ رات کے وقت جب گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوتی تو وہ بلند آواز میں سٹیشن کا نام

پکارتے تاکہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو پتہ چل جائے کہ کونسا سٹیشن آیا ہے۔ اور منزل کتنی دور ہے۔

گاڑی چل پڑی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چلو سٹیشن پر پتہ نہیں چلا تو نہ سہی سٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے تو نام کا بورڈ آئے گا اور پتہ چلے گا کہ کون سا سٹیشن تھا۔ جالندھر تھا کہ پھلور تھا کہ لودھیانہ تھا۔

بورڈ بورڈ ــــ میں بورڈ کی تاک میں بیٹھا تھا ــــ ارے یہ کیا بورڈ پر پتہ نہیں کیا چیچو کی ملیاں بنائی ہوئی تھیں۔ نام نہیں تھا نہ انگریزی میں نہ اردو میں ــــ اوفوہ۔ یہ ہندی ہوگی ــــ مہاراج یہ کیا غضب کیا کہ اردو کو بالکل ہی تیاگ دیا۔ اگر بورڈ کے کسی کونے میں اردو میں سٹیشن کا نام لکھ دیتے تو مجھے پتہ چل جاتا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی۔ پرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ سوکھے ہوئے پھول پھر سے تازہ ہو جاتے آپ کا کیا بگڑ جاتا مہاراج۔

کس کی اردو

مہاراج یہ کیا کیا آپ نے کہ اردو کا "بی" مار کر رکھ دیا۔ آپ نے سمجھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے لہٰذا اس کا نام نشان نہ رہے۔

نہ مہاراج اردو مسلمانوں کی زبان تو نہ تھی۔ مسلمانوں کی ہوتی تو سندھ کی زبان ہوتی، ملتان کی زبان ہوتی۔

مسلمانوں کی زبان تو فارسی تھی مہاراج۔ جو مغلوں کے دور میں بھی رائج تھی۔

اردو کو تو اس لئے رائج کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا فارس سے جو تمدنی بندھن تھا اسے کاٹ دیا جائے۔ تاکہ وہ ہند کو اپنا دیش سمجھیں اور بدیشی رنگ کو تیاگ دیں۔

ظاہر ہے کہ رابطہ کاٹنے کا کام سرانجام دینے میں مسلمانوں کا فائدہ تو نہ تھا۔ ہندیوں کا فائدہ تھا یا مغربی حکمرانوں کا فائدہ ہو سکتا تھا۔ پھر مسلمان اردو کو کیسے رائج کر سکتے تھے۔

مہاراج آپ تو بڑے سمجھدار ہیں۔ سوچ سمجھ ہندو قوم کی عظمت کا ایک نشان ہے۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ چلئے مانے لیتا ہوں کہ اردو مسلمانوں

کی زبان ہے لیکن یہ بھی تو سوچئے کیا زبان کاٹنے سے مسلمان کٹ جائے گا __ اتنا غصہ بھی تو اچھا نہیں مہاراج۔ آپ کی قوم میں صبر ہے. تحمل ہے. برداشت ہے۔ لیکن مسلمان کا نام آتے ہی یہ سب اوصاف کیوں معدوم ہو جاتے ہیں۔

گاڑی زناٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

سٹیشنوں کی طرح باہر بھی گھپ اندھیرا تھا۔ شہروں کے نام پر تعصب کا پردہ پڑا تھا جو میری یادوں کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا کہ ان شہروں کو پہچان نہ سکا جن کی خوشبو سونگھنے کے لئے میں بے قرار تھا۔

امید ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ امید بے قراری کو جگائے رکھتی ہے۔ کروٹیں بدلنے کی صورت قائم رکھتی ہے۔ امید بڑی ظالم ہے ناامیدی کتنی ہمدرد ہے یوں جیسے لوری ہو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔

آہستہ آہستہ دیہات کے گھروں کو چھتوں پر جلتی ہوئی بتیاں دھندلانے لگیں۔ دھندلاتی گئیں اور پھر نیند کا سیاہ بادل چھا گیا۔

سلمز :

جب میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ کوپے کے زائرین سب بستر لپیٹ رہے ہیں۔ سامان اکٹھا کر رہے ہیں۔

دوسرے کوپے میں لیڈر صاحب بیٹھے آنکھیں مل رہے تھے۔ وہ اپنی بکھری ہوئی شخصیت کو اکٹھا کر رہے تھے۔ واڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے تاکہ وہ اپنی فارم میں آ جائیں۔ پیشانی سہلا رہے تھے کہ وقار کے سلوٹ پھر سے پڑ جائیں اور وہ ویسے ہی معزز دکھنے لگیں۔

آخری کوپے میں بھارتی پولیس افسر اور سیکورٹی والے پٹیاں باندھ رہے تھے۔ پہرے دار سپاہی اونگھ اونگھ کر اب چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ لیکن اس کی پگڑی پر نیند اور اونگھ کے آثار ابھی تک موجود تھے۔ گاڑی کے باہر ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں دلی کے سلمز صاف نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھروندے۔ چھتوں پر بچھی ہوئی چارپائیاں۔ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے، کھانستے ہوئے بوڑھے، انگڑائیاں لیتی ہوئی نوجوان

لڑکیاں اور مکانات سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں رفع حاجت کے لئے بیٹھے ہوئے لوگ۔

یہ مناظر ریل کی لائنوں پر اور ایئرپورٹوں کے گرد و نواح میں ہر بڑے شہر سے پہلے نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ دلی ہو کراچی ہو یا لاہور ہو۔ یوں سیاحوں کو پہلے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ عوام کا رہن سہن کیسا ہے لیکن ہم ہیں کہ اس تفصیل کو بالکل بھولے رہتے ہیں۔ باہر سے آنے والے ڈگنیٹیریز کا بڑے اہتمام سے استقبال کرتے ہیں۔ انہیں ترقی یافتہ علاقوں میں لئے پھرتے ہیں۔ عالی شان ہوٹلوں میں ٹھہراتے ہیں۔ ان کو شہر کے عوامی علاقوں سے دور رکھتے ہیں تاکہ وہ عوامی رہن سہن سے واقف نہ ہوں۔

ہم یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ ریلوے سٹیشن یا ایئرپورٹ پر پہنچنے سے پہلے وہ ہمارے سلمز کا نظارہ کر چکے ہیں۔

پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا جب ہم بیرونی وزیٹرز کو فخر سے اپنا عوامی رہن سہن دکھانے کا اہتمام کریں گے اور اپنے تمدن پر شرمساری محسوس نہ کریں گے۔

گاڑی جمنا کے پل پر پہنچ چکی تھی۔

تمام زائر اپنا اپنا سامان اٹھائے کھڑے تھے۔ لیڈر صاحب کی شخصیت پورے طور پر بحال ہو چکی تھی۔ بھارتی پولیس مونچھ پ تاؤ دے رہی تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس سیکوریٹی کا ایک نائب چوری چوری چپکے چپکے ہماری گنتی میں مصروف تھا۔

گاڑی دلی کے پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی۔

* * *

دِلّی

جب ہم دلی کے پلیٹ فارم پر اتر رہے تھے تو ہماری بوگیوں کے سامنے سات آٹھ افراد کا ایک گروپ کھڑا تھا بظاہر وہ لوگ یوں کھڑے تھے جیسے ہم سے لاتعلق ہوں۔ لیکن جتنا لاتعلق ہونے کی کوشش کرتے اتنا ہی تعلق واضح ہو جاتا۔ ان میں سے ایک آدمی ہماری گنتی کر رہا تھا۔

بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بار بار گنتی کا مطلب کیا تھا۔ کیا ہم میں سے کسی کے کھو جانے کا ڈر تھا یا یہ خوف دامن گیر تھا کہ ہم میں سے کوئی جُل دے کر بھاگ نہ جائے۔

خوف کی دیوار

ایک بات واضح تھی کہ کوئی خوف یا خطرہ ضرور حائل تھا۔ یا تو وہ ہمارے لئے خوف زدہ تھے اور یا ہم سے خوف زدہ تھے۔

ہند اور پاکستان کے درمیان خوف کی ایک دیوار کھڑی ہے۔۔ کیوں ۔۔ پتہ نہیں کیوں۔

پاکستان کو اچھی طرح علم ہے کہ ہند ایک بہت بڑی طاقت ہے جو اگرچہ بڑی طاقتوں میں شمار نہیں ہوتی پھر بھی بڑی طاقت ہے اور دنیا کی تیسری بڑی طاقت بننے کے لئے بے چین ہے۔

اگر پاکستان ہند سے خوف زدہ رہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ مسلمان حقیقت پسند قوم نہیں ہیں۔ ناامیدی کے گھپ اندھیرے میں بھی مسلمان امید کا ایک چھوٹا سا دیا جلائے رکھنے کا شوقین ہے۔ اسی وجہ سے وہ خطرے کی بو سونگھنے کا عادی نہیں۔ خطرے کی بو آئے بھی تو وہ ناک سکوڑ لیتا ہے۔

مسلمان ازلی طور پر بے پرواہ ہے، بے نیاز ہے SO WHAT ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ پھر بھی نہیں سمجھتا۔ جانتا ہے پھر بھی نہیں مانتا۔ مسلمان کی سرشت میں WANTING TO BELIEVE کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

اگر مسلمان ایسا نہ ہوتا جیسا کہ وہ ہے تو تقسیم کے المیہ کو کبھی نہ بھولتا۔ انتقام کی چنگاری کو سینے سے لگائے رکھتا اور یہودی کی طرح موقعے کا منتظر رہتا۔ لیکن وہ تقسیم کے واقعہ کو بھول چکا ہے۔ صرف بھولا ہی نہیں بخش چکا ہے۔ ہٹاؤ چھوڑو۔ دفع کرو۔

مجھے یاد ہے جب تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ سکھ یاترا کرنے پاکستان میں آئے تھے تو مسلمانوں کا جی چاہتا تھا کہ انہیں گلے سے لگائیں۔ گھر لے جا کر حلوہ پوری کھلائیں، پنکھا کریں۔ حال احوال پوچھیں۔

اس معاملے میں سکھ بھی مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ بھی جذباتی ہے۔ جذبہ اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ سکھ مسلمان کی طرح سوچتا نہیں۔ دو اور دو چار نہیں گنتا۔

جب سکھ پہلی مرتبہ یاترا کرنے آیا تھا تو پاکستان میں یوں گھومتا پھرتا تھا جیسے اپنے دیس کی گلیوں میں ٹہل لگا رہا ہو۔ سکھ مسلمان سے خائف نہیں۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیسی جو ہند اور پاکستان کے درمیان کھڑی ہے۔

رہا ہند۔ تو ہندو ایک حقیقت پسند قوم ہے۔ ہندو کو علم ہے کہ وہ ایک طاقتور قوم ہے اور اسے پاکستان سے کوئی خطرہ نہیں۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیوں۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں ہر چند ماہ کے بعد ہند کے اخبارات جلی حروف میں سرخیاں چھاپ دیتے ہیں کہ پاکستان ہند پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہند کے اخبار نویس احمق نہیں سمجھ دار ہیں۔ ہم سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ پھر وہ ایسی سرخیاں کیوں چھاپتے ہیں۔ مہاراج کیا بات آپ کی سمجھ میں آتی ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ڈر خوف جوتشیوں اور نجومیوں کا پھیلایا ہوا ہو۔ یہ تو

حقیقت ہے کہ ہند میں جوتشیوں اور نجومیوں کا زور رہا ہے لیکن آج کل ہندو نسل میں تو وہ ضعیف الاعتقادی نہیں جو پرانی نسل میں ہوتی تھی آج کی نسل تو روشن خیال ہے۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیوں۔

اس اثناء میں ہم پلیٹ فارم سے نکل کر سٹیشن سے باہر پہنچ چکے تھے۔ باہر آتے جاتے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہم سب ایک جتھے کی صورت میں کھڑے تھے۔ ادھر ہند سیکوریٹی کے اہل کار تھے۔ ادھر وردی میں ملبوس پولیس تھی۔ ہمارے سینوں پر بلے لگے ہوئے تھے جن پر پاکستانی زائر لکھا ہوا تھا۔ آنے جانے والوں کو پتہ تھا کہ ہم پاکستانی زائروں کا جتھہ ہیں۔ اس کے باوجود کوئی راہ گیر ہمیں لاگ یا لگاؤ کی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ کسی کی پیشانی پر بل نہیں تھے۔ کسی کے انداز میں نفرت یا خوف نہ تھا۔ وہ ہمیں کوئی عجوبہ بھی نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ یوں دیکھ رہے تھے جیسے اپنوں کو دیکھتے ہیں۔ کئی ایک کے دلوں کا جذبہ چہرے پر ابھر آیا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ پاس آئیں۔ حال پوچھیں۔ اور کہیں "کوئی سیوا مہاراج"۔

نہیں یہ جذبہ دکھاوے کا نہ تھا۔ یہ رام رام منہ میں نہ تھا بلکہ دل سے ابھر رہا تھا۔ ہند کے عوام میں تو کوئی خطرے کا احساس نہیں۔ خوف کا شائبہ نہیں۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

جب زائرین کی بسیں چلنے والی تھیں اس وقت بھی ہماری گنتی ہو رہی تھی۔ اتنی بار ہماری گنتی ہو چکی تھی کہ زائرین نے اس کا نوٹس لینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ گنو پھر گنو۔ گنتے رہو۔

زائرین کی بسیں چل پڑیں۔ آگے آگے سیکوریٹی وین تھی شاید پیچھے بھی ہو۔ دونوں بسوں کے اندر بھی سیکوریٹی کے آدمی موجود تھے۔

اصلی لڑکی

ہاں تو یہ وہ دلی ہے۔ میں نے سوچا وہ دلی۔ مجھے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے۔ پہلی مرتبہ جب ہم دلی گئے تھے تو میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میرے والد روہتک میں متعین تھے۔ دلی میں ماموں رہتے تھے۔ ماموں نے بلایا تھا۔ اتنا بڑا شہر دیکھ کر میں گھبرا

گیا تھا۔ چوڑی چوڑی سڑکیں۔ بڑی بڑی عمارتیں۔ کھچا کھچ بھرے بازار۔

پھر ماموں نے ہمیں دلی کی جگہیں دیکھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ سارا دن ہم جگہیں دیکھتے رہے۔ قطب کی لاٹ۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار۔ جنتر منتر۔ دھوپ گھڑی۔ شاہی مسجد۔ لال قلعہ۔

ان جگہوں کو دیکھ کر میں ولی شہر کی عظمت کو بھول گیا۔ وہ سڑکیں. بازار. ہجوم. دکانیں سب میرے ذہن میں مدھم پڑ گئے۔ زندگی میں پہلی بار میری نگاہوں میں مغلوں کی عظمت ابھری۔ ابھرتی چلی گئی۔ ہند کے مسلمان بادشاہ جو میرے لئے صرف تاریخ کی کتابوں میں جیتے تھے. کتابوں سے باہر نکل آئے اور ساری دلی پر چھا گئے۔ یا اللہ یہ کیا انسان تھے یا جن جو دِلّی کے گرد و نواح میں اپنے نقش چھوڑ گئے۔

شام کے وقت ماموں کا بڑا بیٹا بشارت علی مجھے انگلی لگا کر باہر لے گیا بولا آؤ تمہیں دلی دکھاؤں۔

دلی تو میں نے دیکھ لی۔ واہ کیا مینار ہیں، مقبرے ہیں، قلعے ہیں مسجدیں ہیں۔

وہ ہنسا۔ بولا "احمق دلی مزار اور مقبرے نہیں ہیں۔ دلی تو ایک جیتی جاگتی شے ہے۔"

ماموں مبارک علی صراط مستقیم آدی تھے۔ ان کے صرف تین کام تھے۔ ڈاک خانے میں نوکری کرتے تھے۔ گھر میں نمازیں پڑھتے اور مسلسل اپنی بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ سنتے اور اسے پی جانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ شاید اسی وجہ سے ان کی صورت نورانی ہو گئی تھی جو گھر میں چراغ کی طرح ٹمٹماتی رہتی۔ اس چراغ کے نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں بشارت جوان ہوا تھا اور اس کی جوانی میں مستی کا رنگ ابھرا تھا۔

بشارت گورا چٹا تھا۔ ذہن میں رنگ پچکاری چلتی تھی۔ آنکھوں سے پھوار اڑتی تھی۔

بشارت مجھے سیٹھوں کے تھیٹر میں لے گیا۔

اس زمانے میں ہند میں تھیٹر اپنے معراج پر تھا۔ تھیٹر کی دنیا پر آغا حشر کی حکومت تھی۔ چست مکالمے۔ چلنت دھنیں۔ حسین سہیلیوں کے جھرمٹ میں پٹاخے کی ٹھاہ پر چشم زدن میں بدلنے والے سین پکے راگ میں رچے ہوئے حمد۔

ساری دلی تھیٹر پر ہزار جان سے قربان تھی۔

سقہ سارا دن مشکیں بھر بھر کر تھک جاتا تاکہ رات کو تھیٹر کا ٹکٹ خرید سکے۔ مزدور تھیٹر کا ٹکٹ خریدنے کے لئے محنت مزدوری حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتے۔ دلی کے بانکے سارا دن کہیں سے رقم ہتھیانے کی فکر میں لگے رہتے کہ تھیٹر کا ناغہ نہ ہو جائے۔

تھیٹر دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ مغلوں کی ساری عظمت ذہن سے نکل گئی۔ کھیل کی ہیروئن پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔

ہیروئن کی پہلی انٹری پر بشارت نے مجھے کہنی ماری۔ اس لڑکی کو دیکھنا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر تو پہلے ہی میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ مزید دیکھنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ بشارت کی بات کتنی مہمل تھی جیسے اس لڑکی کو نہ دیکھنا اپنے بس کی بات ہو۔ وہ ایسی نہ تھی جسے لوگ دیکھتے ہیں وہ تو ایسی تھی جو دکھتی تھی۔ خود بخود دکھتی تھی کچھ اور دیکھنے نہ دیتی تھی۔ صرف آنکھوں سے نہیں جسم کا رواں رواں اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔

تھیٹر ختم ہوا تو بشارت بولا۔ “وہ لڑکی تم نے دیکھی تھی نا۔”

“ہاں” ــ میں نے کہا۔ وہ سب لڑکیوں سے ہٹ کر تھی۔”

وہ ہنسا۔ بولا۔ “اس تھیٹر میں تو ایک ہی لڑکی اصلی ہے۔”

“اور باقی جو اتنی ساری تھیں” میں نے پوچھا۔

“وہ سب نقلی ہیں۔”

“نقلی” مجھے بات سمجھ میں نہ آئی۔

“باقی سب لڑکے ہیں” وہ ہنسا۔ “لڑکی کا روپ دھارا ہوا ہے۔”

اس زمانے میں تھیٹر میں کوئی لڑکی کام کرنے پر تیار نہ ہوتی۔ ان دنوں زنانہ ڈبہ الگ ہوتا تھا۔ بڑی شدت سے الگ ہوتا تھا۔ عورت یا تو گٹھڑی کی صورت میں بندھی ہوتی یا لمبے چوڑے پردوں میں ملفوف ہوتی۔ یا یکے بگھی میں خیمے کی طرح چھپی چھپی ہوتی۔

بشارت نے مجھے پھر کہنی ماری۔ بولا۔ “یہ لڑکی پارسی لڑکی ہے۔”

“وہ کیا ہوتی ہے پارسی لڑکی۔” میں نے پوچھا۔

“وہ جو بہت حسین ہوتی ہے۔ بہت طرح دار ہوتی ہے جس کے بال اوپر سے لے

کر پاؤں تک لمبے ہوتے ہیں۔ "

" ہاں ہاں ـــــ اس کے بال بہت لمبے تھے " میں نے کہا۔

" ایک بات بتاؤں تمہیں " وہ بولا۔

" بتاؤ۔ "

" یہ پارسی لڑکی مجھ پر عاشق ہے۔ "

میں نے حیرت سے بشارت کی طرف دیکھا۔ میری نگاہ میں اس کی عظمت بڑھ گئی بڑھتی گئی بڑھتی گئی۔ اس کی شخصیت ابھری۔ ابھرتی گئی۔ ابھرتی گئی۔ اس کا قد اونچا اور اونچا ہوتا گیا ـــ حتیٰ کہ اس کے شانے جامع مسجد کے میناروں کو چھونے لگے اور ساری دلی مغلیہ جگہوں سمیت سمٹ کر بشارت کے قدموں کی خاک بن کر رہ گئی۔

کیسورے بیدردی

پھر مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں آخری مرتبہ دلی گیا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ ن م راشد آ کھڑا ہوا بائیں ہاتھ سعادت حسن منٹو۔ دونوں کے ہاتھوں میں گلاس تھے۔ دونوں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

ان ونوں ن م راشد اور منٹو دونوں ہی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔

میں راشد کے بلاوے پر دلی گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک انوکھے موضوع پر ٹاک دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ عنوان تھا ٹھمریوں میں شاعری۔ میں نے بہت سی ٹھمریوں کے بول تلاش کئے تھے۔ شاعری کا تو خیر مجھے پتہ نہ تھا۔ البتہ ان ٹھمریوں میں کوک شاستر اور کام شاستر سے بھی بڑی بڑی جنسی سچائیاں گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھیں۔ مجھے علم نہ تھا کہ جس وقت میں ریڈیو پر تقریر کر رہا تھا، چاوڑی کی بڑی بڑی طوائفیں ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی تھیں۔

اتفاق سے جس دوست کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اس کا چاؤڑی بازار میں آنا جانا تھا۔ اسی رات وہ مجھے باری باری کئی ایک چوباروں پر لے گیا۔ جونہی وہ میرا تعارف کراتا بائی جی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی اور پوز بنا کر گنگناتی۔ پہلی بولی:

"گانٹھری میں کون جتن کر کھولوں"۔

دوسری بولی
"اوگھٹ گھاٹ جلی جمنا کو"
"سرپر گاگر بھاری"
تیسری بولی
"آئے مورے بھور بہلوا"
چوتھی نے کہا
"باٹ چلت موری بنگری مرور ڈاری رے
کیسورے بیدردی بنواری

"ہے" وہ بولیں۔ "خالی بول سنوا دیئے جو ہمیں بلوا بھیجتے تو بولوں میں جان پڑ جاتی۔

اگلی شام میں راشد کے ہاں مدعو تھا۔ منٹو آ گیا۔ دونوں پیتے رہے۔ جب دھت ہو گئے تو آپس میں بحث چھڑ گئی ـــ پھر لڑ پڑے۔ دونوں کے ماتھوں پر تیوریاں پڑ گئیں۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ منٹو گھونسا چلاتا تو مجھے لگتا راشد مکا لہراتا تو وہ بھی مجھے لگتا۔

جب مار کھا کھا کر میں سوج گیا تو اٹھ بھاگا۔ اس رات میں بھوکا سویا۔

دفعتاً بس نے بریک ماری۔ پہیے چلاؤں چلاؤں چیخے۔ میں اپنے خیالات سے چونکا۔

زائرین قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے۔ بس کے سامنے ایک معصوم سا کتا کھڑا رو رہا تھا۔

گلیور اور بونے

زائرین مذاق اڑا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے جیسے سکول کے بچے آدھی چھٹی پر ہوں۔ ان کی توجہ گرد و پیش پر نہ تھی۔ نگاہیں بازار پر نہ تھیں۔ وہ دلی کو دیکھ نہیں رہے تھے۔ صرف اسے محسوس کر رہے تھے۔ دلی کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ متوجہ ہوئے بغیر دلی کے بازار سے گزرنے کا لطف لے رہے تھے۔

پھر دفعتاً ایک دھماکہ ہوا۔ جیسے تھیٹر میں سٹیج پر سے پردہ اٹھنے سے پہلے پٹاخہ چلتا ہے۔

گویا سٹیج سے پردہ اٹھ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ ایک سرخ سی چیز ابھری۔ ابھرتی چلی گئی۔ اوپر۔ اور اوپر۔ اور اوپر حتیٰ کہ وہ ساری فضا پر چھا گئی۔ یوں جیسے کو گلیور اٹھ کھڑا ہوا اور بونوں پر چھا گیا ہو۔ ہماری بس۔ بس میں بیٹھے ہوئے تمام زائر۔ سڑکیں سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگ۔ عمارتیں سب بونوں میں بدل گئے۔

میں نے گھبرا کر بائیں ہاتھ کی طرف توجہ کر لی۔ ارے یہ کیا وہی سرخ ہیولہ بائیں ہاتھ آ کھڑا ہوا۔ ڈر کر میں نے پھر سے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہ ادھر بھی جوں کا توں کھڑا تھا۔ ادھر بھی ادھر بھی یا اللہ یہ کیا شے ہے۔ جس نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ہائی جیک کر لیا ہے۔ اونچے اونچے مینار بڑے بڑے گنبد۔ دیواریں ہی دیواریں۔ نیچے کرسی۔ اتنی اونچی کرسی۔ اس کے نیچے کھلونوں سے مکانات گڑ مٹھیے انسان رینگتے ہوئے رکشے موٹریں۔

پھر اس سرخ ہیولے نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور ایک دل ہلا دینے والی آواز گونجی۔ اللہ اکبر۔ ساری فضا گونجنے لگی ہوا تھرا اٹھی۔

میں نے پہلے بھی چند ایک بار دلی کی جامع مسجد کو دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ اتنی بڑی نہ تھی عظیم نہ تھی ۔ مہیب نہ تھی۔ تمام شہر پر چھائی ہوئی نہ تھی۔

حاجی صاحب

بے شک ان دنوں وہ دلی کے کلچر کا مرکز تھی۔ دلی کے بانکے اس مرکز کے ارد گرد پھیرے لگایا کرتے تھے یوں جیسے دلہن کے ارد گرد پھیرے لگائے جاتے ہیں۔ میں نے بھی کئی ایک بار اس کے ارد گرد پھیرے لگائے تھے۔ میں نے اس کے حسن کو محسوس کیا تھا۔ اس کی جاذبیت کو محسوس کیا تھا ہیبت کو نہیں۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب میں پہلی مرتبہ دلی کی جامع مسجد میں داخل ہوا تھا۔ میں نے تالاب کے کنارے بیٹھ کر وضو کیا تھا۔ اور پھر حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک برآمدے تک پہنچا تھا۔ حاجی صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا میں ان کے روبرو بیٹھ گیا

تھا۔ پھر انہوں نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لئے تھے۔

اس وقت میں نے حاجی صاحب سے پوچھا تھا جناب اماں کے کہنے پر میں بیعت کے لئے حاضر تو ہو گیا ہوں۔ لیکن کیا میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔

"پوچھئے۔" حاجی صاحب نے فرمایا۔

"جناب بیعت کیا ہوتی ہے۔"

وہ مسکرا دیئے۔ "بولے یہ ایک رسم ہوتی ہے۔"

"خالی رسم ہے یا اس میں روح بھی ہے۔" میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر بولے "یہ تو روح سے بھری ہوئی رسم ہے۔"

"اس کا مطلب کیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ خود کو میرے حوالے کر رہے ہیں۔"

"یعنی میں خود کو سپرد کر رہا ہوں۔"

"ہاں۔" انہوں نے سر ہلایا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ کھینچ لئے۔ "حاجی صاحب مجھ سے وہ طلب کیجئے جو میں دے سکتا ہوں۔ ایسی چیز مانگئے جسے دینا میرے بس میں ہو۔ خود کو دوسرے کے حوالے کر دینا میرے بس میں نہیں۔ حاجی صاحب میرے پاس صرف ایک "میں" ہی تو ہے۔ اسی پر میں مان کرتا ہوں، اسی کے سہارے میں قائم ہوں۔ جی رہا ہوں۔ یہی میرا اوڑھنا ہے۔ یہی بچھونا ہے۔ اسے میں آپ کے حوالے کیسے کر دوں۔ حاجی صاحب مجھ سے سارا نہ مانگئے کچھ میرے پاس بھی رہنے دیجئے۔"

حاجی صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کی گردن یوں جھک گئی جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ دور ــ زمان و مکان سے دور ــ ماحول پر گہری خاموشی چھا گئی ــ بوجھل خاموشی ــ صدیاں گزر گئیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں بوڑھا ہو گیا۔ پھر حاجی صاحب نے سر اٹھایا۔ بولے "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"بے شک رسم ادا کر لیجئے" میں نے کہا۔ "اماں کا کہنا پورا ہو جائے لیکن بے روح کی رسم۔"

حاجی صاحب مسکرا دیئے۔ انہوں نے میرے ساتھی سے جو مجھے اماں کے کہنے پر ان کی خدمت میں لے کر گیا تھا، رجوع کر کے کہا۔ "یہ ٹھیک کہتے ہیں۔ انہیں فی الحال بیعت کی ضرورت نہیں۔ آپ انہیں لے جایئے۔ ان کی اماں سے کہئے ان کے بارے میں فکر نہ کریں۔ جس بات سے وہ ڈرتی ہیں وہ ہو کر رہے گی۔ اس کٹھالی سے گزرنا لازم ہے۔ ان کا مستقبل اچھا ہے۔ روشن لوگوں میں رہیں گے بڑی برکت ہو گی۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ وہ منحنی شخص جسے ہم حاجی صاحب کہتے تھے. جو ایک نحیف و نزار آدمی تھا جس کا سر روئی کے بنے ہوئے گڈے کی طرح ہر وقت ہلتا رہتا تھا۔ جس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اتنی روشن جیسے ساری شخصیت آنکھوں میں سمٹ آئی ہو اور باقی جسم بے جان رہ گیا ہو۔ اس وقت وہ نحیف و نزار بڈھا میری نگاہوں میں ابھرا۔ ابھرتا چلا گیا حتیٰ کہ اس کا قد جامع مسجد کے مینار کے برابر ہو گیا۔

آج جامع مسجد اسی طرح ابھری تھی، جس طرح اس روز حاجی صاحب ابھرے تھے۔ اس طرف جامع مسجد اس طرف لال قلعہ۔ ان دونوں مہیب و عظیم عمارتوں کے نیچے دلی دب کر رہ گئی تھی۔

دلی کی جامع مسجد اور لال قلعے کی عظمت کو محسوس کر کے مجھے یوں لگا جیسے دلی وہی مغلوں کی دلی ہو۔

قلعے سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ "باادب باملاحظہ ہوشیار ظل الٰہی خالق ارض و سما کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔"

مسجد کے مینار اپنی کھرج آواز میں ایک ساتھ بولے۔ اللہ اکبر۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں چھلانگ مار کر بس سے باہر نکل جاؤں اور چوک پر پولیس مین کی جگہ کھڑے ہو کر آتے جاتے لوگوں کو مخاطب ہو کر کہوں۔

نہ مہاراج

مہاراج یہ کیا کیا آپ نے ۔۔ آپ تو اکھنڈ بھارت کے دیوانے ہیں۔ رام راجیہ کے خواہاں ہیں۔ ہند کی پرانی عظمت کو از سر نو بیتنے کے خواہشمند ہیں ۔۔ یہ کیا کیا آپ نے کہ دلی کو ہند کی راج دھانی بنالیا۔ اس دلی پر تو کبھی بھارت کی چھاپ نہیں لگ سکتی۔ یہ دلی تو ہمیشہ

مغلوں کی رہے گی۔ مسلمانوں کی دلی ـــ اس عظیم مسجد کے مینار تو ہمیشہ اللہ اکبر الاپتے رہیں گے۔ اس لال قلعے سے تو ہمیشہ باادب باملاحظہ ہوشیار کی آوازیں گونجتی رہیں گی۔

مہاراج آپ کو تو چاہیے تھا کہ اس مسجد اور قلعے کو کرین سے اٹھوا کر کسی عجائب گھر میں رکھوا دیتے تاکہ یہ دلی آپ کی دلی بن سکتی۔

لیکن نہیں صرف جامع مسجد اور لال قلعے کی بات نہیں یہاں تو قدم قدم پر مسلمانوں کے نقش کف پا موجود ہیں۔ مقبرے ہیں، مینار ہیں، باغات ہیں، محرابیں ہیں، ڈیوڑھیاں ہیں، آپ کیا کیا کچھ کرین سے اٹھوا کر عجائب گھر میں پھنکوائیں گے۔ یہ سانپ جو گزر گئے ہیں، اتنی لکیریں چھوڑ گئے ہیں کہ کبھی مٹائے نہ مٹ سکیں گی۔

خالی بادشاہوں کی بات نہیں یہ شہر تو ان ولیوں اور قطبوں کے مزاروں کا شہر ہے۔

ان وا تاؤں کا شہر ہے جن کی دین محدود نہ تھی۔ جن کے دوار سے ہندو۔ سکھ۔ بدھ، مسلمان سبھی جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے تھے۔ یہی لوگ ہند کے فاتح تھے مہاراج۔ یہی وہ تلواریں تھیں جنہوں نے ہند کو فتح کیا۔ اپنے اسلامی کردار کی عظمت سے لوگوں کے من موہ لئے۔ دان پن کے دریا بہا دیئے۔ اونچ نیچ کے فرق مٹا دیئے۔ ہندویت نے جو ذات پات کی کلغی سر پر سجا رکھی تھی' اسے مٹی میں رول دیا۔

صرف دلی کی بات نہیں مہاراج۔ انہوں نے سارے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ ایک اکیلے ہجویری نے لاہور کی داتا کی نگری بنا دیا۔ ایک اکیلے غریب نواز نے اجمیر کو اجمیر شریف میں بدل دیا۔ ایک اکیلے فرید نے اجودھن کو پاک پتن بنا دیا۔ ایک اکیلے درویش، نے اندر پرست کو دلی میں بدل دیا۔

ان کے ہوتے ہوئے دلی کبھی آپ کی دلی نہیں بن سکے گی۔ یہ دلی انہی کی رہے گی جن کی چھاپ یہاں قدم قدم پر لگی ہوئی ہے۔

میں چوک میں کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ میرے ارد گرد دلی کے باسیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان سب کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ وہ سب حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ "اب یہ دلی ہماری ہے۔ یہ قلعہ. یہ مسجد

ہمارے ہیں۔ "

بے کار ہے بے کار ہے میرے دل سے آواز اٹھی۔ مانوسیت نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کا دل نہ دکھے۔

مانوسیت کتنی بڑی رحمت ہے۔

بیوٹی اینڈ بیسٹ

میرے ایک دوست کی شادی ایک انتہائی حسین عورت سے ہو گئی۔ وہ رونا میرے پاس آیا۔ "بولا مفتی میں کیا کروں میں تو مارا گیا۔ "

میں نے پوچھا "کیوں کیا ہوا۔ "

"بولا میری شادی ہو گئی ہے۔ "

"اس میں مارا جانے کی کیا بات ہے۔ "

بولا۔ "ہے۔ "

میں نے کہا "کیا۔ "

بولا۔ "میری بیوی اتنی حسین ہے اتنی حسین ہے کہ مجھ سے سہاری نہیں جاتی۔ "

میں نے کہا "حسین بیوی مل گئی ہے تو تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ "

بولا۔ "نہیں اس کا حسن عام حسن نہیں۔ بدن ایسا ہے جیسے گلابی شیشے کا بنا ہو۔ رنگ ایسا ہے جیسے سیندھور اور میدے سے بنی ہو۔ انگ انگ رس سے بھرا ہے۔ حرکت میں لے ہے۔ میں تو مارا گیا۔ اتنا حسن میں کیسے سہار سکوں گا ۔۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ میں پاس جاتا ہوں تو وہ میلی ہو جاتی ہے۔ میں شرمندہ ہو کر الگ ہو جاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے بیوٹی اینڈ دی بیسٹ مل بیٹھے ہوں۔ "

دو سال کے بعد مجھے اس سے ملنے کا پھر موقعہ ملا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بیسٹ خود بیوٹی بنا بیٹھا ہے اور بیوٹی گھر کے کونے میں دھری رکھی ہے۔

بے شک مانوسیت بہت بڑی نعمت ہے۔ ورنہ یہ دو گلیور جو دلی کے مرکز میں ہر وقت کھڑے رہتے ہیں۔ ایک کان پر ہاتھ رکھ کر اذانیں دیتا رہتا ہے۔ دوسرا باادب کے

آوازے لگاتا رہتا ہے۔ یہ دونوں دلی کو ناقابل برداشت بنا دیتے۔

نہ مہاراج یہ شہر آپ کی راج دھانی بننے کے قابل نہیں اس نے آپ کو بونا بنا رکھا ہے۔

دکان کی لگن

ہماری بسیں بازار میں داخل ہو گئیں۔ دورویہ دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ بڑی معتبر قسم کی دکانیں۔ ٹٹ پونجیہ دکانیں نہیں۔ ساری کی ساری دوکانیں مقفل پڑی تھیں۔

یا اللہ یہ کیا بات ہے ساڑھے آٹھ بجنے کو آئے ہیں ابھی تک کوئی دکان نہیں کھلی۔

ہندو تو ایک سحر خیز قوم ہے۔ صبح پو پھٹتے وقت جاگ اٹھتا ہے۔ رفع حاجت سے فارغ ہو کر نہاتا ہے۔ روز کے روز۔ بند غسلخانے میں نہیں کھلے میدان میں۔ چاہے کتنی بھی سردی کیوں نہ ہو۔

گھر پر اس لئے نہیں نہاتا کہ ایک پنتھ دو کاج کا قائل ہے۔ صبح سویرے تازہ ہوا میں ٹہل لگانے کا شوقین ہے۔ ساتھ ٹہل لگائے گا ساتھ داتن کرے گا۔ پھر باہر کسی کنویں پر دریا کنارے تالاب کنارے یا نل پر نہائے گا۔ رام نام کی جاپ کرے گا پھر گھر پہنچ کر کچھ کھائے پئے گا۔ اس کے بعد اس پر دکان کا بھوت سوار ہو جائے گا۔ دکان سے اسے محبت نہیں عشق ہے۔ اس لئے نہیں کہ دکان کمائی کا ذریعہ ہے۔ اگر ہندو کے نزدیک دکان کمائی کا ذریعہ ہو تو وہ بھی مسلمان کی طرح دو سو فی صد سے کم منافع کو منافع نہ سمجھے۔ نہیں ہندو منافع کا دیوانہ نہیں وہ لکشمی کا پجاری ہے ایک روپیہ فی صد یا حد پانچ روپیہ فی صد منافع لے گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ وہ سہج پکے سو میٹھا ہو کا قائل ہے۔

میں نے زندگی میں کئی ہندو دیکھے ہیں جنہوں نے ایک سڑک کے کنارے ایک جھگی سی دوکان کھولی۔ وہی لالہ جی کی دوکان تھی وہی مکان۔ وہی گھر وہی باہر۔ سادہ سا سودہ رکھا۔ پکوڑے ریوڑیاں، چنے. تلی دال بس ایسی چیزیں۔ زندگی بھر وہیں بیٹھا رہا۔ وہی جھگی وہی سودا اور پھر ایک روز سنا کہ لالہ جی کا دہانت ہو گیا۔ اور جھگی سے لاکھ روپے بر آمد ہوئے۔

ان دنوں کا لکھ پتی۔ آج کے کروڑ پتی کے برابر ہوتا تھا۔ واہ لالہ جی مہاراج آپ کے صبر و تحمل اور محنت پر قربان جایئے۔ لکشمی کو پانے کے لئے اپنی ساری زندگی قربان کر دی۔

ہاں تو ہندو کو منافع کی نہیں دوکان کی لگن ہے لیکن یہ کیا ساڑھے آٹھ بج گئے اور ایک بھی دوکان نہیں کھلی۔ شاید آج ناغے کا دن ہو۔ میرے ذہن سے آواز آئی۔ ناغے کا دن ہے تو پڑا ہو۔ ناغہ تو بیچنے کا ہوتا ہے دوکان میں بیٹھنے کا تو نہیں۔ اگر باہر کا دروازہ کھولنا قانون کے خلاف ہو بے شک اسے بند کر دو۔ اس سے تو دکان کا ماحول اور بھی سچا ہو جاتا ہے لیکن بازِار میں کوئی دوکان نہیں کھلی تھی۔ ہر دروازہ مقفل تھا۔

ہائیں یہ کیا ہوا۔ کیا ہندو کے دل سے دوکان کی محبت ختم ہو گئی۔ کیا اس پوتر لگن کا انت ہو گیا۔ کیا ہندو بدل گیا۔

نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہندو کبھی نہیں بدل سکتا۔

بدھ مت

ہندو صدیاں بدھ مت کے تحت جیا۔ وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیا کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ بدھ مت جس نے باہر کے انسان کو مسخ کر کے اندر کے انسان کو نکالا۔ جس نے امتیازات کو توڑ کر انسانیت کو مرکز بنایا۔ جس نے کردار کو عظمت عطا کی۔ جس نے انسان کی تشدد پسندی کا قلع قمع کیا۔ جس نے دکھاوے کو تیاگ کر سچ کا بول بالا کر دیا۔

وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیا کو بدل ڈالا۔ وہ بدھ مت ہندو کا بال بیکا نہ کر سکا۔ الٹا ہندو نے اس کے ماتھے پر اپنا ٹیکہ سجا دیا۔ اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا اور پھر ہندویت میں جذب کر لیا۔ آج بھی وہ ایشیا کے کئی ایک ممالک میں موجود ہے لیکن ہند میں اس کا پتہ نہیں ملتا۔

پھر مسلمان آئے۔ سینکڑوں سال ہندو مسلمانوں کے تحت رہا۔ مسلمان بادشاہوں کا وزیر بنا۔ بڑے بڑے منصب حاصل کئے۔ مسلمانوں کے طور طریق میں رہن سہن کیا۔ لیکن اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھی بلکہ مسلمان درباروں پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔

پھر انگریز آیا۔ صدیوں ہندو انگریز کے تحت رہا۔ انگریز کا رنگ اپنایا لیکن باہر

سے اس کے رنگ میں ڈوبا نہیں۔ اپنی روایات کو سینے سے لگائے رکھا۔

اور آج آزادی پالینے کے بعد۔ صدیوں کے بعد اپنا راج قائم کر لینے کے بعد کیا ہندو بدل گیا۔ کیا اس نے صبح سویرے جاگنا چھوڑ دیا۔ ٹہلنا چھوڑ دیا۔ کیا اسے دوکان کا جنوں نہیں رہا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر یہ ساری دکانیں بند کیوں ہیں؟۔

بو اور خوشبو

"حد ہو گئی یار۔ " ایک زائر کی آواز نے مجھے چونکا دیا "یہ دکانیں دیکھ رہے ہو۔ سائن بورڈوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں لیکن کسی ایک بورڈ پر اردو نہیں ہے۔ " میں نے بورڈوں کی طرف دیکھا۔ دونوں طرف بورڈوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

ارے یہ کیا ـــ میں گھبرا گیا۔ سارے ہی بورڈ انگریزی میں تھے۔ یا اللہ یہ کیا بھید ہے۔ میرا ذہن سن ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ کوئی بورڈ اردو میں نہ تھا بلکہ اس لئے کہ کوئی بورڈ ہندی میں نہ تھا۔ نہیں نہیں یہ ہند کا بازار نہیں ہو سکتا۔

ہند نے آزادی حاصل کرتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اردو کو اپنے ملک سے دیس نکالا دے دیا تھا۔ اس لئے کہ اسے اردو سے مسلمان کی بو آتی تھی۔ عربی رسم الخط کو ملک بدر کر دیا تھا چونکہ اس سے عرب کی بو آتی تھی لیکن کیا اسے انگریزی سے بو نہیں آتی ـــ کیا انگریزی زبان سے غلامی کی بو نہیں آتی۔

ہمیں تو خیر انگریزی زبان سے خوشبو آتی ہے اور ہم اسے عطر پھلیل کی طرح لگائے پھرتے ہیں۔ صرف زبان ہی نہیں۔ لہجہ. لباس. رہن. سہن ہمارے لئے سٹیٹس کا نشان ہیں۔ لیکن مہاراج آپ تو رام راجیہ کے متوالے ہیں۔

سکاؤٹ کیمپ

ہمایوں کے مقبرے کے قریب بسیں رک گئیں۔

ایک طرف مقبرہ تھا دوسری طرف ایک وسیع باغ تھا۔ جو اب میدان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

میدان کے پھاٹک سے ملحق چار ایک کمرے تھے۔ یہ کمرے سیکوریٹی کی تحویل میں تھے۔ ان کمروں کے سامنے درختوں کی چھاؤں تلے ایک تھڑا تھا جس پر سیکوریٹی کے لوگ کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے تھے۔

سیکوریٹی کے ان کمروں میں سے ایک کمرا لیڈران کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

تھیٹر ہال

سیکوریٹی کے اس ونگ کے سامنے وسیع و عریض میدان تھا جس میں دو سو قدم دور ٹین کا بنا ہوا ایک تھیٹر ہال تھا جو پچاسی زائرین کے لئے مخصوص تھا۔

تھیٹر ہال کے ساتھ ساتھ ایک بر آمدہ تھا۔

اندر کی طرف ہال تھا۔ دوسری جانب سٹیج تھا۔ سٹیج کے بغل میں گرین روم تھا جس میں پولیس کی ایک گارد مقیم تھی۔

ہال کے باہر ایک طرف چار غسلخانے تھے جن میں ہر وقت پانی رواں رہتا۔

دوسری جانب زمین کھود کر لیٹرین بنائے ہوئے تھے جن کے گرد بانس لگا کر پردے کے لئے ٹاٹ لپیٹ دیا گیا تھا۔

غسلخانوں کے قریب ایک وسیع مغلیہ عمارت کے کھنڈر تھے جن پر شاہی چھاپ نہ تھی غالباً سرونٹ کوارٹرز تھے۔

اس سارے علاقے کو سکاؤٹ کیمپ کہا جاتا تھا جس میں ۸۹ زائرین کو پانچ دن قیام کرنا تھا۔

نام کے لحاظ سے یہ سکاؤٹ کیمپ تھا۔ دیکھنے میں ٹین کا بنا ہوا تھیٹر ہال تھا۔ تاثیر کے لحاظ سے ترکی حمام تھا۔

جب ہم تھیٹر ہال کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ہال میں چارپائیوں کی چار قطاریں لگی ہوئی ہیں۔

جس طرح بارکوں میں سپاہیوں کی چارپائیوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ چارپائیوں پر گدوں کے اوپر چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے پاس پیڈسٹل پنکھے کھڑے تھے جو گھومتے نہیں تھے خالی چلتے تھے۔ دیواروں میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔

سٹیج خالی پڑی تھی۔ اوپر کاٹھ کباڑ تھا۔ چھت میں چمگادڑیں لٹک رہی تھیں۔

زائرین نے ہال میں داخل ہو کر اپنی اپنی چارپائی پر قبضہ جما لیا۔ اپنا اپنا سامان چارپائی کے قریب سجا لیا۔

کچھ لوگ کوفت مٹانے کے لئے چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ کچھ تھکاوٹ دور کرنے کے لئے تھیٹر ہال سے ملحقہ غسلخانوں کی طرف بھاگے۔ کچھ بیٹھ کر گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ کچھ برآمدے میں بنے ہوئے ٹی سٹال پر جا بیٹھے۔

اشفاق حسین اور میں دونوں ہی ازلی طور پر علیحدگی اور تنہائی کے مارے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم نے ہال کے پرلے کونے میں سٹیج کے عین قریب دو چارپائیوں پر قبضہ جما لیا اور ہم دونوں لیٹ گئے۔

رموز خسرواں:

جب میں ریل گاڑی سے اترا تھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ گاڑی میں چار پانچ گھنٹے گہری

نیند سویا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ میرا سلیپر کھڑکی کی سیخوں کے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے اپنے پاؤں کھڑکی کی سیخوں کے ساتھ لگا رکھے تھے تاکہ ہوا لگتی رہے۔

بہرحال جب میں ریلوے سٹیشن پر گاڑی سے اترا تھا تو تازہ دم تھا۔ لیکن جب میں سکاؤٹ کیمپ ہال میں پہنچا تو تھکاوٹ سے چور چور تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بس میں آدھ گھنٹے کے سفر نے یہ کیفیت کیوں پیدا کر دی تھی۔ اور وہ بس ہند کے مشہور و معروف سرمایہ دار دادا کی کمپنی کی تھی۔ کھلی کھلی آرام دہ اور خوبصورت۔ اس میں سفر کرنا باعث راحت تھا۔ پھر یہ تھکاوٹ کیسی۔ میں سوچنے لگا۔

دفعتاً میرے دائیں جانب جامع مسجد اور بائیں جانب لال قلعہ پھر ابھر آئے۔ نہیں نہیں میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ گیا بالکل سمجھ گیا۔ کوئی چیز آپ کو بونا بنا دے۔ آپ کی شوکت نفس کو پامال کر دے۔ آپ کی اہمیت کے پر کاٹ دے تو یقیناً آپ میں تھکاوٹ پیدا ہو گی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ یا اللہ یہ دلی کے لوگ یہاں کیسے رہتے سہتے ہیں۔ کیا وہ تھکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔

نٹشے کا کہنا ہے۔ خبردار ہیرو ورشپ کی عادت نہ ڈالو۔ تم کبڑے اور اپاہج ہو جاؤ گے۔

آسکر وائلڈ کا بیان ہے۔ بڑے آدمی کا بیٹا ہونا بالکل ایسے ہی ہے جیسے بڑے درخت کے سائے میں اگا ہوا پودا ہو۔ بیچارہ کبھی پھل پھول نہیں سکتا۔

تاریخی عمارتیں بے جان نہیں ہوتیں۔ ان میں ایک تاثر ہوتا ہے۔ یا تو اس شخصیت کا جس سے عمارت منسوب ہو۔ یا اس ماحول کا جو اس عمارت پر مسلط رہا۔ مثلاً لندن کے تاریخی قلعے لندن ٹاور میں جا کر دیکھئے۔ وہ اب تک قیدیوں کی سسکیوں اور مقتولوں کی چیخوں کے تاثرات سے بھرا پڑا ہے۔ کسی کو ہمت نہیں کہ رات کو وہاں قیام کرے۔

کیا ان باتوں کا ہند کے سربراہوں کو احساس نہیں۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ بڑے زیرک لوگ ہیں۔ وہ یقیناً مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں — تو کیا انہوں نے جان بوجھ کر ایسے کر رکھا ہے۔ کیا اس میں کوئی سیاسی مصلحت ہے۔

بدقسمتی سے میں سیاسی نہیں ہوں۔ میں رموز خسرواں کو نہیں سمجھتا۔ نہ ہی میں ریوولیوشنری ہوں۔ اس لئے رموز خسرواں پر نکتہ چینی کا عادی نہیں۔

اگرچہ میں ان جان ہوں مجھے پتہ نہیں ۔۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہند کی یہ سیاسی مصلحت صرف دو فائدے پہنچا سکتی ہے۔ ایک تو کبڑی رعایا ساز گار ہوتی ہے۔ دوسرے ان دبے دبے اثرات کو جب چاہو ہوا دے کر خوف یا غصے کی دیوار کھڑی کر لو۔

"چائے نہیں پئیں گے آپ۔" ایک زائر نے آ کر مجھے چونکا دیا۔

ابے او:

"چائے۔ ہاں ہاں ضرور۔" میں اٹھ بیٹھا۔ شاید یہ تھکاوٹ چائے نہ پینے کی وجہ سے ہو۔

"چلو ایک پیالہ چائے ہو جائے۔" میں نے اشفاق حسین سے بات کی۔ دفعتاً اس کے اندر کا ام بی بی ایس جاگ اٹھا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔ "اونہوں" وہ بولا۔ "آتے ہوئے میں نے ٹی سٹال کو دیکھا تھا۔ ان ہائی جینک۔ ڈرٹی آئی ایم اے سک مین۔ مجھے اچھے ناشتے کی ضرورت ہے۔ انڈا نہیں۔ میں اس کی تلخی برداشت نہیں کر سکتا۔ گذشتہ تین ماہ سے میں نے گوشت نہیں کھایا۔ ناشتے میں دہی۔ کھانے میں کدو جس میں نہ گھی نہ نمک مرچ نہ ہو۔ یا مجبوری ہو تو دال۔ ہمیں کھانے میں احتیاط برتنی چاہئے۔ پردیس میں بیمار پڑ گئے تو کیا کریں گے۔ اس لئے پیارے ابھی کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اٹھتے ہیں۔ بازار چلتے ہیں جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ صورت حال کیا ہے۔"

"ابے او ام بی بی ایس کے بچے۔ چھوڑ ان احتیاطوں کو۔ زندگی احتیاط نہیں۔ روانی ہے۔ صحت احتیاط نہیں۔ احتیاط سے بے نیازی ہے۔ تو کس چکر میں پڑا ہے. مجھے بھی محروم کر رہا ہے۔" غصے سے میں کھولنے لگا۔ لیکن میرا غصہ بے آواز تھا۔

"معقول بات ہے نا۔" اشفاق حسین نے پوچھا۔

"بالکل بالکل بہت معقول بات ہے۔" میں نے دانت نکال دیئے۔

"احتیاط لازم ہے نا" وہ بولا۔

"ظاہر ہے" میں نے کہا اور اندر دانت پیس کر بے آواز بولا۔ "بس کر بس کر۔ اب مجھے صحت پر لکچر نہ پلا۔ "

"یہ لوگ کتنے احمق ہیں کہ جیسی کیسی چائے ہو سڑک سڑک پی جاتے ہیں۔ " اشفاق حسین کا ام بی بی الیس موج میں آ گیا۔

"بالکل بالکل احمق ہیں"۔ میں نے غصے میں باآواز بلند کہا۔ "لیکن میاں جی جو سڑک سڑک پیتے ہیں ان کی صحت تم سے کہیں اچھی ہے۔ "

"اور پھر انہیں اپنی حماقت کا احساس نہیں ہوتا"۔ وہ ہنسا۔

"احساس ہو تو تیری طرح بیمار پڑے ہوں۔ یہ تو بے حس لوگ ہیں"۔ میں نے باآواز بلند کہا۔

ممیاتی بھیڑیں

کچھ دیر بعد ہم دونوں ناشتے کی تلاش میں باہر نکلے تو باہر میدان میں زائرین کے ایک گروپ نے ہمیں روک لیا۔ ایک صاحب بولے "اونہوں باہر نہ جائیں"۔

اس لئے کہ لیڈر صاحب نے حکم جاری کیا ہے کہ ہم سب مل کر درگاہ شریف جلوس کی شکل میں جائیں گے۔

"لیڈران صاحب کو تو ہم نے دیکھا ہی نہیں"۔ اشفاق حسین بولا۔

"ہاں یار"۔ میں نے اشفاق حسین سے کہا۔ "ہال میں کوئی لیڈر تو نہیں دیکھا ہم نے۔ سب زائر ہی زائر ہیں"۔

"ہال میں تو بکریاں ہیں" ایک صاحب چلائے۔ "رکھوالے تو ادھر الگ کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں"۔

"وہ ادھر جتھے میں شامل کیوں نہیں ہوتے" دوسرا بولا۔

"جو جتھے میں شامل ہو جائیں تو پھر رہبری کیسے کریں"۔

"بالکل درست راستہ دکھانے والے ہمیشہ الگ ہوتے ہیں۔ یہی دنیا کی ریت ہے"۔

"لیکن وہ ہیں کہاں"۔ میں نے پوچھا۔

"ادھر سیکوریٹی کے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں ہیں۔ وہ سامنے ان کا کمرا اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ ٹین کا نہیں"۔

"بس یہی ہماری بد نصیبی ہے"۔ ایک معزز زائر قریب آتے ہوئے بولے۔ "ہمیں کوئی ایسا راہ دکھانے والا نصیب نہ ہوا جو ہم میں سے ہو"۔

"اونہوں"۔ ایک صاحب چلائے۔ "ہم میں سے ہو نہیں بلکہ جو خود کو ہم میں سے سمجھے۔ الگ نہ جانے"۔

"وہ ہم میں سے الگ اس قدر اونچے بیٹھ جاتے ہیں کہ ساری دنیا انھیں گری گری معلوم دیتی ہے"۔ پیچھے سے آواز آئی۔

"کب درگاہ شریف پر جلوس کی صورت میں جا رہے ہیں"۔ اشفاق حسین نے پوچھا۔

"لیڈر صاحب نے کہا تھا آدھ گھنٹے میں"۔

"اس بات کو ۴۵ منٹ تو ہو چکے ہیں" دوسرا بولا۔

"ہم ادھر ہی جا رہے ہیں ناشتہ کرنے"۔ اشفاق حسین نے کہا۔ "وہیں سے شامل ہو جائیں گے جلوس کے ساتھ"۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے"۔ چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

"جاؤ جی جاؤ۔ لیڈر کا کیا اعتبار ہے"۔

طوطیاں والے

جب ہم کیمپ کے پھاٹک پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تھڑے پر درختوں کی چھاؤں میں دس بارہ کرسیاں پڑی ہیں جن پر سیکوریٹی والے بیٹھے ہیں۔ بظاہر وہاں نہ کوئی فائل تھی نہ کاغذات مگر وہ یوں بیٹھے تھے جیسے شدت سے مصروف ہوں۔

"یہ جمگھٹا کیسا ہے"۔ میں نے اشفاق حسین سے پوچھا۔

"بھئی یہ وہی سیکوریٹی والے"۔ اشفاق حسین نے جواب دیا "جو سٹیشن سے ہمارے ساتھ آئے ہیں"۔

زندگی بھر میں نے سرکاری نوکری کی ہے۔ پندرہ سال اطلاعات میں کام کیا ہے۔

دو سال صدر گھر میں بھی رہا ہوں۔ میں نے سیکوریٹی کا نام بار بار سنا ہے۔ جا بجا سنا ہے لیکن میں آج تک اس کے مفہوم کو نہیں سمجھ پایا۔

میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جب ہمارے صدر صاحب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو دو ایک موٹریں آگے اور دو ایک موٹریں پیچھے طوطیاں بجاتی ہوئی یا ٹناؤں ٹناؤں کرتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ لوگ خبردار ہو جائیں، رک جائیں، سڑکیں صاف ہو جائیں۔ یہ سیکوریٹی کے لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

ایسے جلوس کو دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا ہوں ہمارے یہ محترم سربراہ جن سے ہم عدل مانگتے ہیں، آزادی مانگتے ہیں، یہ ہمیں کیا دیں گے۔ یہ تو خود مجبور و لاچار ہیں۔ صدر ایوب کے دور میں میں نے اکثر صدر کو ان طوطیوں سے زچ اور بے زار دیکھا تھا۔ لیکن وہ ڈسپلن کے بہت قائل تھے لہٰذا چپ چاپ سنتے تھے پی جاتے تھے۔

خبر آتی ہے کہ امریکہ سے فلاں صاحب پاکستان آ رہے ہیں۔ ان کی آمد سے چھ ماہ پہلے امریکی سیکوریٹی پاکستان میں آ پہنچتی ہے تاکہ ان صاحب کے دورے سے متعلقہ انتظامات کریں۔ چھ مہینے وہ شدت سے مصروف کار رہتے ہیں اور پھر جب دورہ بخیر و عافیت ختم ہو جاتا ہے تو خوشی خوشی واپس امریکہ چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ یہاں کرتے کیا ہیں۔

جب ایوب کے دور میں میں صدر دفتر میں ملازم تھا تو سارا دن سیکوریٹی کا نام سنا کرتا تھا لیکن یہ بی بی کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ صرف اتنی سی بات تھی کہ جب میں دفتر میں داخل ہوتا تو گیٹ کے ملحقہ کمرے میں داخل ہو جاتا وہاں پُلس نما لوگ بیٹھے ہوتے۔ وہ مجھے یوں گھور گھور کر دیکھتے جیسے قصائی بھینس کو دیکھتا ہے۔ ان کی نگاہیں میرے اندر جا دھنستی۔ اور پھر دوسری طرف سے باہر نکل جاتیں۔

ان پُلسیہ نگاہوں سے تو میں ہمیشہ سے خائف ہوں اور پولیس کے سپاہی کو دور سے دیکھ کر راستہ بدل لینے کا عادی ہوں۔ سپاہی کو دیکھ کر میں ہمیشہ یوں محسوس کیا کرتا ہوں جیسے ابھی ابھی میں کوئی جرم کر کے آیا ہوں۔

جب ہم ہند کی سیکوریٹی کے پاس سے گزر رہے تھے، اس وقت سیکوریٹی والے شدت سے مصروف کار تھے۔ مصروفیت تو نظر آتی تھی البتہ کار کا پتہ نہ چلتا تھا وہ یوں

مصروف تھے جیسے انہیں علم ہی نہ ہو کہ دو زائر کیمپ سے باہر جا رہے ہیں۔ اتنی بے نیازی دیکھ کر مجھے شک پڑنے لگا کہ آنکھوں کے سوا ان کے جسم کا بند بند ہم پر مرکوز ہے۔ وہ اپنی دوسری حسیات سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ لیکن وہ آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ رہے۔ شاید اس لئے کہ ہمیں پتہ نہ چلے کہ وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ کیوں۔ کسی راہ گیر کو دیکھنا تو ایک معصوم فعل ہوتا ہے۔

شدھ ہندو

بہر صورت ہم دونوں پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ ابھی چند ایک قدم ہی گئے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔ مہاراج۔ مہاراج — ہم رک گئے۔ وہ ایک دبلا پتلا عجز بھرا منحنی آدمی تھا۔ ہمیں متوجہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

”مہاراج وہ — مہاراج وہ — آپ کہاں جا رہے ہیں مہاراج“۔ اس کے انداز میں نہ تو سوال تھا نہ منعائی۔ صرف گھبراہٹ ہی گھبراہٹ تھی جیسے اسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔ کیسے کہے۔

”بھئی ہم بازار جا رہے ہیں“۔ اشفاق حسین نے کہا۔ ”ناشتہ کرنے کے لئے۔

”مہاراج — مہاراج آپ جاتے ہوئے بتا جائیں تو — ذرا بات کر لیا کریں — ہاں مہاراج —“

”ٹھیک ہے“۔ اشفاق حسین نے کہا۔

اور ہم دونوں واپس چل پڑے۔

پھاٹک پر پہنچ کر ہم رک گئے۔

سیکوریٹی کے تمام اراکین اسی طرح شدت سے مصروف کار بیٹھے ہوئے تھے جیسے ہماری آمد کے بارے میں انہیں قطعی کوئی علم نہ ہو۔

”جناب“۔ اشفاق حسین بولا۔ ”ہم ذرا بازار جا رہے ہیں. ناشتہ کرنے کے لئے. میں بیمار ہوں، ناشتے میں دہی کھاتا ہوں۔ دہی یہاں ٹی سٹال پر موجود نہیں ہے“۔

انہوں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ یوں جیسے ہمارے پیچھے چپڑاسی بھیجنے سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ ہماری آمد پر شدت سے حیران ہوں۔

عین اس وقت ایک آدمی کرسی سے اٹھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھے۔

"مہاراج آپ جائیں ضرور جائیں، ناشتہ کریں۔ بڑی کرپا ہے آپ کی"۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ جاتے ہوئے آپ کو اطلاع کر دی جائے تو تمام زائرین میں اعلان کر دیجئے"۔ میں نے کہا۔ "تاکہ انہیں پتہ چل جائے"۔

"نہیں مہاراج" ___ وہی شخص بولا۔ "آپ بے شک جائیں جہاں جی چاہے جائیں۔ کوئی منعائی نہیں مہاراج"۔

وہ ایک شدھ ہندو تھا۔ یہ پہلا شدھ ہندو تھا۔ جس سے مجھے بات کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ سبحان اللہ کیا ہندو تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ وہ ہندو تھا جس کے ساتھ میں نے زندگی کے چالیس سال گزارے تھے۔ وہی مٹھاس، وہی عجز، وہی نرم و نازک بات۔

اسے دیکھ کر مجھے وہ ہندو یاد آ گیا جس کے ساتھ میں چالیس برس پہلے بے حد مانوس تھا۔

مجھے چاند یاد آ گیا۔

چاند حلوائی

بٹالے میں محلہ مفتیاں کے بازار میں چوراہے سے ہماری ڈیوڑھی تک ایک ہی ہندو کی دکان تھی۔ چاند کی دکان۔ چاند مٹھائی بنایا کرتا تھا۔ وہ ہر آتے جاتے کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا کرتا تھا۔ عجز اور پیار سے بات کیا کرتا تھا۔

بڑوں کی بات چھوڑیئے۔ بڑوں کو تو سبھی سلام کرتے تھے۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور چھٹیوں میں بٹالے آتا تو مجھے دیکھ کر چاند کی باچھیں کھل جاتیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ مجھے پرنام کرتا اور پھر کہتا۔ "آ گئے مہاراج۔ پدھارو مہاراج"۔ چاند کی باتیں اس کی مٹھائی سے زیادہ میٹھی تھیں۔

اس کے برعکس بوٹا حکیم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ طنز بھری مسکراہٹ مسکراتا۔ "آ

گئے۔ پھر آ گئے۔ دھما چوکڑی مچانے۔ آؤ بابو آؤ"۔

اس کی باتیں اس کی سکنجبین سے زیادہ تلخ ہوتیں اور اس کی سکنجبین — توبہ ایک گھونٹ پیتے تو آنکھوں سے دھواں نکلنے لگتا۔

ہندو کے عجز نے مجھے اس قدر مسحور کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کے پاکستان کے مطالبے پر ہندو کو انکار کرتے اور چیں بہ جبیں ہوتے دیکھ کر مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قدر عجز و تحمل کا مالک اس مطالبے پر چڑ چڑانے کیوں بھونے لگا۔ یہ یکدم ایک معصوم شخص سے جن کیسے باہر نکل آیا۔

بہر صورت اس روز سیکوریٹی کے افسر کو اس انداز میں بات کرتے دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں بڑھ کر اسے گلے لگا لوں. پیار کروں۔ جب سے میں ہند میں داخل ہوا تھا یہ پہلا ہندو تھا جس میں روائتی ہندو کی انکساری تھی۔

سکاؤٹ کیمپ سے ایک تنگ سی سڑک گھومتی ہوئی ہمایوں کے مقبرے کے صدر دروازے سے گزرتی ہوئی مین روڈ پر پہنچتی تھی۔ سامنے مین روڈ پر چوراہا تھا۔ چوراہے کے راؤنڈاپ کے درمیان میں مغلئ ڈیوڑھی تھی۔ لو— مغلوں کی ایک اور چھاپ۔ ادھر ہمایوں کا مقبرہ ادھر سڑک کے عین درمیان کے گولے میں ایک ڈیوڑھی۔

مہاراج یہ آپ نے اس مغلئ ڈیوڑھی کو سڑک کے راؤنڈاپ میں کیوں لے لیا۔ ان ڈیوڑھیوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں آپ۔ یوں تو آپ مغلوں کی دلی کے متولی بن کر رہ جائیں گے۔

ذرا سوچئے مسلمانوں کے ان باغات. بارہ دریوں. لاٹوں. مقبروں. جنتر منتروں. دھوپ گھڑیوں، مزاروں، درگاہوں کے رکھ رکھاؤ پر کتنا خرچ آتا ہوگا۔ یہی رقم آپ کے ڈیفنس بجٹ میں کام آتی۔

سڑک کو پار کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے بازار میں داخل ہو گئے۔ بازار میں چند بوڑھے دو رویہ چادریں بچھائے بیٹھے تھے جن پر کھلونے. رسالے. جھوٹے زیور، تسبیحیں اور ایسا ہی چھوٹا موٹا سامان لگا ہوا تھا۔ ایک طرف چار ایک ریڑیاں کھڑی تھیں جو کچے گلے سڑے پھلوں سے بھری ہوئی تھیں۔

اقبال ہوٹل

ان کے قریب دو ہوٹل تھے۔ روڈ سائڈ ہوٹل۔ ایک کھلا کھلا سا نظر آتا تھا جس پر اقبال ہوٹل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دوسرے پر کوئی بورڈ نہ تھا۔ باہر سڑک پر چولہے بنے ہوئے تھے جن پر دیگچیاں چڑھی ہوئی تھیں جن پر ایک معزز شکل کا آدمی ہاتھ میں چمچہ لئے کھڑا تھا۔ اندر کوٹھڑیوں میں دو ایک آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

اقبال ہوٹل باہر سے فراخ نظر آتا تھا۔ اندر کوئی گاہک نہ تھا۔ باہر ایک نوجوان کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک بوڑھا کلین شیو بزرگ تھا۔

"آیئے آیئے۔ بیٹھئے بیٹھئے۔ تشریف تو رکھئے"۔

"دہی۔ ہاں ہاں۔ مل جائے گا۔ میں منگوائے دیتا ہوں"۔

"ٹھنڈا پانی" "بالکل بالکل۔ ابھی۔ برف والا آتا ہے۔ ذرا ابھی انتظامات پورے نہیں ہوئے۔ کل تک انشاء اللہ ہر چیز یہاں دستیاب ہوگی۔ آپ زائروں کے ٹولے میں آئے ہیں۔ خوب بہت خوب"۔ اقبال ہوٹل والے نے گویا ٹیپ چلا دیا۔ باتوں کا ایک تار بندھ گیا۔ مہذب باتیں۔ ترت پھرت باتیں۔ تیز باتیں۔ قینچی کی طرح چلتی ہوئی باتیں۔

سیلز مین شپ سے بھری ہوئی باتیں۔ رکھ رکھاؤ میں بھیگی ہوئی باتیں۔ میں اہل زبان سے بہت ڈرتا ہوں اس کی باتیں مجھ پر ہمیشہ حاوی رہیں۔ وہ مجھے احساس کمتری سے توڑ پھوڑ دیتی ہیں۔ میں گونگا ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرا تمام علم و ادب سمٹ کر ناپید ہو جاتا ہے اور میرا وجود چلا جاتا ہے۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ اللہ کے واسطے مجھے ایک قلم کاغذ دے دو۔ میرے پاس جواب ہے۔ لیکن منہ زبانی نہیں۔ کوئی میری اپیل نہیں سنتا اور میں جوں کا توں گونگا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہوں۔

بوڑھا جو اس اثنا میں خاموش بیٹھا تھا۔ بولا۔ "ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے میاں کہ پاکستان سے ہیں۔ ہم تو پیشانی دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں کہ پاکستان سے ہے"۔ بوڑھے کے چہرے پر مسرت کی ایک رو دوڑ گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سوکھے کھیت میں پانی آ گیا ہو۔ "اور فرمایئے"۔ بوڑھا بولا۔ "آپ خیریت سے تو ہیں"۔ یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کی پیشانی کی سلوٹیں کہہ رہی تھیں۔ ہم تو جیسے کیسے ہیں ــــ تم تو خیریت سے ہو نا الحمد للہ کہ تم خیریت سے ہو۔

وہ علاقہ مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھروندے، گرے پڑے لوگ۔ کوئی ایسا نہ تھا جسے خوش حال کہا جا سکے۔ کوئی چہرا چمکدار نہ تھا۔ آنکھ شفاف نہ تھی۔ نظر مطمئن نہ تھی۔ نوجوان لونڈے جو آ جا رہے تھے اگرچہ ان کے انداز میں "ہم" تھا۔ ہم گئے۔ ہم آئے۔ ہم نے کھایا۔ ہم نے سنا! لیکن وہ ہم ٹوٹی ہوئی "میں" پر زبردستی سجایا ہوا تھا۔ ہر "میں" شکستہ تھی۔ ہر "میں" مضروب تھی جس پر ہم کا خول چڑھا تھا۔

ہوٹل والے نے ہمارے سامنے چائے رکھ دی۔ ساتھ ہی اس نے کلین شیو بوڑھے کے سامنے بھی ایک پیالہ رکھ دیا۔

بڈھا بولا۔ "نہیں بھئی نہیں ہم تو چائے پی کر آئے ہیں"۔

"پھر کیا ہوا"۔ ہوٹل والے نے کہا۔ "ایک پیالہ اور سہی"۔

"نہیں"۔ بڈھے نے بڑے وقار سے کہا "میاں تم روز ہمارے سامنے چائے کا پیالہ رکھ دیتے ہو۔ روز بلاناغہ۔ یہ ٹھیک نہیں"۔

"اس میں کیا ہے"۔ ہوٹل والا بولا۔

"میاں کیا تم چاہتے ہو کہ ہم تم سے ملنے نہ آیا کریں"۔

"نہیں نہیں یہ مطلب نہیں"۔ ہوٹل والا مسکرا کر بولا۔

"تو پھر تم ہمیں چائے نہ پیش کیا کرو۔ بس کہہ دیا"۔

"یہ تو میرا فرض ہے"۔

"ہمارے بھی کچھ فرائض ہیں میاں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ روز ہم تم سے مفت کی چائے پی جائیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا" وہ بولا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے۔ وہ رک گیا۔ یوں رک گیا جیسے مزید کہنے کی سکت نہ ہو جیسے الفاظ حلق میں اٹک رہے ہوں جیسے وہ آبدیدہ نہ ہونے کی شدید کوشش میں مبتلا ہو۔ ہاں یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت ہم چائے کے اس پیالے کی قیمت بھی ادا نہیں کر سکتے۔

ہم تہذیب:

میں نے حیرت سے اس معزز "ہم" کی طرف دیکھا۔

وہ چائے پی رہا تھا لیکن اس کا چہرا ستا ہوا تھا۔ آنکھیں بار بار ڈوب رہی تھیں۔

ڈوب جاتیں پھر طلوع ہوجاتیں تاکہ پھر سے ڈوب سکیں۔

یااللہ یہ ہم ابھی تک قائم ہے کیا۔ کب تک قائم رہے گا۔ رسی جل گئی۔ پھر بل کیوں نہیں اترا۔

یہ ہم کی تہذیب پتہ نہیں کب قائم ہوئی تھی۔ غالباً ان دنوں جب درباری کا دور دورہ تھا۔ شہنشاہوں کے سامنے احقر۔ خاکسار اور عوام کے روبرو ہم۔ جب خود کو میں کہنا اپنے مرتبے کو کم کرنے کے مترادف تھا۔ جب ہم جمع متکلم کا صیغہ نہ تھا بلکہ واحد متکلم کی شان تھی۔ جماعت کا احساس نہ تھا۔ فرد کی عظمت تھی۔ یہ ہم کی تہذیب اسلامی سپرٹ کے سراسر منافی تھی۔ چونکہ اسلام جماعتی ہم کا قائل ہے، واحد متکلم ہم کا نہیں۔

ہم کی یہ تہذیب ایک وبا کی طرح پھیلی۔ جس طرح آج مغرب کا کھچڑی کلچر سٹیٹس کی ہوس کے زور پر ہمارے شہروں میں پھیلتا جارہا ہے۔ یہ وبا امراء سے شروع ہوئی اور پھر غرباء کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم کا یہ زہر درباری علاقے میں پھیلتا گیا۔ پھیلتا گیا۔ حتیٰ کہ ہر زید، بکر اس کی زد میں آگیا۔

حاضری

میری زندگی کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مجھ میں شعور کی کمی ہے۔ زندگی بھر بہت سے کام میں رسمی طور پر کرتا رہا۔ سوچے سمجھے غور کئے بغیر۔

رشتے:

مثلاً میں نے اپنی ماں کو اماں سمجھا ماں نہیں سمجھا۔ میں نے ماں کے مفہوم پر کبھی غور نہ کیا۔ اس رشتے کی نوعیت سے میں غالباً آج تک ناواقف ہوں۔ ماں کا مفہوم رسم میں اس قدر دب چکا ہے کہ ہم نے کبھی اس رشتے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

لوگ کہتے ہیں۔ وہ تیری ماں ہے۔ اس نے تجھے جنا۔ مطلب یہ کہ اس نے تیرے لئے جنائی کی تکلیف برداشت کی۔ پھر وہ کہتے ہیں اس نے تجھے پالا پوسا۔ اپنی نیندیں تیرے لئے حرام کیں۔ خود گیلے بستر پر سوئی، تجھے سوکھی طرف لٹایا۔ ان سب باتوں سے ایک مفہوم ابھرتا ہے کہ ماں نے تیرے لئے تکلیفیں اٹھائیں۔ قربانیاں دیں۔

یہ تفصیل اپنی جگہ درست سہی لیکن یہ تفصیل ماں بیٹے کے رشتے کی وضاحت نہیں کرتی۔ میں نے اب ۷۰ سال کے بعد پہلی بار جانا ہے کہ میں ماں باپ کے جسم کا ایک حصہ تھا۔ ماں باپ کے جسم کا ایک حصہ ہوں۔ ماں باپ کے جسم کا ایک حصہ رہوں گا۔ اس تعلق سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔

میں نے زندگی بھر اپنے باپ سے نفرت کی۔ اس لئے کہ مجھے اس کی عادتیں پسند نہ تھیں۔ مجھے شعور نہیں تھا کہ باپ کا مفہوم کیا ہے۔

اہستہ اہستہ جوں جوں میں عمر رسیدہ ہوتا گیا. مجھے شعور ہوتا گیا کہ میں اپنے باپ سے الگ نہیں ہوں۔ میں اپنے باپ میں سے ہوں۔ اس کی وہ عادتیں جو مجھے ناپسند تھیں ایک ایک کر کے مجھ میں ابھریں اور میں حیران رہ گیا۔ یا اللہ یہ کیا ہے۔ میں تو خود کو ایک آزاد فرد سمجھتا تھا۔ ایک الگ جسم۔ ایک الگ ذہن لیکن یہ کیا میں تو الگ نہیں ہوں. انہی میں سے ہوں۔

اس مکینو کے تھیلے میں جسے میں "میں" سمجھتا تھا۔ یہ پھرکی باپ کی ہے۔ یہ چکری ماں کی ہے یہ ایکسل باپ کا ہے. یہ پیچ ماں کا ہے. یہ ورما باپ کا ہے۔ یا اللہ میں کہاں ہوں۔ میرا کیا ہے۔ کیا میرا کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ یہ شعور حیران کن تھا۔ تکلیف دہ تھا۔

ہاں میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مجھ میں شعور کی کمی ہے۔ رشتوں کے شعور کی کمی۔

اللہ میاں

ماں باپ کے بعد دوسرا رشتہ جو میرے ذہن میں قائم ہوا۔ غلط بنیاد پر قائم ہوا۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا. پیسا کے مینار کی طرح اس رشتے کا مینار ٹیرھا ہوتا گیا۔ اور ٹیرھا اور ٹیرھا۔ اتنا ٹیرھا کہ گر کر زمین بوس ہونا اس کا مقصود بن گیا۔

میرا یہ رشتہ ـــــ اللہ میاں سے رشتہ تھا۔

اس غلط بنیاد کی وجہ سے میں نے اللہ کو نہ سمجھا۔ نہیں۔ نہ سمجھا۔ نہیں۔ نہ سمجھنا ایک تو رحمت ہے. اگر مجھے یہ شعور ہو جائے کہ میں فلاں بات کو نہیں سمجھتا تو دل میں عجز پیدا ہوتا ہے۔ ہماری شکل یہ ہے کہ ہم نہیں سمجھتے لیکن سمجھتے ہیں کہ سمجھتے ہیں۔

میں نے اللہ کو غلط سمجھا اور یہ نہ سمجھا کہ غلط سمجھ رہا ہوں۔ بچپن میں میں نے اللہ کو ایک ہوّا سمجھا۔ اماں مجھے اس ہوّے سے ڈرایا کرتی تھی۔ یہ ایک ایسا ہوّا تھا جو غلط کام کرنے پر ناراض ہو جاتا تھا۔ ناراض ہو جاتا تو ڈراتا دھمکاتا۔ اپنی لاٹھی چلاتا اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر

آگ کے تنور میں ڈالتا جاتا۔

بڑا ہوا تو لوگوں نے کہا اللہ نے تجھے پیدا کیا۔ پیدا ہونے کا مفہوم مجھ پر واضح نہ ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ ایسے پیدا نہیں کیا جیسے ماں کرتی ہے۔ تفصیلات کچھ ایسی تھیں کہ پیدا کرنے کا عمل ایک میکانکی عمل نظر آیا۔ ایک حکم نامہ جاری کیا گیا۔ کن ۔ ہو جا۔ اور سب کچھ ہو گیا۔ اس تفصیل کو میں غلط سمجھا۔ پیدا کرنے کی یہ تفصیل جو میں سمجھا، تعلق نہیں بلکہ بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اللہ کو جانے بغیر مانا۔ لیکن اللہ سے میرا کوئی مثبت تعلق پیدا نہ ہو سکا۔

جب میں شعور تک پہنچا تو اللہ کو جاننے اور سمجھنے کی بجائے میں اس پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ یہ ایسا کیوں بنایا۔ وہ ویسا کیوں بنایا۔ یہ کیا کیا۔ یہ تو عدل سے منافی ہے۔ وہ کیا کیا۔ وہ تو حق سے دور ہے۔

جوانی میں میں جج بن کر بیٹھ گیا۔ اپنے روبرو اللہ کو کھڑا کر لیا اور اس کی حکمتوں پر فیصلے سناتا رہا۔ یہ غلط کیا۔ وہ خیر ٹھیک سہی۔ لیکن وہ دوسرا بالکل غلط۔ یوں میں اللہ کو سکھاتا رہا کہ بنی نوع انسان سے اسے کیسا سلوک کرنا چاہئے۔

صرف میں ہی نہیں، وہ، آپ، ہم سب اللہ کے کاموں کو پرکھتے ہیں۔ ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اسے اپنی عقل کے تابع کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارا بس چلے تو ہم سکول ماسٹر کی طرح اسے عقل سکھائیں اور کوتاہی پر سوٹی اٹھا کر کہیں۔ نکال اپنا ہاتھ۔ یوں خالق اور مخلوق کا رشتہ ایک ہاتھ کی تالی کے مصداق رہا۔ خالق نے رشتہ جانا، نبھایا، مخلوق نے نہ جانا۔ جب جانا ہی نہیں تو نبھانا کیسا۔

حاضری

جب میں پہلی بار لاہور میں داتا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے شعور نہ تھا کہ میں کس کی خدمت میں حاضری دے رہا ہوں۔ مجھے داتا کے مفہوم کا علم نہ تھا۔

جو کچھ بھی میں اس کے متعلق جانتا تھا، اس سے یہ اخذ ہوتا تھا کہ وہ ایک بڈھا بابا تھا جو لاہور میں کسی دہلیز پر بیٹھا تھا۔ لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ ہندو مسلمان امیر غریب تندرست، بیمار۔ وہ اس سے مانگتے تھے۔ بابا دولت دے۔ بابا صحت دے۔ بابا اولاد دے

—— اور وہ دیتا جاتا تھا —— دیتا جاتا تھا۔ اس لئے وہ داتا بن گیا۔

مجھے یہ بات نہ سوجھی کہ وہ تو انسان تھا۔ انسان بے شک کچھ دے سکتا ہے سب کچھ نہیں دے سکتا۔ سب کچھ تو بادشاہ بھی نہیں دے سکتا۔ پھر وہ داتا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا شعور نہ تھا کہ اللہ کے حوالے کے بغیر کوئی داتا نہیں ہو سکتا۔ یہ وصف صرف اللہ کا ہے۔ پھر یہ علی ہجویری داتا کہلوانے والا کون ہوتا ہے۔ ضرور اس بڈھے فقیر نے اللہ کو ہائی جیک کر رکھا ہے۔ اللہ داتا گیری کرتا ہے۔ کام اس کا، نام اس کا۔

یہ جتنے بھی داتا مزاروں میں چھپ کر بیٹھے ہیں، یہ بڑے پر اسرار بندے ہیں۔ ان میں اور ہم میں صرف ایک فرق ہے۔ ہم نے اللہ کو صرف مانا ہے جانا نہیں۔ انہوں نے اسے جانا ہے، مانا ہے اور اس سے تعلق پیدا کیا ہے۔

میں اور توُ

اللہ سے تعلق پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ محبوب ہے، بڑا سخت گیر محبوب ہے۔ وہ ہر کسی کے گھر آنے کے لئے تیار ہے۔ صرف ایک شرط ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اپنا گھر صاف کرو۔ کوڑا کرکٹ جھاڑو۔ گھر کو لیپو پوتو۔ دیواروں کے جالے پونچھو۔ گھر میں فرشتر چھڑکو۔ غلاظت نہ رہے۔ غلاظت کی بو نہ رہے۔ اور اس کے نزدیک سب سے بڑی غلاظت "میں" ہے۔ وہ میں جسے ہم زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں۔ وہ میں جس پر ہم اپنی شوکت نفس استوار کرتے ہیں۔ وہ میں جسے ہم انفرادیت کی شان سمجھتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں اللہ کو صرف اس گھر میں آنا منظور ہے جہاں میں موجود نہیں یا جہاں سے میں کا سانپ تو نکل گیا ہے لیکن اس کی لکیر موجود ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اپنی میں کو تیاگ دے۔ میری میں اپنا لے۔

صاحبو یہ داتا لوگ جو دیکھنے میں نحیف و نزار نظر آتے ہیں، ہمت، جرأت اور برداشت کے لحاظ سے انسان نہیں بلکہ جن ہیں۔ ان میں "میں" کے قلعے کو ریزہ ریزہ کر کے زمین بوس کر دینے کی قوت موجود ہے۔ یہ داتا لوگ اپنی "میں" کے غبارے سے ہوا نکال کر اسے چھیچھڑا بنا دیتے ہیں۔

پہلے اپنی "میں" کی کھلڑی اتارتے ہیں پھر اسے کاٹ کر تندی بنا لیتے ہیں۔ تندی

کو سکھاتے ہیں پھر اکتارے پر چڑھا کر اسے بجاتے ہیں حتیٰ کہ "تو" کی آواز نکلنے لگتی ہے۔

پھر توتو کر کے یہ اسے بلاتے ہیں۔ جان من یہاں کوئی "میں" نہیں۔ یہاں توتُو ہی تو ہے اب تیری مرضی ہے چاہے آئے یا نہ آئے۔

یہ بابا لوگ اللہ کو بھی زچ کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے آ جانے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ پھر یہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کے حضور باادب بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کا نور سمیٹ کر اتنا قرب حاصل کر لیتے ہیں کہ میں اور تو میں فرق نہیں رہتا۔ اس کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے کانوں سے سنتے ہیں۔ اس کی زبان سے بولتے ہیں۔

الٰہی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

شکر ہے میرے اللہ کہ میں ان جان ہوں۔ میں نے تیرے ان بندوں کی عظمت و ہیبت کو نہیں سمجھا۔ شکر ہے۔ میرے مولا کہ آج تک تیرے رسولؐ کو صرف رحمتہ اللعالمین کے زاویئے سے دیکھا ہے عظیم انسان کے حوالے سے جانا ہے۔ ان کی عظمت و سربلندی پر غور نہیں کیا۔ شکر ہے میرے مولا کہ میں نے تیرے جملہ اوصاف پر نہیں بلکہ صرف رحیم اور کریم پر نظر رکھی ہے۔ تیری ہیبت پر نگاہ نہیں ڈالی۔ ورنہ تیری ہیبت کے خوف سے میری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ میرے گوشت کی پھپھوندیاں اڑ جاتی اور میں تحلیل ہو کر پھر سے عناصر میں مل جاتا۔

اس روز جب ہم امیر خسرو اور حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضری دینے جا رہے تھے تو مجھ احساس نہ تھا کہ میں کس کی خدمت اقدس میں خود کو پیش کرنے جا رہا ہوں۔ وہ کون ہستی ہے جسے میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہو رہا ہوں۔

سچی بات یہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کو سلام کرنے کے لئے حاضری دینے کو میرا جی نہیں مانتا تھا۔ سوچتا ___ میں کس منہ سے آپ کے سامنے جا کھڑا ہوں گا۔ کس منہ سے سلام عرض کروں گا۔ میں آپ کو سلام کرنے کے بہانے دلی گیا تھا۔ وہ ایک بہانہ تھا۔ مقصود نہ تھا۔

سلام عرض کرنے کے لئے لازم ہے کہ گھر سے نیت کر کے چلیں۔ میں گھر سے ہومیو پیتھی کی کتابیں لینے کی نیت سے آیا تھا۔ اب کس منہ سے میں حضرت کی خدمت میں جا کر عرض کروں کہ عالی جاہ میں آپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

اجازت:

۱۹۶۸ء میں جب ڈاکٹر عفت اور میں حج پر گئے تھے۔ تو مدینہ منورہ میں ہمیں ایک برگزیدہ خاتون ملی۔ ہم نے محترمہ سے احوال پوچھا۔

بولی — "بے شک میں حاضری دینے کی نیت سے آئی ہوں لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ انشاء اللہ دوبارہ حاضری دینے آؤں گی۔"

ہم نے پوچھا۔ "کیا اس حاضری میں کوئی سقم رہ گیا ہے جو آپ پھر حاضری دینے کی نیت رچائے بیٹھی ہیں"

بولی — "ہاں۔ میری یہ حاضری۔ حاضری نہ بن سکی"

"وہ کیسے محترمہ!" ہم نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "حاضری میں صرف نیت کر کے آنا ہی کافی نہیں۔ حاضری وہ ہوتی ہے کہ نیت کر کے آؤ۔ لیکن اجازت ملنے کے بغیر واپس نہ جاؤ۔ آتے وقت میں نے صرف حاضری دینے کا ارادہ کیا تھا۔ رخصتی کی اجازت کے متعلق نہ سوچا تھا۔ انتظام نہ کیا تھا اب میں واپس جانے پر مجبور ہوں۔ لہٰذا پھر سے حاضری دوں گی"

"کیا رخصت ہونے کی اجازت مل جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں"۔ وہ بولی۔ "اگر اس نیت سے کوئی خدمت اقدس میں بیٹھا رہے کہ رخصت کی اجازت ملے گی تو جاؤں گا۔ تو ضرور ملے گی"۔

میں نے حیرانی سے محترمہ کی طرف دیکھا۔ اور محسوس کیا کہ محترمہ کو حاضری اور حضوری دونوں کا شعور ہے۔ اور اس عالی مرتبت شخصیت کا بھی شعور ہے. جس کی خدمت میں یہ حاضر ہے۔

حضرت امیر خسرو کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ بہت

بڑے فنکار ہیں۔ گنیؔ ہیں، ادیب ہیں، شاعر ہیں، دانشور ہیں۔ اور اپنے مرشد کے پروانے ہیں۔

اللہ کے حوالے سے میں نے ان کو نہ جانا تھا اور اللہ کے حوالے کے بغیر کسی صوفی کو سمجھنا ممکن نہیں۔ صوفیا کرام چاند کے مصداق ہوتے ہیں۔ سورج کی روشنی پڑے تو روشن، نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ وہ بشری روشنیاں بجھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں کی قندیل توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے گھر میں گھپ اندھیرا کر لیتے ہیں۔ اور پھر آس لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اے روشن کرنے والے تیری روشنی کے طالب ہیں۔ تیری مرضی ہے روشن کر دے یا نہ کر۔ ہم نے بتیاں گل کر دیں۔ اب تیری روشنی کے طالب ہیں۔

علامہ اقبالؒ

مجھے علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری دینے کا فخر حاصل ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے۔

پتہ نہیں مجھے کون ساتھ لے گیا تھا ورنہ شاید میں خود سے کبھی جانے کی نہ سوچتا۔

اس زمانے میں میں بی اے کا طالب علم تھا۔ میرے نزدیک اقبال ایک بڑا شاعر تھا، فلسفی تھا، مفکر تھا۔ مجھے شعور تھا کہ میں ایک بڑے شاعر، مفکر اور فلسفی کی خدمت میں حاضری دینے جا رہا ہوں۔ اس زمانے میں مجھے ذاتی طور پر ادب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اقبال سے مل کر میں بہت مایوس ہوا۔ ان کا انداز شاعرانہ نہ تھا۔ شاعرانہ انداز کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ شاعرانہ شخصیت کا ایک الگ رنگ ہوتا ہے جو دور سے پہچانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں میں نے کئی ایک شاعروں کو خاصا قریب سے دیکھا تھا۔ مثلاً مجید ملک تھا، تاثیر تھا، صوفی تبسم تھا، حفیظ تھا، بشیر سیمابی تھا، ساغر سیمابی تھا، خود سیماب اکبر آبادی تھا۔

ان سب کی شخصیتوں میں شاعرانہ جھلک واضح تھی۔ علامہ اقبال میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میرے روبرو ایک نحیف و نزار اور شدت سے بے چین مضطرب آدمی لیٹا ہوا تھا۔ ان کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے اندرونی طور پر کسی شدید آندھی کی زد میں آیا ہوا مٹی کا دیا

ہو۔ وہ خود کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ فلسفی اور مفکر تو اس وقت ابھرتا ہے جب دریا سو رہا ہو اور کشتی آپ ہی آپ یوں چلی جا رہی ہو جیسے مکھن میں چاقو چلتا ہے۔

ان دنوں مجھے علم نہ تھا کہ علامہ اقبال کو نہ تو علم کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے نہ شاعری کے حوالے سے، نہ فلسفہ و فکر کے حوالے سے۔ یہ بوٹا کسی اور حوالے سے ہرا بھرا تھا۔ شعر اور فکر تو اس بوٹے کے پھل پھول تھے۔

عظیم پلان

اللہ کے ان پر اسرار بندوں کے کئی ایک سلسلے ہیں۔ کچھ ظاہر ہیں۔ کچھ گپت ہیں۔ ایک کو غزنی میں حکم ہوتا ہے کہ اٹھ عازم سفر ہو اور لاہور میں جا کر بیٹھ جا۔ وہ کہتا ہے عالی جاہ لاہور میں تو پہلے سے ہی یعقوب زنجانی متعین ہیں۔ حکم ملتا ہے کہ تم تعمیل کرو۔ جب وہ لاہور پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یعقوب زنجانی کا جنازہ جا رہا ہے۔

اللہ کے یہ پر اسرار بندے حکم کے پابند ہیں۔ ایک کو حکم ہوتا ہے کہ جا سائلوں کی جھولیاں بھرتا جا۔ جا کھل کھیل۔ ایک کو حکم ہوتا ہے کہ جا ویرانے میں جا بیٹھ۔ لوگوں سے دور رہ۔ اکیلا تن تنہا۔ ایک کو حکم ہوتا ہے کہ جا ہمارے قصیدے گا۔

اللہ کے ان پر اسرار بندوں کا ایک سلسلہ ایسا بھی ہے جو علم و ادب کو اپناتا ہے۔ شعر و سخن کی بتیاں روشن کرتا ہے۔ مثلاً مولانا رومی تھے۔ شیخ سعدی تھے۔ علامہ اقبال تھے۔

حضرت امیر خسرو بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو رنگ دینے کے لئے۔ اس رنگریز کے دوار تک پہنچانے کے لئے جنہیں حضرت نظام الدین اولیاء کہتے ہیں، امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین کو بلخ سے عازم ہند کیا گیا۔ چنگیز خان کے ظلم و ستم کو اس ہجرت کا بہانہ بنایا گیا۔

امیر سیف الدین ہند پہنچے۔ اور دلی کے قرب و جوار میں ایک گاؤں میں جس کا نام پٹیالی تھا، آ بسے۔

آپ کے والد کو دلی لانے کے لئے التمش کو سیف الدین کی طرف متوجہ کیا گیا۔ التمش نے آپ کو مشیر خاص بنا لیا۔ دلی کے ایک بزرگ عماد الملک نے اپنی بیٹی کا سیف الدین

سے نکاح کر دیا۔

یوں ابو الحسن یمین الدین تولد ہوئے جو بعد میں امیر خسرو کے نام سے مشہور ہوئے۔

چار سال پٹیالی میں پرورش پائی پھر دلی آ گئے۔

باپ نے خطاطی سیکھنے کے لئے مکتب بھیج دیا۔ مکتب میں آپ قافیہ ردیف کے چکر میں پڑ گئے۔ زلف اور خال کے تصور میں مگن رہنے لگے۔ شعر گوئی آپ کا مقدر بن گیا۔ چونکہ شعر و سخن کے حوالے سے حضور نظام الدین کی خدمت میں پہنچنا تھا۔

صاحبو! اللہ بہت بڑا پلینر PLANNER ہے اور یہ کائنات ایک عظیم پلان ہے۔

میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ امیر خسرو ایک مفکر تھے۔ شاعر تھے۔ گائک تھے۔ دانشور تھے۔ شہنشاہوں کے درباروں میں منظور نظر تھے۔ مرشد کے دوار پر خود کو خس و خاشاک کے مصداق جانتے تھے۔ میری نظر میں ان کی عظمت فن کے حوالے سے نہ تھی فکر کے حوالے سے نہ تھی. درباری قدر و منزلت کے حوالے سے نہ تھی. مرشد کے در پر "میں تو کچھ بھی نہیں" کے حوالے سے تھی۔ نام کے امیر تھے۔ شاید یہ نام اور درباری حاضری ان پر عائد کر دی گئی ہو۔ دربار میں ڈیوٹی لگی ہو۔ بادشاہوں پر اثر انداز ہونے کی ڈیوٹی۔ یا شاید بادشاہوں کو حضور کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہو۔ قدرت کی رمزیں کس نے جانی ہیں۔

اس وقت ہم غیاث پور کی بستی میں کھڑے تھے۔ یہ بستی حضرت نظام الدین اولیاء نے آباد کی تھی۔ جب آپ پاک پٹن میں آستانہ فرید سے خلافت پا کر فارغ ہوئے تو مرشد نے فرمایا۔ نظام اب تو عازم دلی ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسا سایہ دار درخت بنائے گا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر لوگ آرام پائیں گے۔

حضرت نظام الدین نے آ کر دلی سے تین میل دور غیاث پور میں قیام کیا تھا۔ چند ہی سالوں میں آپ کی برکت سے غیاث پور ایک روحانی بستی بن گئی۔

اس وقت اس بستی پر مفلوک الحالی چھائی ہوئی تھی۔ اداسی. ویرانی. بد حالی۔

ہم روضہ مبارک کی طرف چل پڑے۔ دروازے میں داخل ہوئے۔ آگے ایک

تنگ سی گلی تھی۔ اس کے دونوں جانب بیٹھے بیٹھے گھروندے تھے یا پتہ نہیں کیا تھے۔

متولی

یا اللہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ اتنی عظیم خانقاہ۔ اتنے عظیم بزرگ کو تنگ گلیوں اور گھروندوں میں کیوں مقید رکھا ہے۔

اس سے پہلے دو ایک بار مجھے حضرت کے مزار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس زمانے میں میں طالب علم تھا۔ میرے ماموں دلی میں ملازم تھے۔ دو ایک بار ماموں سے ملنے گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ماموں مجھے روضہ مبارک پر لے کر گئے تھے تو وہ جگہ بڑی فراخ تھی۔ کھلی۔ کشادہ۔ شگفتہ۔ روضہ مبارک پر جا کر مجھے احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک مزار ہے۔ مجھے ایسے لگا تھا جیسے دربار ہو۔ کسی شاہ کی خدمت میں آ کھڑا ہوا ہوں۔

وہ فراخی اور شگفتگی جو داتا دربار میں ہے۔ پاک پٹن میں بابا کے مزار پر ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے بڑے دربار کو تنگ گلیوں نے کیوں گھیر رکھا تھا۔ کیا یہ متولیوں کا چمتکار تو نہیں۔

شاید انہوں نے پیسے کے لالچ میں گرد و نواح کی زمین کو ٹکڑوں میں بانٹ کر بیچ دیا ہو۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ اتنے عظیم۔ اتنے طاقتور بزرگ۔ متولیوں کے سامنے اتنے زچ کیوں ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کی خانقاہوں پر متولی وہ دھول اڑاتے ہیں۔ وہ دھاندلیاں کرتے ہیں کہ حد نہیں اور یہ اللہ کے برگزیدہ بندے اف نہیں کرتے۔

میں نے لاہور میں داتا صاحب کے مزار اور اس کے گرد و نواح میں متولیوں کو ایسی ایسی گستاخیاں کرتے دیکھا ہے جن کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔ خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ متولیوں نے دربار میں نامناسب حرکات کیں۔

داتا یہ سب دیکھتے رہے، مسکراتے رہے۔ یا اللہ یہ داتا لوگ کسی مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔

لیڈر صاحب اس وقت سب سے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس وقت ان کی کیفیت یوں تھی جیسے کسی برات کے دولہا ہوں۔ ان کے انداز سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ انہیں شعور ہے کہ وہ کس عظیم ہستی کی خدمت میں حاضری دینے جا رہے ہیں۔ یہ عالم لوگ لوگوں کو وہ ہدایت دینے والے لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ خود بھی ہدایت کے محتاج ہیں۔ عالم لوگ بھول جاتے ہیں کہ ان کا علم مکمل نہیں، ناقص ہے۔ اس میں سقم ہیں۔

وہ ایک چار دیواری میں داخل ہو گئے ان کے پیچھے سبھی زائرین تھے۔ چار دیواری میں چکر لگا کر وہ باہر نکل گئے۔ میں وہاں حیران کھڑا رہا۔ یا اللہ یہ کیسی جگہ ہے جہاں کوئی قبر نہیں، کوئی مزار نہیں۔

ایک زائر ہنسا۔ بولا۔ "کیا ڈھونڈ رہے ہو بھائی۔ یہ قوالی خانہ ہے۔ یہاں قوال بیٹھتے ہیں۔ ادھر سامعین۔ جلدی چلو۔ جلدی چلو۔ جتھہ مزار مبارک پر پہنچ چکا ہو گا"۔ جب میں مزار مبارک پر پہنچا تو لیڈر صاحب مزار شریف میں داخل ہو رہے تھے۔ "چلو چلو"۔ پیچھے سے آواز آئی۔ مجبوراً میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک کونے میں آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہے مگر ایسا ہے کہ میں کسی بلند و برتر شخص کی خدمت میں ہجوم کے ساتھ حاضری کا احساس پیدا نہیں کر سکتا۔

میری خواہش ہوتی ہے کہ حاضری کا احساس طاری ہو۔

یوں کہ ایک وہ ہوں اور ایک میں ہوں۔ باقی سب معدوم ہو جائے۔ کائنات میں کچھ باقی نہ رہے۔ ایک عظیم خلاء۔ ایک وہ بلند و برتر اور ایک میں عجز سے چور چور۔

متکلم دعا

اسی وجہ سے اس بھیڑ میں میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور چاروں طرف ایک خلاء طاری کر لیا۔ وہ در و دیوار ناپید ہو گئے۔ وہ بستی تحلیل ہو گئی۔ نہ دلی رہی نہ ہند رہا۔ ایک امیر، پاکیزہ، منور، بلند و بالا۔ ایک گندہ غلیظ، میلا، نا قابل، نا اہل۔

میں نے عرض کی۔ "حضرت ...."

عین اس وقت لیڈر صاحب کی بارعب اور کراری آواز گونجی ــــ سارا طلسم ٹوٹ

گیا۔

لیڈر دعا کر رہے تھے۔

یا اللہ! اتنی متکلم دعا۔ اس قدر گرج دار آواز میں دعا۔ کیا انہیں پتہ نہیں کہ دعا تو مانگ ہوتی ہے۔ دعا مانگنے کے لئے منگتا بننا پڑتا ہے۔ منگتا کیا اس سر تال سے مانگتا ہے۔ اتنے تیور سرجن میں مدھم کا نشان تک نہیں یہ مانگنے والے کی آواز تو نہیں۔ مجھے تو ایسے لگا جیسے وہ دینے والے کی آواز ہو۔

اول تو مانگ کو آواز سے تعلق ہی نہیں۔ جتنی مانگ سچی ہو دل سے ہو۔ اتنی آواز مدھم ہو جاتی ہے۔ جب عجز سے بھیگ جاؤ۔ بے بسی اور لاچاری کا احساس دل اور جسم کے انگ انگ سے پھوٹ بہے. وہ عالم دعا کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ اس وقت انسان بے آواز ہو جاتا ہے۔ زبان ساکت ہو جاتی ہے نطق معطل ہو جاتا ہے۔ ہونٹ پھڑ پھڑاتے ہیں۔ آواز پیدا نہیں کرتے۔ تکلم ڈوب کر دل میں جا ٹکتا ہے۔ پھر دل سے آواز نکلتی ہے۔ عاجزی میں ڈوبی ہوئی بے آواز. آواز۔ منگتا مانگتا ہے۔ دینے والا سنتا ہے۔ نطق کی اس شورا شوری میں کون سنتا ہے بھلا۔ اللہ کی بات چھوڑیئے وہ تو مالک ہے. آقا ہے. خالق ہے۔

انسان سے بھی مانگو تو کراری آواز نہیں چلتی۔ کوئی دینے والا پسند نہیں کرتا کہ کوئی ڈانٹ کر مانگے۔ کڑک کر مانگے۔ دھمکا کر مانگے۔

لیکن نہیں ـــــ میں معافی چاہتا ہوں وہ تو قادر مطلق ہے۔ میری کیا حیثیت ہے کہ اس پر یہ اصول عائد کردوں کہ کڑک کر مانگنے والے کی نہ سن۔ وہ تو بادشاہ ہے۔ کائنات کا بادشاہ۔ چاہے تو ڈانٹ کر مانگنے والے کی جھولی بھر دے چاہے تو رو رو کر مانگنے والے کی ان سنی کر دے۔

یہ تو میرے اندازے ہیں کہ مالک کے حضور بندہ بن کر کھڑے ہونا لازم ہے۔ دینے والے کے حضور کھڑے ہو کر منگتا بننا ضروری ہے۔

لیڈر صاحب کی دعایوں گونج رہی تھی جیسے منہ زبانی ہو۔ جیسے زبان کے علاوہ اسے کسی عضو سے تعلق نہ ہو۔ وہ تو کتابی دعا معلوم ہو رہی تھی۔ لفظ ہی لفظ. لفظ ہی لفظ۔ لفظوں کا ایک طوفان چل رہا تھا۔ جذبے سے خالی لفظ۔ جیسے لیڈر دعا نہیں مانگ رہے تھے

بلکہ کڑاکے دار ریوڑیاں چبا رہے تھے۔

پھر وہ ساری دنیا کے محتاجوں کی بات کر رہے تھے۔ سای دنیا کے بیماروں کی سفارش کر رہے تھے۔ ساری دنیا کے بے ہدائتوں کو نواز رہے تھے۔ کشمیر کی بات کر رہے تھے۔ اسرائیل کی بات کر رہے تھے۔

میرا مسئلہ۔ تیرا مسئلہ

یہ سن کر میں تو گھبرا گیا۔ میں تو ایک عام آدمی ہوں۔ میں تو ذاتی تکلیف دور کرنے کے لئے دعا مانگ سکتا ہوں۔ اپنی بیماری سے چھٹکارہ پانے کے لئے منت کر سکتا ہوں۔ مجھے ساری دنیا کے محتاجوں سے کیا تعلق۔ یا اللہ یہ کائنات تیری ہے۔ یہ دنیا تیری ہے۔ ساری دنیا کے بیماروں کو شفا دینا تیرا مسئلہ ہے۔ ساری دنیا کے بے ہدائتوں کو ہدایت دینا تیرا کام ہے۔ ہدایت دے یا نہ دے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں تو صرف اپنی ذات کے لئے منگتا ہوں۔ باری تعالیٰ مجھے ہدایت دے۔ اپنے فضل و کرم سے مجھے کسی کا محتاج نہ کر۔ میری بیماری دور کر دے۔ تو شفا دینے والا ہے۔ جب تک مانگ اپنی ذات سے متعلق نہ ہو اس میں جذبہ کیسے شامل ہو سکتا ہے۔ دل اور روح کیسے ساتھ دے سکتے ہیں۔ بے شک ماں بچے کے لئے مانگ سکتی ہے۔ بابر ہمایوں کے لئے مانگ سکتا تھا۔ بہن بھائی کے لئے مانگ سکتی ہے لیکن ساری دنیا کے بیماروں کے لئے شفا کیسے مانگی جا سکتی ہے۔

منگتا

ساری دنیا کے لئے مانگنا مجھ ایسوں کا نہیں داتاؤں کا کام ہے۔ بزرگوں کا کام ہے۔ کہیں لیڈر خود کو بزرگ تو نہیں سمجھ رہے۔ نہیں بزرگ بھلا بھیڑ میں مانگتے ہیں۔ بزرگ کیا لفظوں کے بنٹے کھیلتے ہیں۔ ایسی رٹی رٹائی بنی بجی دعا مانگتے ہیں جو مداری کی ڈگڈگی کی طرح بجے اور سامعین کہیں واہ. کیا دعا مانگی ہے۔

میں ہکا بکا کونے سے لگا کھڑا تھا۔ لیڈر کی دعا یوں چھک چھک کرتی چل رہی تھی جیسے ایکسپریس ٹرین ہو۔ اس چھکا چھک سے دھول اڑ رہی تھی۔ مزار مبارک پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ آواز کے اس طوفان نے میرے دل کے پٹ بند کر دیئے تھے۔ دل جذبات سے

پہلے تو میں سمجھا پتہ نہیں کسے اشارے کر رہا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ مجھے بلا رہا ہے۔

"جلدی کرو جلدی"۔

"کیوں کیا ہوا"۔ میں نے پوچھا۔

"جلدی کرو۔ لیڈر صاحب حضرت نظام الدین کے مزار میں پہنچ چکے ہیں۔ وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے والے ہیں"۔

"تو اٹھالیں۔ میں کیا انہیں منع کرتا ہوں"۔

"نہیں نہیں" ـــ وہ چلایا۔ "اگر آپ نے دیر کی تو دعا میں شرکت سے محروم رہ جائیں گے"۔

الحمدللہ ـــ میں نے دل میں کہا۔ پھر باآواز بلند بولا۔ "چلئے چلئے جلدی چلئے"۔

"میں آ رہا ہوں"۔ اسے یقین دلانے کے لئے میں نے دو چار لمبے لمبے ڈگ بھرے یوں جیسے پلیٹ فارم پر بھرتے ہیں کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ وہ مجھے حرکت میں دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور حضرت کے مزار مقدس کی طرف بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں نے رفتار کم کر دی اور دل ہی دل میں دعا مانگتے لگا۔ یا اللہ مجھے اس متکلم دعا سے محفوظ رکھ۔

جی میں مزار مبارک پر پہنچا تو اندر سے چھکا چھک میل گاڑی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ متکلم دعایوں ٹن ٹن بول رہی تھی جیسے کولہو کے بیل کے گلے کی گھنٹی بج رہی ہو۔

پھر دفعتاً مزار مبارک کے سنگ مرمری صحن کے ایک کونے سے ایک لے بھری آواز اٹھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ارے یہ کیا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وجدانی دعا

میرے روبرو آٹھ دس آدمیوں کا ٹولہ کھڑا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ سر جھوم رہے تھے پاؤں ٹھمک رہے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں کھڑتال تھے جنہیں وہ وجدانی کیفیت میں بجا رہے تھے۔ ماتھے پر شنگرفی تلک لگے ہوئے تھے۔ سر منڈے ہوئے تھے نیچے دھوتیاں ننگی ہوئی تھیں۔

خالی تھا۔ اس ظالم آواز نے مجھے زچ کر رکھا تھا۔

لیڈر خود تو امیر خسرو کی خدمت میں نہیں کھڑے تھے مجھے بھی ان کی خدمت میں کھڑے ہونے سے محروم کر رکھا تھا۔ اور صرف مجھے ہی نہیں سارے زائرین کو محروم کر رکھا تھا۔ وہ اس متکلم دعا کی طرف اس قدر متوجہ تھے کہ انہیں احساس ہی نہ تھا کہ وہ کس کے سامنے حاضر ہیں۔

بارے وہ دعا ختم ہوئی اور لیڈر یوں چھاتی نکال کر باہر نکلے، جیسے میاں واو سنچری بنا کر گراونڈ سے باہر نکل رہا ہو۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ امیر کے دربار میں منگتا بن کر کھڑا ہو جاؤں لیکن مزار کے ماحول میں ابھی تک اس دعا کا تشدد لہریں لے رہا تھا۔ میں نے ایسے محسوس کیا جیسے امیر خود اس کوفت سے تھک کر پہلو بدل کر لیٹ گئے ہوں۔ مجھ میں ہمت نہ پڑی کہ امیر کو مزید آزردہ کروں لیکن میں تو ذات کا منگتا ہوں۔ ہر وقت دینے والے کے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھتا ہوں۔ میں کب امیر کے دوار سے مانگے بغیر ٹلنے والا تھا۔ میں نے کہا اے صاحب قلم امیر تجھے نظام نے بخشا تھا تو مجھے بخش دے۔ اے رنگ میں ڈوبے ہوئے درویش تجھے رنگ ریجوانے رنگا تھا۔ تو مجھے رنگ دے۔ ایسے کہ

دھوبیہ دھوئے جائے ساری عمریا

کائیں، قائیں

معاً "دیوار پر بیٹھا کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ پتہ نہیں ابھی مجھے کیا کیا مانگنا تھا۔ اس ظالم کوے نے شور مچا کر دھول اڑا دی۔ پہلے لیڈر صاحب کی کائیں کائیں نے دھول اڑائی تھی اب کوے کی کائیں کائیں گونجی۔ میں دوڑ کر مزار مبارک سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر کوے نے اور زیادہ شور مچایا۔ کائیں کائیں کی بجائے قائیں قائیں کرنے لگا۔ دفعتاً مجھے ایسے لگا جیسے وہ مجھ پر قہقہے لگا رہا ہو "احمق دھوت کالے کو کون رنگے" میں پھر سے امیر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ ہاں میں دھوت کالا ہوں۔ لیکن عالی جاہ تو بھی تو وہ رنگریز نہیں جو صرف چٹے کو رنگ سکے۔

"آ جاؤ آ جاؤ"۔ ایک زائر دور کھڑا چلا رہا تھا۔

یا اللہ یہ کون ہیں۔ یہ کیسا ٹولہ ہے۔ نجام کے دوار پر ہندو پجاری۔

وہ دف بجا بجا کر محبوب الٰہی کو منا رہے تھے۔ ان کے انداز میں کتنا عجز تھا۔ کس قدر وجدانی کیفیت تھی۔ یہ آواز اس آواز سے کس قدر مختلف تھی جو مزار کے اندر سے دعا کے روپ میں گونج رہی تھی۔ اس میں لگن تھی۔ سرشاری تھی حوالگی تھی۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کھڑتالی ٹولے کے ساتھ شامل ہو جاؤں اور نجام جی کو ناچ ناچ کر مناؤں۔ اس رنگ پچکاری والے رنگر یجوا کے بل بل جاؤں۔ پھر جب ناچ ناچ کر تھک جاؤں تو ہاتھ جوڑ کر اس کے دوار پر جا کھڑا ہوں۔ جے ہو مہاراج کی جے ہو۔

"بجھو دے موری کاری چنریا"

میرا جی چاہ رہا تھا کہ پرار تھنا مدہوشی میں ڈوب جائے۔ مدہوشی پرار تھنا میں ڈوب جائے اور آخر میں مدھم سرگوشی میں کہوں "ہے مہاراج جیسا امیر کو قلم دیا ہے ویسا مجھے بھی دے دے۔ یہ نہ دیکھ کہ بھکاری حقدار ہے یا نہیں۔ یہ نہ دیکھ کہ منگتا ٹھیک طرح مانگ رہا ہے یا نہیں۔ داتا دیکھتے نہیں، دیئے جاتے ہیں دیئے جاتے ہیں"

دفعتاً ایک آواز ابھری، سریلی. گہری، گمبھیر

دیون ہار موری جھولی بھر دے

ایک بھکشو داخل ہو کر باآواز بلند گا کر پرار تھنا کر رہا تھا۔ بھکشو کی تان سن کر کھڑتالی ٹولے میں گویا از سر نو جان پڑ گئی۔ ان کے وجدان میں چنگاری گری۔ تال چڑھی۔ لے بڑھی اور اک دھما چوکڑی شروع ہو گئی۔

میرا جی چاہا کر یا علی کہہ کر چھلانگ ماروں اور اس ٹولے میں شامل ہو کر دھمال ناچوں۔

رجسٹر ہی رجسٹر

پتہ نہیں کب تک میں وہاں ناچتا رہا، ناچتا رہا، ناچتا رہا۔ پھر جو مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ حضرت کے دوار کے پاس بیٹھا ہوں اور میرے ارد گرد دو شخص رجسٹر اٹھائے کھڑے ہیں۔

یا اللہ یہ دونوں میرے سامنے اپنے اپنے رجسٹر کیوں بڑھا رہے ہیں۔

ایک بولا۔ ہمارے رجسٹر میں دستخط فرمایئے۔

دوسرے نے اپنا رجسٹر بڑھایا۔ جناب ہمارے رجسٹر میں دستخط فرمایئے۔

میں حیران ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دفعتاً میرے دستخط اتنے اہم کیوں ہو گئے۔

زندگی بھر کسی نے میرے دستخطوں کو اہمیت نہ دی تھی۔ میرا تو بنک میں اکاؤنٹ تک نہ تھا پھر دستخطی اہمیت کیسی۔ دفتر میں کبھی وہ عہدہ نہ ملا تھا جو اہمیت رکھتا ہو۔

میں نے اٹھ کر ان دونوں سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ سوچا کہ ادھر بھاگ جاؤں۔ عین اس وقت ادھر سے دو اور رجسٹر بردار نمودار ہوئے اور میری طرف آگے بڑھے۔ یااللہ یہ رجسٹروں کا کیا بھید ہے۔ یہ دستخطوں کے مطالبے میں کیا راز ہے۔

اتنے میں اشفاق حسین داخل ہوا اور بآواز بلند کہنے لگا۔

”اب آؤ گے بھی یا نہیں“۔

میں اٹھ بھاگا۔

پیچھے وہ چاروں رجسٹر بردار تھے۔

”صاحب دستخط تو فرما جایئے“۔

”صاحب دستخط تو فرما جایئے“۔

مہر ولی

لاہور میں ایک بابا جی رہتے ہیں۔ پتہ نہیں ان کا نام کیا ہے۔ لوگ انہیں شاہ بابا کہتے ہیں۔ چرا بہت نورانی ہے۔ انداز بے حد متحمل۔ بولتے نہیں سنتے ہیں۔ اس قدر غور سے سنتے ہیں کہ بات کہنے والا بات کہہ کر یوں اطمینان محسوس کرتا ہے جیسے بات کہہ دینا ہی کافی ہو۔ بیمار اپنی کیفیت بیان کرنے کے بعد یوں محسوس کرتا ہے جیسے افاقہ ہو گیا ہو۔ نہ دوا کی ضرورت رہی ہو نہ دعا کی۔ شاہ بابا ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مسکراہٹ بڑی دلنشیں ہے شاید اس لئے کہ اس میں بڑی معصومیت ہوتی ہے۔

ترو تازہ بابا

مجھے شاہ بابا کی ایک خصوصیت بے حد پسند ہے۔ اگر ڈاکو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہیں شاہ بابا۔ آج رات ہمارا ارادہ ہے کہ شہر میں ڈاکہ ڈالیں۔ آپ ہمارے لئے دعا کریں تو بھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتے۔ منہ سے منع کرنے کی بات الگ رہی۔ انکے چہرے پر بھی کوئی ایسی تبدیلی واقعہ نہیں ہوتی جس سے پتہ چلے کہ بات ناگوار خاطر ہے۔ جواب میں یوں مسکرا دیتے ہیں. جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

کوئی کہتا ہے کہ شاہ بابا میں اپنی منگیتر کو اغوا کرنے جا رہا ہوں۔ آپ دعا کریں۔ شاید بابا مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی کبھار بولتے ہیں۔ عام طور پر مسکرانے پر ہی گزارہ کرتے ہیں۔

شاہ بابا سے میرا تعارف اشفاق احمد نے کرایا تھا۔ ایک دن اشفاق احمد کہنے لگا "چلو مفتی تمہیں ایک پھول دکھائیں"۔

"پھول۔۔ بھئی پھول تو میں طرح طرح کے روز دیکھتا ہوں۔ اسلام آباد میں رہتا ہوں نا"۔ میں نے کہا۔

"یہ پھول ایسا ہے کہ مرجھاتا نہیں۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"گزشتہ چھ مہینے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ ترو تازگی بڑھتی ہی جا رہی ہے"۔

"کوئی لڑکی ہے کیا" میں نے سرگوشی کی۔

"لڑکی"۔۔ وہ قہقہہ مار کہ ہنسا۔ بولا۔ "آج کی لڑکی تو توجوانی ہی میں مرجھائی ہوتی ہے پچکے ہوئے رخسار۔ زرد رنگ ہڈیاں نکلی ہوئیں۔"

عورت کے معاملے میں اشفاق احمد کا ریسیور بالکل ہی خراب ہے یا سرے سے ہے ہی نہیں۔

وہ تو شکر ہے بانو بول اٹھی "مفتی جی! اک بابا ہے۔ شگفتہ بابا۔"

"نہیں میں نہیں مانتا" میں نے کہا۔ "بابے تو سوکھے سڑے ہوتے ہیں ان میں ترو تازگی کہاں سے آئی"

"غلط" اشفاق احمد نے کہا۔ "نور بابا سے ملایا تھا نا تمہیں۔۔ کتنا ترو تازہ تھا"

"دیکھنے میں تھیلا میلا۔ سنو تو تازگی ہی تازگی"۔

"بانو اسے سمجھاؤ یار" میں نے بانو قدسیہ کا سہارا لیا۔ "یہ اللہ کے بندے ترو تازہ ہو سکتے ہیں کیا۔ ساری ترو تازگی تو "میں" کی وجہ سے ہوتی ہے۔ "میں" ہی سے رنگ و روغن ہے۔ اگر شوکت نفس نہ ہو تو ترو تازگی کیسی اور اللہ میاں تو نفس کے بیری ہیں۔ کہتے ہیں اسے یکسر ختم کر دو۔ شوکت نفس کے احساس سے بیگانہ ہو جاؤ پھر مجھ سے بات کرو"

بانو مسکرانے لگی۔ بانو بولتی کم ہے صرف مسکرا دیتی ہے۔ بحث میں نہیں پڑتی۔

کہتی ہے بحث میں پڑنے کی نسبت تو کہیں بہتر ہے کہ کانٹوں والی باڑ میں جا گھسو۔

اشفاق احمد اٹھ بیٹھا۔ بولا۔ ”مفتی جی اب تو لازم ہو گیا کہ تمہیں شاہ بابا سے ملواؤں۔ اس بابے کا رنگ ہی نرالا ہے۔ شوکت نفس کا نشان نہیں۔ ”میں“ کی جگہ تو ہی تو ہے۔ پھر بھی تر و تازہ ہے۔ یوں جیسے پھول کھلا ہو۔ نقطہ نظر میں بھی، بشرے میں بھی. فکر میں بھی“۔

خار کھا کر اشفاق احمد مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر لے گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد درختوں کے ایک جھنڈ تلے اس نے گاڑی روک دی۔ ہم نیچے اترے۔ درختوں کے جھنڈ تلے ایک گھروندہ سا تھا۔ اس کے سامنے ایک چارپائی پر کوئی شخص بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

ازلی اکیلا

وہ میری شاہ بابا سے پہلی ملاقات تھی۔

میں نے اشفاق احمد سے کہا ”یار یہ تو اکیلا بیٹھا ہے“

”ہاں“ وہ بولا۔ ”یہ تو ازلی اکیلا ہے“

”لیکن بابے تو اپنے گرد میلہ لگائے رکھتے ہیں“۔

”جبھی تو کہہ رہا ہوں۔ یہ بابا منفرد ہے۔ پتہ نہیں اس کے پاس کیا جادو ہے۔ یہ بھیڑ لگنے نہیں دیتا“۔

”لوگ اسے جانتے نہیں ہوں گے“ میں نے کہا۔

”جانتے ہیں“۔ اشفاق احمد مسکرایا۔ ”اچھی طرح جانتے ہیں“

”پھر جمگھٹا کیوں نہیں کرتے“

”کرتے ہیں“

”پھر اکیلا کیوں ہے“

”لوگ آتے ہیں۔ جمگھٹا کرتے ہیں لیکن جلد ہی اٹھ کر چلے جاتے ہیں“

”یہ کیسے ممکن ہے کہ حاجت مند اٹھ کر چلے جائیں“ میں نے پوچھا۔

”یار اس کے پاس کوئی ایسی کلام ہے کہ لوگوں کو پاس بیٹھنے نہیں دیتا“ اشفاق احمد

نے کہا۔

" تجھے کلام کی کیا خبر۔ کلام بڑی طاقت ور چیز ہے" اشفاق احمد ہنسا۔

ہند جانے سے چھ مہینے پہلے میں دوسری بار شاہ بابا سے ملا۔

شاہ بابا سے ملنا ایک ہاتھ سے تالی بجانے کے مترادف تھا۔ جب ہر بات کا جواب خالی مسکراہٹ ہو تو انسان کب تک بولتا رہے۔

نتیجہ یہ تھا کہ اشفاق احمد اور میں شاہ بابا سے ملنے جاتے۔ ان کے پاس بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ مسکرا مسکرا کر شاہ بابا کی "وراچھیں" پک جاتیں پھر، ہم واپس گھر آ جاتے۔

ہند آنے سے دو تین مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہند جانے کا ہم نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔ اشفاق احمد مجھے شاہ بابا کے پاس لے گیا۔ بابا کے پاس بیٹھ کر ہم آپس میں حسب دستور باتیں کرتے رہے۔

پیغام سلام

اشفاق احمد نے کہا " یار سنا ہے تم نے وہاں ایک اللہ واسطے کا ہسپتال کھول رکھا ہے "

" ہاں کھول رکھا ہے " میں نے جواب دیا۔

" لوگوں کو شفا بھی ہو رہی ہے کیا۔ " اشفاق احمد نے پوچھا۔

" ہم نے اللہ میاں سے معاہدہ کر لیا ہے " میں نے جواب دیا۔

شاہ بابا کی آنکھ میں چمک لہرائی۔

" کیسا معاہدہ " ___ اشفاق احمد نے پوچھا۔

" میں نے کہا " ہم نے اللہ میاں سے عرض کی جناب ہم آپ کے نام پر ایک مطب کھول رہے ہیں۔ اب آپ کی ڈیوٹی یہ ہے کہ صرف اس مریض کو ہمارے مطب کا راستہ دکھائیے جسے آپ نے شفا بخشنی ہو دوسرے کو نہ دکھائیے "

شاہ بابا کی مسکراہٹ متکلم ہو گئی۔ ہنسے۔

اشفاق احمد نے کہا۔ " بے شک شفا تو وہی دیتے ہیں۔ دوا دینے کے علاوہ تم اور

کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ نا"

میں نے کہا " ہاں ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں۔ پڑھ پڑھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ وقت یہ ہے کہ ہند سے کتابیں نہیں منگوا سکتے"

" تو خود، ہند چلے جاؤ" اشفاق احمد نے کہا "کتابیں لے آؤ — کیوں شاہ بابا" —

اس پر شاہ بابا کی چپ ٹوٹ گئی۔ بولے " جاؤ تو قطب صاحب کو ہمارا سلام کہنا" —

واپسی پر میں نے اشفاق احمد سے پوچھا۔ " یار یہ شاہ بابا کن قطب صاحب کی بات کر رہے تھے" ۔

اشفاق احمد نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ " تم قطب صاحب کو نہیں جانتے کیا"

میں نے کہا "نہیں تو"

"بھئی وہ حضرت بختیار کاکی کی بات کر رہے تھے" ۔

"وہ کون ہیں؟ میں نے پوچھا" ۔

"وہ قطب الاقطاب ہیں" اشفاق احمد نے کہا۔

"پھر تو وہ بہت بڑے ہوئے" ۔

"ہاں" ۔ وہ بولا۔ "حضرت نظام الدین کے دادا پیر تھے۔ وہ بابا فرید کے مرشد تھے۔ "

"پھر تو شاہ بابا کا پیغام پہنچانا لازم ہو گیا نا" ۔

"بالکل" ۔

"یار میں ڈرتا ہوں کہیں بھول نہ جاؤں" ۔

"اونہوں" وہ ہنسا۔ "شاہ بابا بھولنے نہیں دیں گے" ۔

"اچھا" — میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں" وہ بولا۔ "ایک بار انہوں نے مجھے سات دن کے لئے کچھ پڑھنے کو بتایا تھا۔ کہنے لگے۔ روز صبح سویرے فجر کی نماز کے وقت یہ آیت سات بار پڑھو۔ صرف سات

دن اللہ شفا دے گا"

میں نے کہا "شاہ بابا میں اکثر بھول جاتا ہوں"

بولے "اونہوں فکر نہ کریں آپ بھولیں گے نہیں ہمارا ذمہ رہا۔ "

"اگلے روز جب فجر کی نماز کا وقت ہوا تو دروازہ بجا۔ میں جاگ پڑا لیکن سمجھا شاید میرا بیٹا نوکی یا کیسی ہے۔ اس لئے کروٹ لے کر پھر سو گیا۔

پھر دروازہ بجا۔ اتنی شدت سے بجا کہ ہم گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔ بڑے احمق لڑکے ہیں جو دروازہ بجا رہے ہیں۔ میں نے جوتا پہنا۔ چل کر دروازے پر آیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو دروازہ اندر سے بند نہیں۔ بڑا حیران ہوا کہ اگر دروازہ اندر سے بند نہیں تو بجانے کا مقصد۔

دروازہ کھولا تو باہر کوئی نہ تھا۔ ساتھ والے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ بچے گہری نیند سو رہے ہیں۔ بڑا حیران ہوا۔ پھر دفعتاً شاہ بابا کی بات یاد آ گئی —— آپ بھولیں گے نہیں ہمارا ذمہ رہا۔

بلائیں نہ بلائیں

جب اشفاق حسین اور میں حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے باہر نکلے تو اشفاق حسین کہنے لگا چلو یار اقبال ہوٹل سے ایک پیالہ چائے کا پیتے چلیں۔

ہم دونوں اقبال ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔

ابھی ہم چائے پینے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ وہی "ہم" صاحب آ گئے۔ آتے ہی ہوٹل والے سے کہنے لگے۔ "میاں ہمیں چائے پیش نہ کرنا۔ ہاں۔ بتائے دے رہے ہیں ہم"

"کیوں —— آخر وجہ" ہوٹل والے نے پوچھا۔

ہم صاحب بولے "بھئی دو پیالے پی کر آئے ہیں اکٹھے دو"

"ہائیں اکٹھے دو۔ یہ کیسے ہوا" ہوٹل والے نے پوچھا۔

"بس ادھر تمہاری طرف آ رہے تھے کہ شاہ صاحب مل گئے۔ موٹر میں سوار تھے ہمیں دیکھ کر موٹر روک لی۔ "

"کون شاہ صاحب" ہوٹل والے نے پوچھا۔

"وہ ہیں ہمارے ایک عزیز۔ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے واہ جناب آج تو دل کی بات پوری ہو گئی۔ کچھ اور مانگ لیتے۔"

"کیا مطلب" ہم نے پوچھا۔

بولے۔ "آپ کو ڈھونڈنے نکلے تھے۔ ڈھونڈے بغیر مل گئے آپ"۔

"خیریت باشد" ہم نے پوچھا۔

بولے۔ "جناب آج قطب صاحب کو سلام کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح سے طبیعت مچل رہی تھی۔ میں نے سوچا اکیلے جانے میں کیا مزا ہے۔ آپ کو ساتھ لے چلیں"۔

"تو لے گئے ساتھ" ہوٹل والے نے پوچھا۔

"بالکل لے گئے۔ وہیں کار میں بٹھایا اور لے گئے قطب صاحب کی خدمت میں"۔

"وہ تو سمجھ لیجیے کہ قطب صاحب نے بلایا ہو گا"۔ ہوٹل والا ہنسا۔

"بالکل ۔۔" ہم صاحب نے کہا۔ "حضرت نے بلایا اور ساتھ گاڑی بھیج دی"۔

پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔ بولے۔ "جناب والا جس کو چاہیں بلالیں۔ ہماری کیا حیثیت ہے"۔

یہ سن کر مجھے یاد آگیا کہ مجھے قطب صاحب کی خدمت میں شاہ بابا کا سلام پہنچانا ہے۔

اشفاق حسین اٹھ بیٹھا۔ بولا۔ "چلو بھئی اب ڈیرے پر چلیں آرام کریں"۔

دکان سے باہر جا کر میں نے اشفاق حسین سے کہا "یار مجھے تو قطب صاحب کی خدمت میں حاضری دینا ہے"

"کون قطب صاحب" اس نے پوچھا۔

"تم قطب صاحب کو نہیں جانتے"۔

"نہیں" وہ بولا۔

"بھئی وہ بہت بڑے بزرگ ہیں۔ قطب الاقطاب ہیں۔ ان کی خدمت میں

حاضری بہت ضروری ہے"۔

"اچھا___" وہ بولا۔ "تو چلو___ لیکن تمہیں رستے کا پتہ ہے"۔

"نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"تو چلو پوچھ لیتے ہیں"۔ وہ جانے پر راضی ہو گیا۔

ہم نے کئی ایک راہ گیروں سے پوچھا۔

کسی جگہ کا راستہ پوچھنا بہت بڑا فن ہے۔

کسی جگہ کا راستہ بتانا۔ یوں کہ پوچھنے والے کی سمجھ میں آ جائے اس سے بھی بڑا فن ہے۔ میں ان دونوں فنوں میں کورا ہوں۔ نہ مجھے راستہ پوچھنا آتا ہے نہ بتانا۔ بتانے کی تو میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ پوچھنے کی مجبوری سے نجات نہیں پا سکا۔ جب بھی راستہ پوچھتا ہوں تو بتانے والے کے خلوص، لگن اور محنت کو دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ جاتا ہے اور میں سمجھے بغیر کہہ دیتا ہوں جی سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔

دلی میں راستہ پوچھنا اور وہ بھی ایسے مقام کا جو دس پندہ میل دور واقع ہو آسان کام نہ تھا۔

دو ایک اصحاب نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔

پھر ایک صاحب آگے بڑھے بولے۔ "بھئی اسی بس سٹاپ سے فلاں نمبر کی بس پکڑ لو۔ صفدر جنگ کا ٹکٹ کٹوا لینا۔ صفدر جنگ پر اتر جانا اور وہاں سے مہرولی کا اڈہ پوچھ لینا۔ اڈے سے دوسری بس میں بیٹھ جانا۔ مہرولی آخری سٹاپ ہے۔ وہاں پہنچ کر قطب صاحب کا پوچھ لینا۔

استریاں

اس وقت دفتر ٹوٹ رہے تھے۔ بڑا رش تھا۔ اس رش کی نوعیت ظاہر تھی۔ دفتر کے اسسٹنٹ کلرک اور چھوٹے افسر اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔ ہر سٹاپ پر نوجوانوں کے ساتھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ظاہر تھا کہ وہ بھی دفتری ہیں۔

وہ بھی ایسے ہی کھڑی تھیں۔ جیسے لڑکے کھڑے تھے۔ ارے یہ کیسی لڑکیاں ہیں۔ میں نے اشفاق حسین سے کہا۔ انہیں تو پتہ نہیں کہ یہ لڑکیاں ہیں۔

"ہاں" وہ ہنسا۔ "میں بھی یہ دیکھ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مشینیں کام نہیں کر رہیں"۔

"مشینیں، کیسی مشینیں"۔ میں نے پوچھا۔

"ہمارے ہاں تو لڑکیوں کی مشینیں کھٹا کھٹ چلتی ہیں"۔ اشفاق حسین بولا۔

"کیا مطلب"۔

"وہ مشینیں جو ہر وقت آنے جانے والوں کو پیغام دیتی رہتی ہیں۔ ٹک ٹک۔ میں لڑکی ہوں۔ ٹک ٹک۔ میری طرف دیکھو۔ ٹکٹکا ٹک ٹکٹکا ٹک۔ دیکھو میں کتنی اچھی لگتی ہوں"۔

"بھئی یہ ہندو لڑکیاں ہیں"۔ میں نے کہا۔ "ہندو استری ایک بڑی پاکیزہ شے ہے"۔

"بے شک" وہ بولا۔ "پاکیزہ ہے۔ پوتر ہے لیکن شے نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اونچی نظروں سے تیر چلتے ہیں۔ یہاں نیچی نگاہوں سے چلتے ہوں گے"۔

"نہیں چل رہے بابا نہیں چل رہے"۔ میں چلایا۔ "یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ ورکنگ گرلز ہیں۔ نہ ان میں نمائش ہے نہ فیشن ہے. نہ چمک ہے نہ بھڑک ہے۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ یہ لڑکیاں ہیں"۔

"نہیں یار یہ کیسے ہو سکتا ہے"؟۔ اشفاق حسین بولا۔ "یہ شعور نہ رہے تو مرد کی تسخیر کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ زندگی کی ندی سوکھ جائے"۔

قطار

بس بس بس۔ ایک شور اٹھا۔

پیچھے ہٹو بس آ گئی۔

اسے سن کر وہ دھکا پیل کر کے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ گئے۔ اور سمٹ کر ایک قطار بنالی۔ اس قطار میں لڑکے بھی تھے لڑکیاں بھی۔ ادھیڑ عمر کے بھی عمر رسیدہ بھی۔ قطار بناتے وقت لڑکیوں نے خود کو الگ نہ کیا۔ نہ الگ سمجھا۔

ہمارے ہاں تو لڑکیاں یوں الگ کھڑی ہو جاتی ہیں جیسے کسی الگ مخلوق سے ہوں۔

اور یوں خود کو سنبھالتی ہیں جیسے چھوئی موئی ہوں۔ ہٹو مجھ سے دور رہو۔ میں میلی ہو جاؤں گی۔ ہاتھ لگ گیا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ بہت کچھ ہو جائے گا۔ ناقابل برداشت قسم کا کچھ ــــ نہ نہ نہ نزدیک نہ آنا۔ فاصلہ رکھو۔ دور رہو۔ ذراہٹ کے۔

وہاں ہندی لڑکیوں کو تو گویا پتہ ہی نہ تھا کہ وہ لڑکیاں ہیں یا شاید اپنا لڑکی پن انہوں نے خود سے الگ کر رکھا ہو، کہ بوقت ضرورت نکال لیں گی اور کام میں لائیں گی۔

بہر حال اس قطار میں کوئی ہٹو بچو نہ تھا۔ نہ ہی عمر رسیدہ لوگ خصوصی توجہ کے طالب تھے یوں جیسے ایک مزدوروں کا ٹولہ ہو۔ سب اچھا سب ایک جیسا۔

وہ ایک ایک کر کے بس میں داخل ہو گئے۔

ان لوگوں میں کتنا نظم و نسق ہے۔ میں نے کہا۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے قطاریں باندھ لیں حالانکہ ان کے دھرم میں اونچ نیچ تھی اور بڑی شدت سے تھی اور ہم نے جن کا مسلک مساوات تھا۔ قطاریں توڑنا سیکھ لیا ہڑبونگ مچانا سیکھ لیا۔

جب میں بس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ بس کی آخری سیٹ پر ایک شخص چاقو بنا پڑا ہے۔ اس کے قریب ہر نو وارد رک جاتا۔ پیسے اس کے ہاتھ میں تھماتا اور ٹکٹ لے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

ارے۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ چاقو کنڈکٹر تھا۔ وہ اٹھ کر لوگوں کے پاس نہیں جاتا تھا۔ مسافر اس کے پاس جاتے رقم دیتے ٹکٹ خریدتے اور پھر اپنی اپنی سیٹ پر جا بیٹھتے۔

واہ یہ اچھا کنڈکٹر ہے۔ جو مسافروں کو کنڈکٹ ہی نہیں کر رہا۔ اور یہ اچھے مسافر ہیں، جو ایسے کنڈکٹر کے باوجود ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو بس میں ساری رونق ہی کنڈیکٹر کے دم کرم سے ہوتی ہے۔ کبھی وہ مونچھ مروڑتا ہے. کبھی آوازہ لگاتا ہے۔ کبھی گھورتا ہے۔ کبھی ٹھٹھا کرتا ہے۔ یہاں تو بس میں ایک زنگ آلود چاقو پڑا ہے۔ نہ پوچھ نہ گچھ۔ نہ جھگڑا نہ فساد نہ دھونس نہ دھمکی۔

ہم دونوں ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔

چار ایک لڑکیاں ہماری جانب آئیں۔ ہمیں غور سے دیکھا اور پھر وہیں کھڑی ہو گئیں۔

اشفاق حسین کھڑکی کی طرف تھا۔ میں بھیڑ کی جانب تھا۔ میں لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ان چہروں پر محنت اور مستعدی ضرور لکھا ہوا تھا۔ لیکن چمک نہ تھی۔ بھڑک نہ تھی۔ محنت اور مستعدی کے باوجود وہ چہرے بجھے بجھے سے تھے۔ ان سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ صرف روٹین کے دائرے میں جی رہے ہوں۔ زندگی ان کے لئے ایک روٹین ہے۔ نظم و ضبط ہے۔ عشرت نہیں، پکنک نہیں، ہالیڈے نہیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہماری طرف خصوصی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ہمیں تیکھی نظروں سے نہیں دیکھ رہے تھے جیسے انہیں معلوم نہ ہو کہ ہم پاکستانی ہیں مسلمان ہیں۔

کیسے ہندو

غالباً انہیں پتہ تھا کہ ہم نووارد ہیں، پاکستانی ہیں، مسلمان ہیں۔ ہمارا لباس انداز، طور طریقہ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ ہم ان میں سے نہیں۔ پھر بھی نہ تو ان کے چہروں پر حقارت تھی نہ تعجب تھا نہ محبت تھی۔ وہ ہمیں کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ یوں جیسے ہم انہیں میں سے ہوں۔ ان کے برتاؤ میں بڑی رواداری تھی۔

میں حیرت میں گم تھا۔ یا اللہ یہ کیا بھید ہے۔ یہ لوگ ہندو معلوم نہیں پڑتے۔ وہ ہندو جس سے میں واقف تھا جس کے ساتھ میں نے زندگی کے ۴۲ سال گزارے تھے۔ وہ ہندو ایسا تو نہ تھا۔ اس میں افتراق و تفریق تھے۔ امتیازات تھے۔ وہ مسلمان کے قرب کو محسوس کر کے ان جانے میں سمٹ جاتا تھا۔ بھرشٹ ہو جانے کا خطرہ ابھرتا تو وہ سمٹتا۔ جوں جوں سمٹتا توں توں اس کے ہونٹوں پر عجز بھرے کلمات کھیلتے۔ جی مہاراج جی مہاراج۔ جوں جوں وہ اپنی پوترتا کو سنبھالنے کی کوشش کرتا توں توں زبان کے الفاظ میٹھے ہوتے جاتے اور میٹھے اور میٹھے۔

یہ کیسے ہندو ہیں جنہیں نہ بھرشٹ ہونے کا خطرہ لگا ہے نہ اپنی پوترتا کو محفوظ کرنے کا دھیان ہے۔ افتراق و تفریق کا احساس نہیں۔ امتیاز کا علم نہیں جو مجھے مسلمان اور پاکستانی جانتے ہوئے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ فاصلہ قائم نہیں کرتے۔ گھن نہیں کھاتے۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہند میں گزشتہ تینتیس سالوں میں ہزار ہا کمیونل فسادات کیوں ہوئے ہیں —— آج بھی ہو رہے ہیں —— کیوں۔ یہ لوگ جو بس میں

میرے پاس کھڑے ہیں۔ ان کے دلوں میں عناد نہیں، بغض نہیں۔ افتراق و تفریق نہیں بلکہ ایک اپنائیت ہے۔ یہ تو ہمیں اپنوں میں سے سمجھ رہے ہیں۔ پھر فسادات کیوں۔

دفعتاً میری پنڈلی پر ایک نرم و ملائم سالمس محسوس ہوا۔ میرا رواں رواں دہل گیا۔

لمس کا ڈنک

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میری زندگی کی سب سے بڑی عشرت لمس ہے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ لمس ہے۔

یوں لگتا ہے کہ جب میری تخلیق ہو رہی تھی اور حواس خمسہ میں حس کی بانٹ کی جا رہی تھی تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ کچھ ایسا ہوا کہ گڈمڈ ہو گیا۔ سننے، دیکھنے، سونگھنے اور چکھنے کے حصے گڈمڈ ہو کر لمس میں جا شامل ہوئے۔ یوں میری قوت لمس تلوار کی دھار بن گئی اور زندگی بھر مجھے یوں کاٹتی چھیلتی رہی جیسے پھل فروش گنڈیریاں کاٹتا چھیلتا ہے۔

پنڈلی پر وہ لمس مجھے یوں لگا جیسے بھڑنے ڈنک مارا ہو۔ بیک وقت تکلیف دہ اور لذیذ۔ میں تڑپ کر مڑا۔ دیکھا تو ایک لڑکی کی پنڈلی میری پنڈی سے ٹکرا رہی ہے۔ میں نے لمس کو گہرا کرنے کے لئے اپنی پنڈلی اور قریب کر دی۔ اور قریب اور قریب۔

پھر میں نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا اسے اس لمس کا شعور ہو گا۔ وہ میری طرف دیکھ کر آنکھ مارے گی۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے تو پتہ ہی نہ تھا۔ خبر ہی نہ تھی۔ اسے لمس کا شعور ہی نہ تھا۔ پھر بھیڑ اور بڑھ گئی اور میرے دائیں ہاتھ پر بہت سی لڑکیاں آ کھڑی ہوئیں۔

پھر میری گردن پر ایک اور ڈنک لگا۔ کسی کا نرم نرم سا عضو میری گردن پر ٹکا تھا۔ ٹکا رہا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے گردن کا سہارا دیئے رکھا۔ دیئے رکھا۔

پھر دفعتاً مجھے شعور ہوا کہ سہارا دینا بے کار ہے۔ اسے علم ہی نہیں کہ سہارا دیا جا رہا ہے۔ یا اللہ اتنی بے نیازی۔ کیا ہند کی عورت میں حس نہیں رہی۔ ہمارے ہاں تو حس کے فوارے چلتے ہیں۔ حتیٰ کہ دور کھڑے راہ گیر بھی پھوار سے بھیگ جاتے ہیں۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری۔ بولا۔ " یار یہ کیسی لڑکیاں ہیں " ۔

" کیسی ہیں " ۔ میں نے پوچھا۔

" بے نیاز بے خبر۔ کچھ پتہ ہی نہیں " ۔

" یہ تو بڑی خوبی ہے " ۔ میں نے کہا۔

" خوبی تو ہے پر اپنا تو کباڑہ ہو گیا۔ ارے ...... " وہ چلایا۔

" یہ دیکھ رہے ہو تم " ۔

" کیا___ " ؟

" یہ ہماری سیٹ کی کھڑکی کے اوپر ہندی میں کچھ لکھا ہے " ۔

" ہاں لکھا تو ہے " ۔

" شاید یہ زنانہ سیٹ ہو " ۔

" ہو سکتا ہے " ۔

اشفاق حسین اٹھ بیٹھا۔ پاس کھڑی لڑکیوں سے کہنے لگا یہ زنانہ سیٹ ہے کیا۔

لڑکیوں نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا ۔

" ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ان جانے میں آپ کی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ ہم ہندی نہیں پڑھ سکتے۔ آیئے تشریف رکھئے۔ ہم معافی چاہتے ہیں " ۔ اشفاق حسین نے کہا۔

ہم دونوں اٹھ بیٹھے۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں پھنس کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے چاروں طرف سے نرم و نازک لمس نے گھیر لیا۔ حتیٰ کہ میرا سارا جسم سیال بن گیا۔ اس میں سے چھینٹے اڑنے لگے لیکن گرد و پیش میں کسی کو خبر ہی نہ تھی۔

صفدر جنگ پر ہم نے بس بدل لی اور مہرولی کی طرف چل پڑے۔ اس بس کی سواریوں کا بھی وہی عالم تھا۔ وہی بے نیازی بے خبری۔

لڑکوں کو خبر نہ تھی کہ وہ لڑکے ہیں۔ لڑکیوں کو خبر نہ تھی کہ وہ لڑکیاں ہیں۔

مسافروں کو خبر نہ تھی کہ وہ ہندو ہیں۔ ہم مسلمان ہیں پاکستانی ہیں۔

کنڈکٹر اسی طرح پچھلی سیٹ میں چاقو بنا پڑا تھا۔ سواریاں خود جا کر ٹکٹ طلب کرتیں۔ کوئی چیکر نہ تھا۔

پھر وہ بس ایک گول سے واڑے میں جا کر رک گئی۔ یہ ٹرمینل سٹیشن تھا۔

قطب صاحب

پتہ نہیں قطب صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کو میں اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ رک جاؤں۔ خود کو کسی دھنکی میں ڈال دوں۔ جہاں میری روح کا بند بند دھنکا جائے میرے قلب کا کثیف لوگڑ رواں رواں ہو کر لطیف ہو جائے۔ میرے دل، روح اور ذہن کی آلائشیں صاف ہو جائیں۔ ایک معمولی سے وقفے کے لئے ہی سہی۔ کچھ دیر کے لئے۔ کچھ لمحات کے لئے جتنی دیر میں حضرت کے سامنے کھڑا رہوں۔ یا اللہ مجھے کچھ دیر کے لئے پاکیزگی عطا کر دے کہ حضرت کے روبرو کھڑا ہونے کے لائق بن جاؤں۔

پتہ نہیں میری یہ کیفیت کیوں تھی۔

شاید اس لئے کہ شاہ بابا کی عقیدت کو دیکھ کر میں اتنا متاثر ہوا کہ اسلام آباد پہنچ کر میں نے حضرت بختیار کاکی کی سوانح کا بڑے اہتمام سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے کردار اور عشق سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

حضرت بختیار کاکی کی تمام تر زندگی عشق الٰہی کے محور کے اردگرد گھومتی تھی۔

کاش کہ میں آپ کی سوانح کا مطالعہ نہ کرتا۔ نہ کرتا تو آپ کی خدمت میں حاضری کے خیال پر یوں تھر تھر نہ کانپتا۔

جب میں نے قطب صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں تو حیران رہ گیا تھا۔ اتنے بڑے. اتنے جمالی پھر بھی میں ان جان رہا۔

پنج لڑی

ہند کے صوفیائے کرام کی کئی ایک لڑیاں ہیں۔ سب سے زیادہ جانی پہچانی لڑی داتا کی ہے۔ اس لڑی میں پانچ موتی ہیں۔ قطب صاحب اس لڑی کے تیسرے موتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی حیثیت مرکزی ہو جاتی ہے۔ دو ادھر دو ادھر۔ سبحان اللہ کیا حیثیت ہے۔

صوفیائے کرام کے درجات کو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان سب شعاعوں کا منبع حضورؐ کی ذات ہے، اور یہ پھلجھڑیاں رنگ رنگ میں جلتی ہیں۔ ایک کا رنگ دوسرے سے نہیں ملتا۔ منزل سب کی ایک ہے رنگ جدا جدا ہیں۔ کوئی بارونق راستے سے سفر کرتے ہیں، کوئی لق و دق ویرانے سے۔ ان کا مقابلہ یا موازنہ کوئی جاننے والا کرے تو کرے مجھ ایسا انجان تو صرف احترام میں سر جھکانا ہی جانتا ہے۔

اس لڑی میں پہلا موتی داتا ہیں. دوسرا خواجہ غریب نواز، تیسرا قطب صاحب، چوتھا بابا فرید اور پانچواں محبوب الٰہی۔ کتنی جانی پہچانی روشن تابندہ لڑی ہے۔ صدیاں بیت گئیں لیکن ان کی تابندگی میں فرق نہیں آیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے زمان و مکان دونوں کو منسوخ کر کے رکھ دیا ہے۔

حضرت بختیار کاکی کی عوام میں مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جہاں سے گزرتے لوگ فرط محبت یا احترام سے خاک اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیتے۔ پتہ نہیں یہ ان کے کردار کا بجز تھا۔ یا ان کی اللہ واسطے کی محبت کی مٹھاس تھی کہ دلی کے لوگ مکھیوں کی طرح اس گڑ کی بھیلی پر منڈلاتے تھے۔ عام طور پر احترام ایک دیوار کی مصداق ہوتا ہے جو احترام کرنے والے اور محترم کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ جس کا احترام کرو اس سے کچھ کچھ ڈر آنے لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ناگوار خاطر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بار خاطر ہو۔

پتہ نہیں یہ صوفیائے کرام کیسے جادوگر ہیں کہ لوگ بیک وقت پیار بھی کرتے ہیں ساتھ احترام بھی کرتے ہیں۔ احترام پیار میں حائل نہیں ہوتا۔ پیار احترام میں مخل نہیں ہوتا۔

دلی کے تمام لوگ قطب صاحب کی محبت میں گویا پاگل ہو رہے تھے۔ کیا عوام کیا امراء، کیا بادشاہ۔ البتہ دلی کے شیخ الاسلام کو شکایت تھی کہ سبھی قطب صاحب کے دیوانے ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ایک مرتبہ خواجہ غریب نواز دلی آئے تو شیخ الاسلام نے ان کی خدمت میں شکایت کی۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ اچھا فکر نہ کرو ہم قطب کو اپنے ساتھ اجمیر لے جائیں گے۔ جب آپ قطب صاحب کو لے کر اجمیر کو روانہ ہوئے تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ساری دلی میں پھیل گئی۔ لوگ دیوانہ وار اٹھ بھاگے۔

خواجہ غریب نواز کی خدمت میں پہنچ کر آہ وبکار کرنے لگے۔ عالی جاہ جو حضرت دلی سے چلے گئے تو ہمارا کیا ہو گا۔ شہر ویران ہو جائے گا۔ ۔لوگ یتیم ہو جائیں گے۔ ۔باقی کیا رہ جائے گا۔ بجز ویرانی، بربادی، محرومی۔

لوگ خواجہ غریب نواز کو قدم قدم پر روکتے۔ عالی جاہ یہ ظلم نہ کیجئے ہم پر ترس کھایئے۔

جب شاہ التمش کو پتہ چلا تو وہ بھی اٹھ دوڑا۔ خواجہ غریب نواز کی منتیں کرنے لگا۔ حضرت انہیں نہ لے جایئے۔

خواجہ غریب نواز کے لئے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ فرمایا ”قطب تم واپس جاؤ۔ تمہارا یہی مقام قیام ہے۔ ہم نے دلی کو تمہاری پناہ میں دیا“۔

یا اللہ تیرا یہ بندہ کیا شے ہو گا جس کے جانے سے ایک پورا رستا بستا شہر ویران ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ آہ وزاری کرتے نہیں تھکتے ہیں۔

صاحبو! عوام تو بڑے نکتہ چیں ہوتے ہیں شکوہ شکایت ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ بے شک وہ محبت کرتے ہیں لیکن ان کے جذبے میں قیام نہیں ہوتا۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔

پتہ نہیں قطب صاحب میں وہ کیا جادو تھا کہ وہ ہر خاص و عام کے محبوب تھے۔ محبوب رہے۔

سب سے بڑا معجزہ

میں نے تو زندگی بھر یہی دیکھا ہے کہ دنیا کو خوش کرو تو اللہ کی خوشنودی حاصل

کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ اللہ کی خوشنودی کی طرف توجہ کرو تو دنیا ناراض ہو جاتی ہے۔ پتہ نہیں حضرت قطب صاحب کے پاس کیا طلسم اعظم تھا کہ ادھر عوام کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا، ادھر اللہ سے لو لگا رکھی تھی۔

استغراق کا یہ عالم تھا۔ کہ فرزند فوت ہو گیا مگر آپ کو خبر ہی نہ ہوئی۔

گھر میں فاقے پر فاقہ آ رہا تھا۔ آپ کو پتہ ہی نہ تھا۔ ایک روز اپنے آپ میں آئے تو بیوی نے صورت حال بیان کی۔ بولیں۔ ”پہلے پڑوسن سے قرض پر آٹا مانگ لیا کرتی تھی۔ اب وہ بھی طعنے دینے لگی“۔ آپ نے فرمایا۔ ”اب اس سے قرض نہ مانگنا جب روٹی کی ضرورت پڑے تو بسم اللہ پڑھ کر اس طاق میں ہاتھ ڈال کر حسب ضرورت کاک نکال لیا کرنا“ اسی وجہ سے آپ کا نام حضرت قطب الدین اوشی کی جگہ ”کاکی“ مشہور ہو گیا۔

یا اللہ یہ الکھ نگری کیسی دنیا ہے اور تیرے یہ بندے کیسے بندے ہیں۔ دنیا ٹھوکر میں دھری ہے لیکن فاقے آتے ہیں پیشانی پر بل نہیں آتے۔

قطب صاحب کی زندگی سے متعلقہ کوائف پڑھ کر میں تو حیرت سے گم صم رہ گیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں کرامات مجھ پر اثر نہیں رکھتے۔ میں مافوق الفطرت کارناموں پر مسحور نہیں ہوتا۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کرامات دکھانا ڈگڈگی بجانے کے مترادف ہو۔ میرے نزدیک سب سے بڑی کرامت کردار کا معجزہ ہے۔ میرے لئے سب سے عظیم معجزہ حضورؐ کا کردار تھا۔ ایک مسلسل معجزہ۔ حضورؐ کا تو وجود ہی ایک معجزہ تھا۔

صوفیائے کرام کی کرامت بھی ان کے کردار کی عظمت ہے۔ جناب قطب صاحب کے کردار کی عظمت کے روبرو کھڑا ہو کر میں کانپتا رہا۔ تھر تھر کانپتا رہا۔ پتہ نہیں یہ محبت کی کپکپی تھی یا احساس عظمت کی ___ اور پھر میں ___ میں جو ایک کثیف روح ہوں۔ غلیظ۔ آلودہ جس کا ریسیور کند ہے۔ گرد آلود ہے۔ جو اللہ کے بندوں کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ بے جان۔ مردہ۔

ایک بار قطب صاحب کی توجہ بھٹکی بھی۔ وہ یوں کہ۔ جوانی میں ہی جب آپ بغداد کے نزدیک قصبہ اوش میں رہتے تھے۔ آپ حضور صلعم سے لو لگائے بیٹھے تھے۔ معمول تھا کہ روز تین ہزار مرتبہ درود بھیجتے۔

پھر والدہ نے شادی کر دی۔ منکوحہ حسین جمیل تھی۔ توجہ اس پر مرکوز ہو گئی۔

وہیں اوش میں آپ کا ایک مرید احمد نامی رہتا تھا۔ نیک آدمی تھا۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک عالی شان محل ہے جس کے باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں اور ایک پست قد آدمی بار بار محل کے اندر جاتا ہے اور باہر آتا ہے۔ پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے اور یہ اندر باہر جانے آنے والا کون شخص ہے۔ کسی نے بتایا کہ یہ حضور صلعم کا محل ہے اور یہ پست قد آدمی سائلوں کے سوال لے کر اندر جاتا ہے اور جواب لاتا ہے۔

احمدؒ نے پست قد سے کہا جناب میں حضورؐ کی زیارت کا متمنی ہوں۔ پست قد اندر گیا۔ جواب لایا۔ بولا اے احمد حضور فرماتے ہیں ابھی تو زیارت کا اہل نہیں۔ البتہ گاؤں واپس جائے تو قطب سے کہنا حضور نے سلام بھیجا ہے فرماتے ہیں کیا وجہ ہے کہ وہ تحفہ جو تو ہمیں روز بھیجا کرتا تھا تین دن سے موصول نہیں ہوا۔

قطب صاحب نے جب یہ سنا تو نادم ہوئے اور منکوحہ کو طلاق دے دی۔

تھر تھر کانپ

ایک روز میں اور اشفاق احمد ٹہلتے ٹہلتے لارنس باغ جا پہنچے۔ صبح کا وقت تھا۔ سماں بڑا پیارا تھا۔ ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں وہاں ایک جمعدار آ نکلا۔

اشفاق نے کہا "جمعدار جی آپ سڑک صاف کریں پلاٹ پر جھاڑو دینے کا کیا فائدہ"؟

جمعدار بولا۔ "جناب میرا کام جھاڑو دینا ہے۔ چاہے سڑک ہو یا پلاٹ ہو یا مکان"

اشفاق احمد بولا۔ "کمیٹی کے ہو"

"جی نہیں۔" جمعدار نے کہا۔

"تو پھر کس کے ہو" اشفاق احمد نے پوچھا۔

جمعدار بولا۔ "جناب اپنے مرشد کا ہوں"

ہم دونوں چونکے۔

"جناب" وہ بولا۔ "میں جمعدار نہیں ہوں"

"پھر جھاڑو کیوں لگاتے ہو"۔

"مرشد کا حکم ہے۔ اس لئے۔ پہلے حکم ہوا کہ چھ سال جھاڑو لگاؤ۔ چار سال لگایا۔ پھر بدقسمتی سے ایک بھول ہو گئی"۔

"کیسی بھول" اشفاق احمد نے پوچھا۔

وجود کی غلطی

"بس جی" — وہ بولا۔ "بندہ بشر ہے بھول چوک ہو جاتی ہے"

"پھر" — میں نے پوچھا۔

"پھر" — وہ بولا۔ "حکم ہوا کہ پھر سے چھ سال جھاڑو لگاؤ۔ اب غلطی ہوئی تو خارج کر دیئے جاؤ گے۔ اب جناب یہ حال ہے کہ ڈرتا ہوں۔ تھر تھر کانپتا ہوں کہ پھر بھول نہ ہو جائے۔ دعائیں مانگتا ہوں اے بچانے والے تو ہی بچائے گا تو بچوں گا۔ میں تو بندہ بشر ہوں تو ہی لاج رکھے گا تو رہے گی"

اتنی اونچی منزل

"بڑی مشکل منزل ہے" اشفاق احمد بولا۔

"کیا کریں جی" وہ آہ بھر کر بولا۔ "ہمارے بزرگ منزل کو اتنا اونچا لے گئے ہیں کہ مجھ سا بندہ بشر دیکھ کر تھر تھر کانپتا ہے۔ سو بابو جی اپنا کام جھاڑو لگانا ہے۔ جھاڑو لگاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں، تھر تھر کانپتا ہوں۔"

میرا جی چاہتا تھا۔ کہ اس جمعدار کے روبرو باادب کھڑا ہو جاؤں، اسے ایک فوجی سلوٹ ماروں اور کہوں سبحان اللہ میں تیرے جھاڑو لگانے پر قربان ہو جاؤں۔ یا اللہ مجھے بھی توفیق عطا فرما کہ میں بھی جھاڑو لگاؤں، ڈروں، تھر تھر کانپوں۔

میرے ایک کرم فرما بھی گزشتہ دو سال سے تھر تھر کانپنے کے عالم میں ہیں۔ ان کے کانپنے کی نوعیت کچھ مختلف ہے۔ وہ کوئٹہ میں رہتے ہیں۔ نام نثار ہے۔ محشر کا روپ دھارے بیٹھے ہیں۔ دونوں کو سکھر کے جانے پہچانے مجذوب بزرگ جناب قاضی صاحب

سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ ملنے ملانے لگے۔ لگاؤ محبت میں بدل گیا۔ قاضی صاحب مہربان ہوئے اور بوقت رخصت اپنی گٹھڑی محشر صاحب کے سر پر دھر گئے۔ بوجھ سخت بھاری تھا۔ محشر سالکیت کو ہاتھ سے جانے دینا نہ چاہتے تھے۔ ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ لڑکھڑاتے رہے۔ لڑکھڑا رہے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ جو گرا تو ڈھیر ہو جاؤں گا۔ پھر اپنی سدھ بدھ نہ رہے گی۔ ابھی تک لڑکھڑا رہے ہیں۔ لڑکھڑاتے ہیں۔ ڈرتے ہیں۔ تھر تھر کانپتے ہیں۔ اے قیام بخشنے والے تو ہی سہارا دے گا تو قائم رہ سکوں گا۔

سچ ہے ہمارے بڑے عشق کی منزل کو اس قدر اونچا لے گئے ہیں کہ شاید وہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہوں۔

اشفاق حسین اور میں دونوں چپ چاپ بسوں کے اڈے سے مزار مبارک کی طرف چلے جا رہے تھے۔ مزار مبارک اڈے سے دور نہ تھا۔ لیکن فاصلے فرلانگوں میں ناپے نہیں جاتے۔ جذبات سے ناپے جائیں تو اشفاق حسین اور میں سالہا سال چلتے رہے چلتے رہے۔ میں حضرت کی سوانح کا از سر نو نظارہ کرتا رہا، کرتا رہا۔ ان کے عشق کی عظمت کو بند بند میں محسوس کرتا رہا۔

دفعتہً اشفاق حسین رک گیا اور میری طرف مسکرا کر دیکھنے لگا۔

جتنے بڑے اتنے قریب

ہمارے سامنے ایک بہت بڑا دروازہ تھا جس پر جلی حروف میں قطب الاقطاب لکھا ہوا تھا۔ اشفاق حسین اس جلی تحریر کو دیکھ کر اور بھی سہم گیا۔ بولا۔ "یار یہ تو بہت بڑی درگاہ محسوس ہوتی ہے"۔

"ہاں"۔ میں نے جواب دیا۔ "بہت بڑی"۔

"ایک بات بتا۔ بتائے گا"۔ اس نے پوچھا۔

"پوچھ"

"مجھے ایسے لگتا ہے"۔ وہ بولا۔ "جیسے ہر عمارت کی ایک روح ہوتی ہے۔ کچھ عمارتیں پیار سے بلاتی ہیں۔ آ جا اندر آ جا۔ کچھ دیر آرام کر لے۔ کچھ ماتھے پر تیوری چڑھا لیتی ہیں اونہوں۔ اندر نہ آنا۔ کچھ ایسی ہیں جو ڈراتی دھمکاتی ہیں۔ خبردار اس طرف کا رخ

نہ کرنا۔ "

"ہاں ایسا ہی ہے"۔ میں نے کہا۔

"تم مانتے ہو" اس نے پوچھا۔

"مانتا ہوں"۔

"داتا کے دربار میں جاؤ تو ایسے لگتا ہے جیسے دل سے بوجھ اتر گیا ہو۔ وزن کم ہو گیا ہو۔ ایک لطافت سی چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ اگر پیر مکی صاحب کے مزار پر جاؤ تو خوف سا طاری ہو جاتا ہے۔ دم رکتا ہے۔ دل پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ ہے نا"۔

"ہاں"۔ میں نے کہا۔ "جمال اور جلال میں یہی فرق ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہاں کیا ہوتا ہے"۔

"یہاں"۔ وہ بولا۔ اور پھر اس لمبی گلی کو دیکھنے لگا جو دروازے سے دور تک چلی گئی تھی "دیکھ لو"۔ وہ بولا۔ "اتنے بڑے ہیں پر اتنے قریب محسوس ہوتے ہیں"۔

"یہ کیسے"۔ اشفاق حسین نے کہا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ جتنے بڑے اتنے دور۔۔۔۔ "

"ہاں"۔ میں نے کہا "وہ دنیا والے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ والے جتنے بڑے اتنے قریب"۔

ہم اس لمبی راہداری میں داخل ہو گئے۔

"اتنی لمبی گلی ہے"۔ میں نے کہا۔

"گلی نہیں"۔ اشفاق حسین نے کہا۔ "راہداری ہے۔ یہ مزار کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ارد گرد کے گھروندے بعد میں بنے ہوں گے"۔

اس راہداری میں چار ایک منگتے بیٹھے تھے۔ وہ منگتے عجیب قسم کے منگتے تھے۔ منگتے نظر نہیں آتے تھے لیکن تھے منگتے۔ اپاہج نظر نہیں آتے تھے لیکن لگتا تھا جیسے ہوں۔ ان سب کے ارد گرد جیسے کثافت کے دائرے کھینچے ہوئے تھے۔

وہ منگتے مزار مبارک کی فضا سے ہم آہنگ نہ تھے یوں جیسے پھولوں کی ٹہنی میں کانٹے لگے ہوئے ہوں۔ جیسے ململ میں ٹاٹ کے پیوند ہوں۔

اس وقت میں نے محسوس کیا جیسے میں اورا دیکھ رہا ہوں۔ اور ارورح کی شعاعیں ہوتی

ہیں جو انسان کے جسم خصوصاً سر کے گرد ہویدا ہوتی ہیں۔ جو عام انسان کو دکھائی نہیں دیتیں بلکہ برگزیدہ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔

ان ملنگوں کو دیکھ کر میرے دل میں کراہت سی پیدا ہوئی اور مجھے وہ شام یاد آ گئی۔

اس شام میں اسلام آباد کے ایک بنگلے کے پلاٹ میں چند بڑے افسروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھنے کی میری کوئی حیثیت نہ تھی۔ اتفاق سے وہاں چلا گیا تھا۔ اہل کار باتیں کر رہے تھے میں خاموش تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان بھکاری آ گیا۔ اس نے لوگوں کو باہر بیٹھے ہوئے دیکھا تو دست سوال دراز کر دیا۔

اس پر ایک صاحب بولے۔ "میاں ہٹا کٹا ہو کر مانگتا ہے"۔
دوسرے نے کہا۔ "محنت مزدوری کیوں نہیں کرتا"؟
تیسرا بولا۔ "تو اس لائق نہیں کہ تجھے کچھ دیا جائے"۔

اس پر صاحب خانہ بولے۔ "کیا ہم سب اس لائق ہیں کہ ہمیں یہ سب کچھ ملے جو ہمیں مل رہا ہے"۔

صاحب خانہ کا وہ جملہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جب بھی میں کسی کو جانچنے لگتا ہوں تو میرے دل میں سے وہی آواز ابھرتی ہے، کیا میں اس شخص سے بہتر ہوں۔ خود کو بہتر سمجھتا ہوں کیا۔

"معافی چاہتا ہوں عالی جاہ کہ آپ کے در پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کراہت محسوس کر رہا ہوں تیرے در کے حوالے سے نہیں دیکھ رہا"۔ میں نے قطب صاحب سے ندامت کا اظہار کیا۔ پھر مجھے حضرت کی وہ بات یاد آ گئی۔

شاہ ہند التمش آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا اشتیاق رکھتا تھا جب بھی اجازت مانگتا آپ منع کر دیتے۔

ایک بار شیخ الاسلام کے بچوں کی حق تلفی دور کرانے کے لئے خود التمش کے دربار میں جانے پر مجبور ہو گئے۔ بادشاہ انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ حیرت اور مسرت سے اوسان خطا ہو گئے۔ تعظیم کے لئے باادب اٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت دربار میں اودھ کا حاکم رکن الدین حلوائی بیٹھا ہوا تھا۔ حلوائی کی نشست

حضرت سے اونچی تھی۔ التمش کو یہ بات سخت ناگوار گزرنے لگی۔

حضرت سمجھ گئے۔ بولے۔ "آزردہ نہ ہوں۔ جب حلوہ اور کاک (روٹی) اکٹھے موجود ہو تو حلوہ کاک کے اوپر ہوتا ہے"۔

حضرت خود کو کسی سے برتر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک میں ہوں کہ ان کے در پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو خود سے کمتر محسوس کر رہا ہوں۔

اس خیال پر میں پھر سے تھر تھر کانپنے لگا۔ کس منہ سے میں حضرت کے سامنے جاؤں گا۔ کیا میں اس لائق ہوں کہ آپ کی خدمت میں شاہ بابا کا پیغام لے کر جاؤں۔

راہداری ایکدم دائیں جانب مڑی۔

دفعتاً خوشبو کا ایک جھونکا آیا۔ فضا لطافت سے بھر گئی۔ میرے سامنے گویا پھولوں کا ایک تختہ پھیلا ہوا تھا۔

سامنے مزار مقدس تھا۔

زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں گویا کائنات کی وسعت تھی ـــــ وسعت لطافت اور سکون ہی سکون۔ معطر سکون کے یوں ڈھیر لگے ہوئے تھے جیسے گلابوں کے باغ میں فرحت کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں۔ ایک شگفتگی تھی۔ ایک طمانیت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں آکر سب کچھ پالیا ہو۔ کوئی مشکل نہ رہی ہو کوئی حسرت نہ رہی ہو۔ آرزو نہ رہی ہو۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ٹکڑا زمین کسی اور دنیا کا ہو۔ وہ فضا کسی اور ہی رنگ کی ہو۔

اگرچہ وہاں چند ایک لوگ موجود تھے لیکن مجھے ایسے لگا جیسے حضرت کے سوا وہاں کوئی دوجا نہ ہو۔ حضرت بیٹھے مسکرا رہے ہوں اور ارد گرد فرحت ہی فرحت منڈلا رہی ہو۔

شاہ بابا کا پیغام پیش کرنے کے لئے میں ایک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کوئی کرخت آواز نہ تھی۔ کوئی متکلم دعا نہ تھی۔ کوئی بھیڑ نہ تھی۔ کوئی مانگ نہ تھی۔ تنہائی مکمل تنہائی۔ ایسی متبرک خاموشی جو پھول کی سیرابی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ حضرت کے روبرو آنکھیں بند کر کے معدوم ہو جاؤں لیکن جونہی میں نے آنکھیں بند کیں میرے سامنے عشق کا ایک دریا موجزن ہو گیا۔ ساری کائنات پر مدو

جزر کا دھارا چلنے لگا۔

یا اللہ یہ کیا بھید ہے کہ تیرا یہ پروانہ جو زندگی بھر تیرے عشق میں ہر لحظہ مرتا اور ہر لحظہ زندہ ہوتا رہا اور پھر اسی مرن جین کی تڑپ میں اس جہان سے رخصت ہو گیا۔ اس کے مزار مبارک پر سکون خیمے گاڑے ہوئے ہے۔ یہ کیا بھید ہے۔

حضرت محفل سماع میں بیٹھے تھے کہ قوالوں نے ایک شعر گایا۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

اپنے قلب کی کیفیت کا نقشہ لفظوں میں کھنچا دیکھا تو حال کی کیفیت پیدا ہوئی۔ وجدان ہوا۔ از خود رفتہ ہو گئے۔ لوگ اسی کیفیت میں اٹھا کر گھر لے آئے۔

ہوش میں آئے تو قوالوں کو طلب کیا۔ فرمایا اسی ایک شعر کی تکرار کرتے رہو۔ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی۔ تین دن مسلسل اسی مرن جین کی تڑپ میں مبتلا رہے۔ چوتھے روز حالت غیر ہو گئی۔

حکیم نے نبض دیکھی۔ بولا۔ ”جگر پانی ہو کر بہ گیا ہے“۔

اس کشتۂ خنجر تسلیم کا صرف جگر ہی نہیں سارے اعضائے رئیسہ پانی ہو چکے تھے۔ صرف ایک طلب کی حدت سے یہ دیا جل رہا تھا۔

کہتے ہیں حضرت کی وصیت تھی کہ میری نماز جنازہ کی امامت وہ کرے جس نے کبھی نماز قضا نہ کی ہو۔ ہر جماعت میں تکبیر اولیٰ کے ساتھ شرکت کی ہو۔ اور کبھی تہجد میں ناغہ نہ کیا ہو۔

مجمع میں بڑے بڑے درویش موجود تھے۔ کوئی امامت کے لئے آگے نہ بڑھا۔ سبھی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ آخر بادشاہ شمس الدین التمش اٹھا۔ آگے بڑھا۔ اور امامت کا فرض ادا کرنے سے پہلے بولا۔ ”حضرت نے آج مجھے ننگا کر دیا“۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا جیسے دفعتاً میری آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا۔ جیسے بھید کھل گیا اور میں معدوم ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک حضرت کے حضور کونے میں کھڑا معدوم رہا۔

دنیا ناپید ہو گئی۔ زمین، آسمان، ہوا، فضا سب ختم ہو گئے۔ کائنات معدوم ہو

گئی۔ صرف حضرت مرقد پر تشریف فرما تھے۔ آپ کے وجود سے بھور سے جیسی روشنی چاروں طرف نکل رہی تھی اور ایک معدوم شدہ مداح حواس گم، قیاس گم، کونے میں لگا کھڑا تھا۔

جب ہم سکاؤٹ کیمپ میں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ صدر دروازے کے پہلو میں تھڑے پر سیکوریٹی والے جوں کے توں بیٹھے تھے۔

یااللہ کیا یہ لوگ لوہے کے بنے ہوئے ہیں جو صبح سے اب تک جوں کے توں بیٹھے ہیں۔ چاق وچوبند، مستعد، بیدار۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے سامنے فائلیں نہ تھیں، رجسٹر نہ تھے۔ وہ پڑھ نہیں رہے تھے، لکھ نہیں رہے تھے۔ جمائیاں نہیں لے رہے تھے۔ بس بیٹھے تھے۔ ایزی نہیں۔ مستعد۔ ڈھیلے نہیں چاق وچوبند۔ جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔

یااللہ یہ لوگ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ کچھ کر رہے ہوں تو بیٹھے رہنا ممکن ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں کر رہے پھر بھی بیٹھے ہیں۔ نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔

پانچ روز ہم دلی میں سکاؤٹ کیمپ میں مقیم رہے۔ اور صبح شام انہیں دیکھتے رہے۔ پانچ روز وہ جوں کے توں بیٹھے رہے۔

صبح سویرے جب ہم جاگتے تو انہیں بیٹھے ہوئے پاتے۔ رات کو سونے لگتے تو بھی وہ بیٹھے ہوتے۔ ان کے انداز میں نہ تو پولیس کی رعونت تھی۔ نہ افسر شاہی کی ٹیں تھی۔ ان کے کان کھڑے رہتے۔ نگاہیں جھکی رہتیں۔ ہر آنے جانے والے کو دیکھتے لیکن سر اٹھا کر نہیں، جھکی جھکی نظروں سے یوں دیکھتے کہ کسی کو پتہ نہ چلتا کہ دیکھ رہے ہیں۔ ہر آہٹ پر کان رکھتے لیکن یوں جیسے بالکل نہ سن رہے ہوں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے ان پر ترس آتا۔ دل میں ہمدردی کی ایک رو اٹھتی۔ جی چاہتا کہ باری باری ہر ایک کو گلے سے لگاؤں اور پھر رو دوں۔

کیمپ کے ہال کے بغلی کمرے میں پولیس کی ایک چوکی ڈیوٹی پر تھی۔ کل چھ سات سپاہی تھے جو دیکھنے میں سپاہی نظر نہیں آتے تھے۔ نہ ہی ان کا انداز توجہ طلب تھا۔ نہ آواز میں کھنکار تھی۔ بیچارے چپ باہر میدان میں چارپائیوں پر بیٹھے رہتے۔ کوئی غور سے ان کی طرف دیکھتا تو نظریں جھکا لیتے۔

پہلے دو ایک دن تو یہ پولیس چوکی گم سم بیٹھی رہی پھر آہستہ آہستہ ان میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ مسکرانے لگے۔ پھر مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ جی مہاراج. جی مہاراج اور آخری دنوں میں خاصے گھل مل گئے۔

ایک ایسے ہال کمرے میں سونا جس میں اسی پچاسی چارپائیاں بچھی ہوں میرا زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔

اشفاق حسین اس بھیڑ کی وجہ سے خاصا پریشان تھا۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ لمبی بیماری کی وجہ سے اسے نیند نہیں آتی تھی۔ رات کے ایک بجے تک کروٹیں بدلتا رہتا یا تنگ آ کر کسی کتاب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیتا۔ عام طور پر وہ رات کے تین بجے سویا کرتا تھا اور صبح نو بجے تک چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔

رات کے دس بجے بتیاں گل ہو گئیں لیکن سرگوشیاں جاری رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ہال پر سناٹا چھا گیا۔

دلی میں یہ ہماری پہلی رات تھی۔

دریا گنج

اگلی صبح اقبال ہوٹل سے ناشتہ کر کے ہومیوپیتھی کی کتابیں خریدنے کے لئے ہم دریا گنج کی طرف چل پڑے۔

ہومیوپیتھی کی کتابوں کے سلسلے میں ہمیں صرف دو ناموں کا علم تھا۔ چونے منڈی میں جین پبلشرز اور دریا گنج میں بھنڈاری۔

دریا گنج کا بازار شروع ہوا تو ہم رکشا سے اتر گئے۔ وہ ایک فراخ بازار تھا جس میں بینک تھے. ہوٹل تھے. دفتر تھے. ریستوران تھے. جنرل مرچنٹس تھے. موٹر پارٹس تھے۔ وہاں سبھی کچھ تھا۔

بازار میں خاصی رونق تھی۔ لوگ اپنے اپنے کام سے آجا رہے تھے۔ ٹہل لگانے والے یکسر مفقود تھے۔ احساس فراغت معدوم تھا۔

چہرے ہی چہرے:

میرے ارد گرد چہرے ہی چہرے تھے۔

دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ یہ چہرے وہ چہرے تو نہیں یہ تو نئے پہرے ہیں۔ بالکل نئے۔

اس خیال پر میں چہروں کو دیکھنے لگا۔

چہرے ہی چہرے، چہرے ہی چہرے۔ دریا گنج میں چہروں کی لہریں چل رہی

تھیں۔

نوجوان اور جوان چہروں کی بھرمار تھی۔ بوڑھا چہرا کوئی نہ تھا۔ کبھی کبھار نظر آتا تھا۔ یہ ہند میں بوڑھوں کو کیا ہوا۔ کیا یہ کوی راج کی مکر دھوج وٹی کا اثر ہے یا پنڈت ٹھاکر داس کے امرت دھارا کا۔ حیرت کی بات ہے کہ ادھیڑ عمر کے لوگ بھی جوانی کے بہروپ اٹھائے پھرتے تھے لیکن وہ چہرے ہندو چہرے نہ تھے۔ کیا یہ چہرے سیکولر ہو گئے ہیں۔ ہندو چہرے میں ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ ایک اعزاز ہوتا ہے. قیام ہوتا ہے. سکون ہوتا ہے. تحمل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔ بہرحال ہندو چہرا بڑا منفرد ہوتا ہے اور جوں جوں عمر بڑھتی ہے وہ جوبن پر آتا ہے۔

لیکن اس ہجوم میں ہندو چہرا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ وہ چہرے کہاں ہیں جن سے میں واقف تھا۔ یہ چہرے وہ چہرے تو نہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں قصور میں سکول ماسٹر تھا تو ہمارے ایک سیکنڈ ماسٹر ہوتے تھے۔ ان کا نام سکھ راج تھا۔ ان کا چہرا مثالی ہندو چہرا تھا۔ ان کے چہرے پر کوئی تلخی نہ تھی۔ غصہ نہ تھا۔ کبھی ناگواری نہ جھلکی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی بچے کو سرزنش نہ کی تھی۔ کسی کو سزا نہ دی تھی۔ بس وہ سنجیدہ ہو کر کھڑے ہو جاتے۔ جماعت کے لڑکے انہیں دیکھ کر خود بخود شور مچانا بند کر دیتے۔

سکول کے میدان میں جھگڑا ہو جاتا تو وہ باہر نکل کر چپ چاپ کھڑے ہو جاتے۔ جھگڑنے والے انہیں دیکھ کر خود بخود چپ ہو جاتے۔

واقعی لالہ سکھ راج. سکھ راج تھے۔ ان کے چہرے پر سکھ راج تھا۔ صرف چہرے پر ہی نہیں ان کے من پر بھی سکھ کا راج تھا۔

سکھ راج کی دو مصروفیتیں تھیں۔ ایک تو وہ بڑے عابد تھے دوسرے دان پن ان کا دھرم تھا۔

حالانکہ ان کی تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی پھر بھی وہ ہر مہینے گاڑھے کی ۳۰ قمیصیں سلواتے۔ روز صبح سویرے سیر پر جاتے تو ایک قمیص بغل میں دبا لیتے۔ سیر کے دوران جو شخص انہیں مستحق نظر آتا چپکے سے قمیص اس کے ہاتھ تھما کر یہ جا وہ جا۔

جب تک وہ قمیص کا دان نہ دے لیتے ناشتہ نہ کرتے تھے۔

بجھے ہوئے دیئے

دریا گنج میں بستے ہوئے چہروں پر ذرا چمک نہ تھی۔ جیسے سارے بجھے ہوئے دیئے ہوں۔ ان پر رونق نہ تھی، خوشی نہ تھی۔ فراغت نہ تھی۔ نہ بے باکی نہ غنڈہ گردی۔ نہ ہی وہ چہرے انقلابی تھے۔ ان چہروں پر جلی حروف میں میڈیا کر لکھا ہوا تھا۔ وہ چہرے مصروف چہرے تھے۔ روٹین میں پھنسے ہوئے جیسے کولہو میں جتے ہوئے بیل کا چہرا ہوتا ہے۔ کولہو کے بیل کی آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیئے جاتے ہیں تاکہ اس کی توجہ منتشر نہ ہو۔ چارہ دیکھ کر راہ ناپنے سے رک نہ جائے۔ ان چہروں پر کھوپے نہیں چڑھے تھے۔ کھوپے چڑھانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ توجہ منتشر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پاکستانی چہروں سے وہ چہرے کتنے مختلف تھے۔ یہاں مصروف لوگ بھی یوں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جیسے احساس فراغت سے بھرے ہوئے ہوں۔

سیدھی راہ چلتے ہوئے بھی گردو پیش کا یوں جائزہ لیتے رہتے ہیں جیسے صرف جائزہ لینے کے لئے گھوم پھر رہے ہوں۔ کام سے جاتے ہوئے بھی یوں ٹھمکتے جاتے ہیں جیسے ٹہل رہے ہوں۔ نوجوان اپنے چہرے چال ڈھال رنگ روپ کے شعور سے یوں بھیگے ہوئے ہوتے ہیں جیسے صبح کے وقت گھاس اوس سے بھری ہوتی ہے۔ یہاں کا ہر چہرا خود کو پرزنٹ کرتا ہے یوں جیسے چاندی کی تھالی میں ورق لگی گلوریاں پیش کی جاتی ہیں۔

دریا گنج کے چہرے خود شعوری سے خالی تھے۔ انہیں احساس نہ تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ وہ بس تھے خود کو پیش نہیں کر رہے تھے۔ لیکن وہ چہرے گلم تھے ان پر مسرت کی جھلک نہ تھی۔ نہ اطمینان تھا نہ بے اطمینانی۔ نہ سرکشی تھی نہ انقلابی جذبہ نہ غنڈہ پن اور معمر چہرے تو نظر ہی نہیں آتے تھے۔

وہ معزز، متوازن، متحمل ہندو چہرا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

سردار جی

سکھ سکھ سکھ۔ ساری دلی سکھوں سے بھری ہوئی تھی۔

جب ہم واگہ بارڈر پر پہنچے تو سرحد پر سکھ قلیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

جب ہم امرتسر پہنچے تھے تو سکھ بائیسکل رکشا چلا رہے تھے۔ بوجھ اٹھا رہے تھے۔ ٹانگہ چلا رہے تھے۔ وہاں سکھ کو دیکھ کر میں نے آہ بھری۔ بیچارا سکھ۔

لیکن ہم دلی پہنچے تو منظر بالکل بدل گیا۔ ار۔ ے۔ سکھ

سردار جی مہاراج۔

دلی میں سکھ کا چرا یوں تھا جیسے صحرا میں نخلستان آ گیا ہو۔ جزیرے ہی جزیرے۔ جزیرے ہی جزیرے۔ سکھ کی پگڑی جو کسی زمانے میں سر کا بوجھ نظر آتی تھی۔ سر پر یوں لپٹی ہوتی تھی جیسے باندھی ہوئی نہ ہو، بلکہ خالی ولی ہوئی ہو۔ سکھ کی وہ پگڑی جو دہقانیت کا نشان سمجھی جاتی تھی اس پگڑی نے دریا گنج میں رنگ جمار کھا تھا۔ وہ پگڑی لپٹی ہوئی نہیں تھی بلکہ بندھی ہوئی تھی۔ بندھی ہوئی بھی نہیں بلکہ سجی ہوئی تھی۔ اس کی بندش میں اک سمارٹس تھی۔ اس کی شیپ کیوٹ تھی۔ اس کی بناوٹ میں اک سجاوٹ تھی۔

سکھ کی پگڑی سکھ کی پگڑی۔ سارے دریا گنج میں سکھ کی پگڑی۔ یہاں وہاں ادھر ادھر جگہ جگہ سے جھانک رہی تھی۔ صرف پگڑی ہی نہیں سکھ کے چہرے پر بھی گویا استری پھری ہوئی تھی۔

سکھ کی پگڑی، سکھ کا چرا، سکھ کا لباس، ساری دلی میں موسٹ ول ڈریسڈ سکھ تھا سکھ کا چرا جاذب توجہ تھا۔ متمول سکھ میں اک وقار تھا۔ محنتی سکھ میں لگن تھی۔ یا اللہ یہ کون سی قوم ہے جس نے دلی پر یورش کر رکھی ہے۔ یہ وہ سکھ تو نہیں جس سے میں واقف تھا۔ اس سکھ میں صحت تھی جذبہ تھا محنت تھی خوش باشی تھی خلوص تھا۔ اس سکھ میں بانکپن ہے خود اعتمادی ہے۔ وہ سکھ سادہ لوح تھا یہ سکھ چمکدار ہے۔ وہ سکھ بدرنگا تھا یہ سکھ رنگ رنگیلا ہے، چمکیلا ہے۔ اس میں مزاح کی حس ہے۔ مجھے یاد ہے جب تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ سکھوں کا جتھہ یاترا کے لئے حسن ابدال آیا اور پنڈی رکا تو نوجوان اور بچے سکھ کو دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئے۔

انہوں نے سکھ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

سکھ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میرے بھائیو گھیرا نہ ڈالو۔ دیکھتے جاؤ اور چلتے جاؤ۔ پیچھے بھی بہت بھائی دیکھنے کے لئے کھڑے ہیں ان کا حق نہ مارو۔

سکھ کی یہ بات سن کر میرے دل میں اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں

کہ سکھ ایک عظیم قوم ہے۔ میراجی چاہتا تھا کہ دریا گنج میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لوں اور چلا چلا کر کہوں ـــــ سردار جی مہاراج آپ ایک عظیم قوم ہیں۔

لطیفے ہی لطیفے

پتہ نہیں سکھوں کا مذاق اڑانے کی تحریک کس نے چلائی کیسے چلی۔ ایک بات بہر صورت یقینی ہے کہ یہ تحریک ایک منظم تحریک تھی۔ اگرچہ اس تحریک کو مزاح کا رنگ دے دیا گیا تھا۔ مگر اس میں مزاح کا عنصر کم کم تھا تمسخر کا عنصر زیادہ تھا۔

تقسیم سے پہلے سکھوں کا مذاق اڑانے کے لئے بارہ بجے سے متعلق لطیفے چلائے گئے۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ دوپہر بارہ بجے سکھوں کا ذہن الٹ پلٹ جاتا ہے اور وہ عقل سے خالی ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ بات سکھوں کے کیس کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی۔ یہ بات وضع کرنے والوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ عورت کے سر پر بھی لمبے بال ہوتے ہیں۔ سکھوں نے یہ تحقیر بھرا لطیفہ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

مجھے یاد ہے تقسیم سے پہلے دوپہر کے وقت میں ایک دوست کے ساتھ مال روڈ پر کسی کام سے جا رہا تھا۔ ایک سائیکل سوار سکھ سڑک پر آ رہا تھا۔ کسی رکاوٹ کے بغیر۔ بظاہر کسی وجہ کے بغیر سائیکل سوار سکھ سڑک پر گر پڑا۔ میرے ساتھی نے اپنی گھڑی دیکھی اور ہنس کر کہنے لگا سردار جی ابھی تو بارہ بجنے میں سات منٹ باقی ہیں۔ سکھ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا مہاراج اپنی گھڑی ٹھیک کر لیں۔

پھر تقسیم کے بعد سکھوں کے متعلق لطیفوں کا ایک طوفان اٹھ آیا۔

مجھے علم نہیں کہ یہ طوفان کس طرح اٹھا۔ بہر صورت ایک بات ظاہر تھی کہ یہ طوفان از خود نہیں اٹھا تھا۔ یہ لطیفے معمولی قسم کے لطیفے نہیں تھے۔ کئی ایک تو بڑے دور رس ذہنوں کی پیداوار نظر آتے تھے۔ کئی ایک مزاح کی عمدہ مثال تھے۔ ایسے معلوم پڑتا تھا کہ ان لطیفوں کو تخلیق کرنے کے لئے باقاعدہ کوئی اعلیٰ پیمانے کی فیکٹری کام کر رہی ہے مثلاً سب سے پہلا لطیفہ جو میں نے سنا اسے سن کر میں حیران رہ گیا۔

اتنی گستاخی

یقیناً آپ نے وہ لطیفہ سنا ہو گا۔

سکھوں کا ایک جتھہ آ رہا تھا۔ سردار صاحب نے ان سے پوچھا ”ایہ فوجاں امبر سروں آئیاں نیں“ جتھے کے سربراہ نے جواب دیا ”نہ مہاراج، آپاں تے امبر سروں آ رئے ایں“۔ سروار جی بولے ”اچھا، میں سمجھیا تساں امبر سروں آ رہیے او“۔ یہ لطیفہ سکھوں پر عائد نہیں ہوتا۔ یہ تو انسان اور کمیونی کیشن پر ایک آفاقی لطیفہ ہے۔ بہر طور اسے سکھوں پر زبردستی منطبق کیا گیا جس کا مقصد تحقیر و تضحیک تھا۔

سکھوں نے تحقیر کے اس طوفان کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اگر ہندو یا مسلمان پر ایسے لطیفے وضع کئے جاتے تو یقیناً خوفناک نتائج بر آمد ہوتے۔

اس قسم کے تحقیر بھرے وار سکھوں نے مردانہ وار برداشت کئے۔ اور آج دلی کی سڑکوں پر، بازاروں میں، گلیوں میں، باغوں میں سکھ یوں براجمان ہے جیسے کمپنی بہادر کے راج میں چوکوں میں ملکہ کے بت براجمان تھے۔

یہ کیا ہو رہا ہے مہاراج۔ توجہ فرمایئے۔ آپ کے دیش میں کوئی اقلیت ابھرے۔ اتنی گستاخی۔ نہ مہاراج ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ ایسا تو کبھی ہوا نہیں۔

دفعتاً اشفاق حسین رک گیا۔

دریا گنج میں وہ ایک موسیقی کی دوکان تھی۔

اندر کئی ایک ساز پڑے تھے۔ ستار۔ ہارمونیم. طبلہ۔ ایک بانکا سکھ پوچھ رہا تھا۔

”کیا چاہئے مہاراج“۔

اشفاق حسین مسکرایا۔ بولا ”سردار جی ستار کے لئے تاریں چاہئیں لیکن تانبے کی ہوں مل جائیں گی“۔

”کیوں نہ ملیں گی مہاراج۔ ضرور ملیں گی“۔

”اچھا تو پھر دے دیجئے“۔

”کتنی تاریں چاہئیں“۔

”اشفاق بولا ”سردار جی ہم پاکستان سے آئے ہیں“۔

سکھ ہنسا۔ بولا ”وہ تو مہاراج آپ کے منہ پر لکھا ہوا ہے“۔

”کیا مطلب“۔ میں نے پوچھا۔

" پاکستان کا چہرا دور سے نظر آ جاتا ہے جی۔

"کس طرح سردار جی ذرا آپاں کو یہ نقطہ تو سمجھا دیجئے کیسے پتہ چلتا ہے" ۔ میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا۔ " نہ مہاراج آپاں کو یہ نہیں پتہ کہ کس طرح پتہ چلتا ہے۔ بس اتنا ہی پتہ ہے کہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ پاکستان سے آیا ہے" ۔

چلتے پھرتے کھانا.

دریا گنج میں فٹ پاتھ پر وہی عالم تھا جو ہمارے ہاں ہوتا ہے ___ دوکانیں اپنی حدود سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ریڑیاں چلنے کی بجائے قائم تھیں۔ خوانچے کھڑے نہیں تھے. آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک جانب کچوری والا تھا دوسری جانب چاٹ والا۔ لوگ کچوری کھا رہے تھے. چاٹ کھا رہے تھے پوری کھا رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں لوگوں کو بازار میں کھڑے ہو کر کھاتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جیتے جاگتے لوگوں میں آ گیا ہوں۔

کاش کہ اسلام آباد میں بھی لوگ بازاروں میں چلتے پھرتے کھاتے پیتے نظر آتے۔ لیکن یہاں ہر شخص افسری کی بوجھل گٹھڑی اٹھانے پر مجبور ہے۔ یہ بوجھ رکنے نہیں دیتا۔ کھانے نہیں دیتا۔ جینے نہیں دیتا۔ وہ لوگ جو اپنا بچپنا کھو دیتے ہیں مردہ لاش بن جاتے ہیں۔

مجھے ضیا جالندھری سے محبت ہے۔ اس محبت کی ابتدا صرف اس لئے ہوئی کہ میں نے اسے خورشید کے ساتھ بازار میں کھڑے کھاتے ہوئے دیکھا۔ ارے ___ میں رک گیا۔ اتنا خوبصورت آدمی اتنا ول ڈریسڈ اور ایک میلے سے حلوائی کی دوکان پر کھڑا کھا رہا ہے۔ عہدے والا افسر ہے۔ کرسی والا ہے پھر بھی کھا رہا ہے۔ اودھر ادھر نہیں دیکھتا کہ کوئی دیکھتا تو نہیں۔ اودھر اودھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ پکوان کی لذت سے اس قدر سرشار ہے کہ اودھر ادھر کا ہوش نہیں۔

صرف کھانا ہی اہم نہیں ہوتا۔ کھانے کی سرتال زیادہ اہم ہوتی ہے۔ معذرت

بھرے انداز میں کھانا ___ نہ کھانے سے بدتر ہے۔ "کوئی دیکھتا تو نہیں" کی احتیاط سے کھانا۔ "معافی چاہتا ہوں" کے انداز سے بھی برا ہے۔

لوگ کہتے ہیں جب تک کسی کو جوا کھیلتے نہ دیکھو پتہ نہیں چلتا کہ کیسا آدمی ہے۔ میں کہتا ہوں آدمی کو جانچنا چاہو تو اسے کھاتے ہوئے دیکھو ___ محفل کی پابندیوں میں نہیں آزادانہ ___

پیٹ بھرنا

کھانا ایک پر لذت عمل ہے۔ جسے پکوان سے چنداں تعلق نہیں چاہے آپ بھنی مرغی کھا رہے ہوں۔ یا لسی کے ساتھ مسی روٹی کھا رہے ہوں۔ چاہے آپ کے سامنے پلاؤ کی قاب ہو یا کنالی دال چاول سے بھری ہو۔ شرطیں صرف یہ ہیں کہ آپ کو کھانے کی اشتہا ہو۔ آپ پوری توجہ سے کھا رہے ہوں۔ ماحول سے بے نیاز۔ اگر آپ کو جلدی ہو۔ پیچھے یہ احساس ڈنڈا لے کر کھڑا ہو کہ جلدی کرو دفتر جانا ہے تو پھر کھانا نہیں رہ جاتا۔ پیٹ بھرنا رہ جاتا ہے۔ اگر آپ بوفے کھانا کھا رہے ہیں اور ساتھ سوشل بات چیت بھی جاری رکھے ہوئے ہیں، تو وہ کھانا، کھانا نہیں ہوا۔ کھڑے ہو کر تو جانور کھاتے ہیں۔ اگر آپ کھانے کا عمل دیکھنا چاہتے ہیں تو کسی گاؤں میں دوپہر کے وقت کھیت یا گھر میں چلے جایئے۔ صبح سے دوپہر تک کام کرتے ہوئے تھکا ہوا کسان چونکڑی مار کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ گھر والی پنکھا کرتی رہتی ہے اور وہ آرام و اطمینان سے بیٹھ کر چٹنی سے روٹی کھاتا ہے ساتھ لسی پیتا ہے ___ گمان غالب ہے کہ وہ چٹنی روٹی ڈائننگ میز کی بھنی ہوئی مرغی سے زیادہ لذت دیتی ہے۔

دریا گنج میں لوگوں کو کچوری پوری کھاتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ___ لیکن یہ کیا ___ یہ کیا کھا رہے ہیں ___ اونہوں۔ یہ کھانا کھانا تو نہیں۔ یہ کھانے والے تو پکوان کی لذت سے بالکل بے گانہ ہیں۔ انہیں تو احساس ہی نہیں کہ یہ کچوری کھا رہے ہیں یا بھنے ہوئے چنے چبا رہے ہیں۔ یہ کیا کھائیں گے۔ انہیں تو احساس فراغت ہی نہیں۔ احساس فراغت نہ ہو تو کھانا کیسا۔ ہندو اس طرح تو نہیں کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے ہندو بڑے اہتمام سے روٹی کھایا کرتے تھے۔ جوتا اتارتے۔ چوکے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ گڑوی سے ہاتھ دھوتے۔ پھر ان کے سامنے ایک بڑی سی تھالی میں چار ایک کٹوریاں رکھ دی جاتیں۔

ایک میں بجھیہ، ایک میں دال، ایک میں رائتہ، ایک میں تلی ہوئی توری۔ ساتھ چھوٹے چھوٹے پھلکے ہوتے جو گھی میں چپڑے ہوتے۔ بھنے ہوئے پاپڑ ہوتے آم کا اچار ہوتا۔

ہندو کی رسوئی ایک متبرک جگہ ہوا کرتی تھی۔ ایک طرف پکیرے کا حصہ ہوتا دوسری طرف بیٹھ کر کھانے کا ــــ لیکن اس روز دریا گنج میں لوگ سڑک کے کنارے یوں کھا رہے تھے جیسے مجبوری میں کھا رہے ہوں۔ جیسے مصروفیت کا بھتنا سر پر لاٹھی لئے کھڑا ہو۔ جلدی ــــ جلدی ــــ اور جلدی۔

ایک گلاس

"ارے ــــ یہ کیا ــــ" دفعتاً میں چونکا۔ رک گیا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ــــ "یا اللہ ــــ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں"۔

میرے سامنے ایک ریڑی کھڑی تھی۔ وہ ریڑی ٹھنڈے پانی کی ریڑی تھی۔ نیچے ڈھول کے اندر پانی تھا۔ ــــ اردگرد برف تھی۔ ریڑی کے اوپر ایک نل لگا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ ربڑ کی نالی جڑی ہوئی تھی۔ نالی کے ایک سرے پر ربڑ کا ایک بڑا سا گیند تھا۔ ریڑی والا گیند کو دباتا۔ دبا دبا کر پانی اوپر کی طرف پمپ کرتا۔ حتیٰ کہ نل سے پانی بہنے لگتا ــــ اور ریڑی کے اوپر شیشے کا صرف ایک گلاس دھرا تھا ــــ صرف ایک گلاس۔

یا اللہ دلی میں یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ــــ صرف ایک گلاس۔ راہ گیر رکتے۔ ٹھنڈا پانی پیتے اور پھر پانچ پیسے ریڑی پر رکھ کر یہ جاوہ جا۔

نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی راج دھانی میں پانی۔ پانی ہو کر رہ جائے۔ صرف پانی۔ خالی پانی۔ نہیں نہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

جس ہندو سے میں واقف تھا۔ وہ تو پانی کا قائل نہ تھا۔ اس نے تو پانی کو دو الگ الگ قسموں میں بانٹ رکھا تھا۔ ہندو پانی۔ مسلمان پانی۔

ہندو پانی مسلمان پانی

تقسیم سے پہلے ریلوے سٹیشنوں پر آواز بلند ہوتی۔ مسلمان پانی۔ ہندو پانی۔ ایک قلی پانی سے بھری ہوئی بالٹی لئے پھرتا۔ ہندو پانی۔ ایک اور قلی پانی کی بھری ہوئی بالٹی لئے پھرتا۔ مسلمان پانی۔ دونوں قلی ایک جیسے ہوتے۔ ان کی کالی وردیاں ایک جیسی ہوتیں۔ بالٹیاں ایک جیسی ہوتیں۔ پانی ایک جیسا ہوتا۔ پھر بھی ایک ہندو پانی ہوتا۔ دوسرا مسلمان پانی۔

مسلمانوں نے کبھی تخصیص نہ کی تھی کہ پانی ہندو ہے یا مسلمان۔ ان میں اتنا صبر نہ تھا کہ مسلمان پانی کا انتظار کرتے۔ دراصل مسلمان کے لئے پانی پانی تھا۔ نہ وہ ہندو تھا نہ مسلمان تھا۔ ہندو انتظار کرتا تھا کہ کب ہندو پانی آئے۔ اس کے نزدیک صرف ہندو پانی، پانی تھا۔

مسلمان اپنی بے نیازی کی وجہ سے ہندو پانی کے سامنے جا بیٹھتا۔ قلی گڑوی بھرتا۔ مسلمان اوک بناتا۔ قلی گڑوی کو مسلمان سے اتنی دور رکھتا جتنا ممکن ہوتا۔ اوپر دور —— سے دھار گرتی، نیچے مسلمان۔

پلا دے اوک میں ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

صرف سٹیشنوں پر ہی نہیں۔ بازاروں میں، گزرگاہوں میں، راہوں میں جگہ جگہ ہندو چھبیلیں لگی ہوتی تھیں۔

ہندو میں پن کا بڑا خبط ہے۔ دان کرتا ہے۔ لیکن گپت دان۔ دان ہو۔ نام نہ ہو۔ دکان بند کرنے سے پہلے بکری کا مخصوص فی صد دان ہو جائے۔ دکان بند نہیں ہو سکتی جب تک دان دے نہ دیا جائے۔ دان کرتے وقت وہ ہندو مسلمان کا خیال نہیں رکھتا۔

لیکن لوگوں کو پانی پلانے کا پن کرتے وقت وہ ہندو مسلمان کا خیال رکھتا تھا۔ پلاتا دونوں کو اوک سے تھا۔ فرق یہ تھا کہ ہندو ہوتا تو گڑوی اوک کے ساتھ لگی ہوتی۔ مسلمان ہوتا تو بانس کی اتنی لمبی نالی لگ جاتی پینے والا ادھر —— دور بیٹھا ہوتا۔ پلانے والے کی گڑوی

ادھر دور ہوتی کہ بھرشٹ نہ ہو جائے۔

ہندو مسلمان پانی کی وجہ سے میں نے پہلی مرتبہ رام دین کو دیکھا تھا۔ بیچارہ رام دین۔ نہ وہ رام بن سکا نہ دین اسے دیکھ کر میرا جی چاہتا تھا کہ میں دھاڑیں مار کر رو پڑوں۔

دھرم بھرشٹ

یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ جب میں سکول ماسٹر تھا۔ پکی نوکری ملتی نہ تھی۔ عوضیوں پر کام کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے دھرم سالہ گورنمنٹ سکول کا ایک ماسٹر چھ مہینے کی چھٹی پر چلا گیا اور اس کی جگہ میری تعیناتی ہو گئی۔

دھرم سالہ میں پہلی مرتبہ مجھے ایسے علاقے میں رہنے کا موقعہ ملا جہاں ہندو اکثریت میں تھے۔ مدرسے میں صرف دو طالب علم مسلمان تھے۔ شاف میں میں واحد مسلمان تھا۔

میں بہت پانی پیتا ہوں۔ یہ میری پرانی عادت ہے گلاس بھرا ہو اور بار بار ہو۔ زندگی میں اتنا پانی اندر ڈالا پھر بھی اندر کا زہر نہ دھلا۔ آگ نہ بجھی۔

ایک روز مسلمان لڑکا غیر حاضر تھا۔ میں نے ایک ہندو لڑکے سے کہا کہ مجھے ایک گلاس پانی لا دے۔ وہ سر لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے پھر سے کہا۔

وہ چپ رہا۔

میں نے پھر سے کہا۔

وہ رک رک کر بولا۔ "مہاراج میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا"۔ میں نے کہا "بیٹا دھرم بھرشٹ تب ہو گا جب تو مسلمان کے ہاتھ کا پانی پئے گا۔ پانی پلانے سے دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا"۔

وہ چپ کھڑا رہا۔ کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے پھر کہا۔

وہ پھر رک رک کر بولا "مہاراج ... میرا ..... دھرم بھرشٹ ہو جائے گا

—"

مجھے یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ وہ دھرم بھرشٹ جو میرے ذہن میں تھا۔ ان علاقوں کا دھرم بھرشٹ تھا جہاں ہندو اقلیت میں تھے۔

یہ دھرم بھرشٹ جو لڑکے کے ذہن میں تھا اس علاقے کا دھرم بھرشٹ تھا جہاں ہندو اکثریت میں تھے۔

پھر ایک دن بات میری سمجھ میں آ گئی۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ میں نے کہا چلو باہر چلیں۔ علاقے میں گھومیں پھریں۔ یہاں کتنے خوبصورت نظارے ہیں۔ میں نے تھیلا لٹکایا۔ سوٹی سنبھالی اور چل پڑا۔ چلتے چلتے بہت دور نکل گیا۔ پیاس لگی۔ پانی تو وہاں بہت تھا۔ جگہ جگہ چشمے تھے، ندیاں تھیں نالے تھے۔ دقت یہ تھی کہ صحت والوں نے جا بجا بورڈ لگا رکھے تھے۔ "خبردار پانی نہ پینا۔ صرف اسی جگہ سے پینا جہاں ہمارا بورڈ لگا ہو کہ یہ پانی پینے کے قابل ہے"۔

یہ احتیاط اس لئے برتی گئی تھی کہ علاقے کے پانی میں کوئی ایسی دھات موجود تھی جس کی وجہ سے گردن پر گِلّڑ نکل آتا تھا۔

پیاس نے پریشان کیا۔ کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی تھی جہاں اجازت نامے والا بورڈ لگا ہو۔

رام دین

دفعتاً ایک موڑ مڑا تو سامنے گاؤں تھا۔

گاؤں کے شروع میں ہی ایک دوکان تھی۔ دوکان کے سامنے لالہ جی بیٹھے منہ دھو رہے تھے۔ پانی کی بالٹی سامنے دھری تھی۔

میں پاس گیا۔ بولا "مہاراج کیا یہاں پینے کا پانی ملے گا"۔

لالہ جی نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔

بولا "مسلمان ہو؟"

"جی"۔

"کہیں جا رہے ہو"

”جی نہیں۔ گھوم پھر رہا ہوں“۔

”اچھا اچھا“۔ پھر اس نے سامنے گھر کی طرف اشارہ کیا ”وہاں جا کر پی لو۔ وہ مسلمان کا گھر ہے“۔

میں اس گھر کی طرف چل پڑا۔

وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ صحن خالی تھا۔ سامنے باورچی خانہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ نئی نئی گوبر کی لپائی ہو رہی تھی۔ چوکا بنا ہوا تھا۔ ادھر ادھر تھالیاں اور کٹوریاں بکھری پڑی تھیں۔ کارنس پر مٹی سے بنے ہوئے موٹے حروف میں اوم لکھا ہوا تھا۔

”نہیں نہیں یہ مسلمان کا گھر نہیں ہو سکتا“۔ میں نے سوچا۔ میں غلطی سے ادھر آ گیا ہوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر نظر پڑی۔ دیکھا تو دروازے کے اوپر ایک بت بنا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے یقین آ گیا یہ مسلمان کا گھر نہیں۔ ابھی مڑا ہی تھا کہ اندر سے ایک دبلا پتلا آدمی دھوتی سنبھالتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کہا۔ اس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔ سر پر بالوں کی بودی تھی۔

”مہاراج“۔ میں نے پوچھا ”یہاں کسی مسلمان کا گھر ہے کیا“۔

”جی مہاراج“۔ وہ بولا ”یہی ہے مہاراج“۔

”یہی کون سا“۔

”یہی میرا مہاراج“۔

”یعنی تم —“ میں رک گیا۔

”جی مہاراج۔ میں مسلمان ہوں۔ بھگوان کی کرپا سے میرا نام رام دین ہے“۔

پھر وہاں سے دھرم سالہ کے علاقے میں گھومتے پھرتے میں نے کئی ایک رام دین دیکھے اور مجھے پتہ چلا کہ رام دین فرد واحد کا نام نہیں بلکہ ہندو اکثریت کے علاقے کی ایک قوم ہے۔

اگر میں بار بار پانی پینے کا محتاج نہ ہوتا تو اتنی بڑی حقیقت سے کبھی روشناس نہ

ہوتا۔

وہ ہندو

لیکن یہ کیا۔ ہندو کی چھبیل پر ایک پانی ___ ایک گلاس یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میری نگاہ .... ضرور یہ میری نظر کا دھوکا ہے۔

دیر تک وہاں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔

راہ گیر آتے تھے، رکتے تھے، پانی کا گلاس پیتے پھر پانچ پیسی رکھ کر اپنی اپنی راہ لیتے۔

ان میں سکھ بھی تھے، مسلمان بھی تھے، ہریجن بھی تھے، شاید براہمن بھی ہوں۔ ضرور ہوں گے۔ میں نے سوچا۔ پھر میں راہ گیروں کی طرف دیکھنے لگا۔

زیادہ تر لوگ مغربی لباس میں ملبوس تھے۔ ڈرائنگ رومش مغربی لباس نہیں ورک مین بوشرٹ پتلون تو عام تھی بہت عام مگر وہ پتلون نہ تھی کریز سے بے نیاز سج دھج سے بے گانہ۔ جیسے کام میں آسانی اور چلنے پھرنے میں چستی کا نشان ہو۔ وہ دھوتی نظر نہیں آ رہی تھی جو پہلے عام نظر آیا کرتی تھی۔ سر ننگے تو بہت تھے۔ لیکن سر پر بودی نہ تھی۔ ماتھے پر ٹیکا نہ تھا۔ پاؤں میں کھڑاواں نہ تھیں۔ انداز میں وہ سمٹنا نہ تھا جو احساس بھرشٹ کا مظہر ہوا کرتا تھا۔

یا اللہ وہ ہندو کہاں گیا ___ کیا ہند نے اس ہندو کا جنازہ نکال دیا۔ لیکن ہندوستان تو اکھنڈ ہند اور رام راج کا نعرا لگا رہا ہے۔ جب ہندو ہی نہیں رہا تو پھر رام راج کیسا ___ لیکن ٹھہریئے شاید رام خود ہندو نہ ہوں۔

وہ ہندو نہ ہوں جسے میں ہندو سمجھتا تھا جانتا تھا پہچانتا تھا۔ جو قدم قدم پر اعلان کرتا تھا کہ میں ہندو ہوں۔ میری جاتی اونچی ہے۔ میں اونچ نیچ کا شیدائی ہوں۔ اونچ نیچ کے بغیر میرا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

”ارے ___“ میں گھبرا گیا۔ سہم گیا۔ میرا ساتھی اشفاق حسین جو اس دوران میں راگ ودیا کی ایک دوکان پر کھڑا سکھ دوکاندار سے باتیں کر رہا تھا دفعتاً مڑا اور پانی کی ریتڑی کی طرف بڑھا۔

ارے یہ کیا ایک پاکستانی مسلمان اشفاق حسین اس واحد گلاس میں پانی پی رہا تھا اور ریڑی والا ہندو یوں مطمئن کھڑا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

پانی پینے کے بعد اشفاق حسین میرے پاس آیا۔ بولا "یار بڑا عمدہ پانی ہے۔ صاف ٹھنڈا۔ تم بھی پی لو۔ دلی میں یہ پانی کی ریڑیوں کا رواج بڑا اعلیٰ ہے پانچ پیسے دو اور ٹھنڈا پانی پی لو"۔

"رواج ــــ" میں نے حیرت سے اشفاق کی طرف دیکھا۔

"ہاں رواج"۔ وہ بولا۔

"یہ تو ایک ریڑی ہے"۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں"۔ وہ بولا "ایک نہیں۔ دلی میں ایسی ریڑیاں جگہ جگہ کھڑی ہیں۔ وہ دیکھو سامنے پٹڑی پر ایک ایسی ہی ریڑی کھڑی ہے۔ پھر وہ چوک کے پاس ایک ہے۔ میں نے تو راستے میں چار ایک دیکھی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی سیٹھ نے پانی کا کاروبار چلا رکھا ہے۔ سینکڑوں ریڑیاں بنوا کر شہر میں جا بجا کھڑی کر دی ہیں۔ کاروبار کا کاروبار پن کا پن۔

یہ ہندو:

"اور وہ ہندو پانی کیا ہوا"۔ میں نے کہا "وہ بالٹی اور گڑوی۔ وہ بانس کی اتنی لمبی نالی۔ اور وہ اوک یاد ہے"۔

"ہاں مجھے یاد ہے"۔ وہ ہنسا ــــ "لیکن ...." اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "یہاں تو ہندو پانی نظر نہیں آتا"۔

"یار اشفاق حسین مجھے تو یہاں ہندو ہی نظر نہیں آتا تم پانی کی بات کر رہے ہو"۔

"ہاں ــــ" وہ مسکرایا۔ "وہ ہندو نظر نہیں آتا"۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ نئی نسل نے ہندو کا گلا گھونٹ کر اسے زمین میں دبا دیا ہو"۔ میں نے پوچھا۔

اشفاق حسین ہنس پڑا "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ہندو کا گلا کوئی نہیں دبا سکتا۔

صدیوں سے کوئی نہ دبا سکا۔ بدھ آئے، مسلمان آئے، سکھ آئے، انگریز آئے، ہندو کا کوئی بال بیکا نہ کر سکا۔ نئی نسل کی کیا حیثیت ہے کچھ نہیں“۔

”سچ کہتے ہو“۔ میں نے جواب دیا۔

”ہندو پانی بدل سکتا ہے“۔ وہ بولا ”ظاہری بھرشٹ بدل سکتی ہے۔ لیکن صدیوں سے دلوں میں بیٹھی ہوئی بھرشٹ کیسے بدل سکتی ہے۔ صدیوں سے خون میں رچی ہوئی اونچ نیچ کیسے بدل سکتی ہے“۔

اشفاق حسین یوں چھڑ گیا تھا جیسے بھڑوں کا چھتہ چھڑ جاتا ہے۔ وہ بولے جارہا تھا۔ بولے جارہا تھا۔

”تم نے دلی کے مسلمانوں کو دیکھا ہے کیا۔ ان کے چہروں پر خوف، بے بسی اور بے چارگی کا عالم دیکھا ہے کیا۔ انہیں دیکھو۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو نہیں بدلا۔ تم نے ان ہریجنوں کو دیکھا ہے جو ہمایوں کے مقبرے کے سامنے پیومنٹ پر ڈیرہ ڈالے بیٹھے ہیں۔ ان کی گردنیں یوں چھاتی پر لٹکتی ہیں جیسے ان میں ابھرنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ وہ ہر آہٹ پر چونکتے ہیں اور سہم کر ایک طرف ہو جاتے ہیں تاکہ کسی راہ چلتے ہندو کی حقارت کا شکار نہ ہو جائیں۔ بولو۔ بولو“۔ وہ چلایا۔ ”تم خود کو ادیب سمجھتے ہو کیا۔ سمجھتے ہو تو کیا یہ تفصیلات تمہیں نظر نہیں آتیں۔ تم ہندو کا چہرا براہ راست کیوں دیکھتے ہو۔ اس کے چہرے کا دل سے کوئی رابطہ نہیں۔ یہ رابطہ صدیوں سے ٹوٹ چکا ہے“۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو“۔ میں نے جواب دیا۔

”ہندو کو نہ دیکھو۔ گرد و پیش ان لوگوں کو دیکھو جن کی تقدیریں ہند کے ہاتھ میں ہیں“۔

”تم نے امرتسر میں سکھ کو دیکھا تھا نا“۔

”دیکھا تھا“۔

”اونہوں — دیکھتے تو کبھی نہ کہتے کہ ہندو مر گیا ہے“۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ سکھ اپنے نگر میں اپنے صوبے میں یوں دبا ہوا ہے جیسے لتاڑا گیا ہو۔ ابھر نہ سکتا ہو“۔

”یہاں دلی میں تو ابھر رہا ہے“۔ میں نے جواب دیا۔

”ہاں ابھر رہا ہے“۔ وہ بولا ”لیکن کس قیمت پر۔ اسے پوچھو“ پتہ نہیں اشفاق

اپنی تقریر کب تک جاری رکھتا لیکن دفعتاً ہمارے سامنے بھنڈاری کا بورڈ آ کھڑا ہوا۔

بھنڈاری

دریا گنج کے اختتام پر بھنڈاری کی دوکان تھی۔ ہم دونوں دوکان میں داخل ہو گئے۔ دوکان ایک ہال اور تین کمروں پر مشتمل تھی۔ یہ تینوں کمرے ہال سے ملے ہوئے تھے۔ داخل ہوتے ہی سامنے ایک کاؤنٹر تھا جس پر دو گھریلو قسم کی لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی ابھی رسوئی سے پوریاں تل کر باہر نکلی ہوں۔ ان کے پیچھے الماریوں میں دوائیاں اور کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔

سامنے دیوار پر ایک بڑا سا فریم آویزاں تھا۔ جس پر ایک معزز اور پاکیزہ صورت لالہ جی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

لالہ جی کی تصویر کو دیکھ کر مجھے اپنے بزرگوں کی تصویریں یاد آ گئیں۔ وہی اطمینان اور سکون بھری شکل۔ وہی وقار، وہی سادگی۔ غالباً یہ تصویر بھنڈاری کی تھی۔

ایک کمرے میں اکیلی میز پر ایک معصوم صورت چھوٹی عمر کی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ غالباً وہ بھنڈاری جی کی بیٹی تھی۔ خاموش۔ پروقار۔

ساری دوکان کا ماحول کچھ عجیب سا تھا۔ کاروباری رنگ مفقود تھا۔ دوکان کی فضا کے لحاظ سے وہ دوکان لگتی ہی نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی آشرم ہو۔ اگرچہ دوکان کے تمام لوازمات موجود تھے۔ شیلف کتابوں اور دوائیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر لگے ہوئے تھے۔ سیل گرلز چاق و چوبند کھڑی تھیں پھر بھی کمرشل رنگ مفقود تھا۔

اوشا

پھر دفعتاً ایک کمرے سے اونچی لمبی دبلی پتلی سی لڑکی باہر نکلی۔ دوکان میں جیسے ایک دم بانکپن کی ایک کرن پھوٹی۔ ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ ساری دوکان ایک

رنگین تبسم سے بھر گئی۔

اوشا کی آنکھیں کشتیوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چال میں چستی تھی۔ ترت پھرت تو تھی مگر چھینٹے نہیں اڑتے تھے ـــــ جاذب توجہ تو تھی لیکن توجہ کا مطالبہ نہ تھا۔ رنگ پچکاری تو تھی لیکن رنگ میں شر کا عنصر نہ تھا۔
اوشا کی آمد سے دوکان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

اشفاق حسین نے اپنے مدھم انداز میں بات کی۔ کہنے لگا "ہم پاکستان سے صرف ہومیو پیتھی کی کتابیں خریدنے آئے ہیں۔ ہند ہومیو پیتھی کا دوست ہے"۔
اوشا مسکرائی۔ بولی "یہاں تو لوگ ڈاکٹروں کے پروانے ہیں۔ انہی پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ہومیو پیتھی کو کوئی نہیں پوچھتا"۔

"ہمارے ہاں بھی یہی حال ہے"۔ اشفاق حسین مسکرایا۔ "شاید یہاں سے بھی زیادہ۔ بہرحال ہند نے ہومیو پیتھی کو بڑا بڑھاوا دیا ہے۔ ہمیں صرف ہندی ہومیو پیتھوں کی لکھی ہوئی کتابیں چاہئیں۔ شلنگل کی۔ گوہا کی، ورما کی، چودھری کی"۔

سب لڑکیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ حالانکہ اس دوران دوکان میں اکا دکا گاہکوں کی آمد و رفت جاری تھی اور لڑکیاں گاہکوں کے مطالبات کو چستی اور خندہ پیشانی سے پورا کئے جا رہی تھیں لیکن ان کے کان ہماری طرف لگے ہوئے تھے۔

اوشا مسکرائی۔ بولی "مغربی لکھنے والوں کی کتابیں کیوں نہیں جی"۔
"مغربی معالج ہمارے مزاجوں سے واقف نہیں۔ ہند کے اور پاکستان کے مریضوں کے مزاج ایک جیسے ہیں"۔

لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ "کون کون سی کتابیں چاہئیں"۔ ایک نے کہا۔
اشفاق حسین ہنسا۔ "بس میں ہو تو ہم ساری دوکان خرید لیں لیکن کیا کریں ہم غریب لوگ ہیں"۔

"دکھتے تو نہیں"۔ دوسری گھریلو لڑکی نے کہا۔
"بس یہی تو آپ میں اور ہم میں فرق ہے"۔ اشفاق حسین نے کہا۔ "آپ امیر ہیں پر امیر دکھتے نہیں۔ ہم غریب ہیں مگر غریب دکھتے نہیں"۔

اس پر ساری لڑکیاں ہنس پڑیں۔

“آپ عجیب باتیں کرتے ہیں”۔ اوشا بولی۔

“جی”۔ اشفاق حسین نے کہا “اس لئے کہ ہمیں باتوں کو بنا سجا کر پیش کرنا نہیں آتا”۔

“آپ لاہور کے ہیں” اوشا نے پوچھا۔

“جی”۔

“میں بھی لاہور سے ہوں”۔ وہ بولی۔

“آپ کے منہ پر لاہور لکھا ہوا ہے”۔ اشفاق حسین نے کہا۔

“اچھا”۔ وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔

ایک گھریلو لڑکی بولی۔ “بھنڈاری جی بھی لاہور کے تھے۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے”۔

“جبھی”۔ اشفاق حسین نے کہا۔

“جبھی کیا”۔ اوشا نے ڈولتی آنکھوں کو سنبھالا۔

“جبھی اس دوکان میں آکر میں محسوس کر رہا ہوں کہ گھر آگیا ہوں”۔

دوکان فرط انبساط سے گونجنے لگی۔

وہ معصوم لڑکی جو اکیلی کمرے میں چپ چاپ بیٹھی تھی اس کا چہرا بھی تبسم سے دمکنے لگا۔

پھر ایسے لگا جیسے وہ دوکان نہ ہو۔ گھر ہو۔ دلی نہ ہو لاہور ہو اور وہ لڑکیاں سیل گرلز نہ ہوں۔ جیسے ہم سب ایک ہی خاندان کے فرد اپنے گھر میں بیٹھے ہوں اور ایک دوسرے سے دل کی باتیں کر رہے ہوں۔

اس وقت دوکان خلوص، سادگی بے تکلفی اور اپنائیت سے یوں بھری ہوئی تھی جیسے گاؤں کا کوئی آنگن ہو۔ پتہ نہیں ہم کب تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یوں باتیں کرتے رہے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ان باتوں میں وہ لڑکی بھی شامل تھی جو دور چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بن بولے شامل تھی۔

وہ باتیں نمائشی باتیں نہ تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں۔ کچی پکی باتیں۔ وہ باتیں جو چھپانے کے لئے نہیں بلکہ بتانے کے لئے کی جاتی ہیں۔ وہ باتیں جو ذہن سے نہیں بلکہ دل سے نکلتی ہیں۔ وہ باتیں جو کانوں سے رینگ رینگ کر روح تک جا پہنچتی ہیں۔ اس وقت ہم بھول گئے کہ وہ لڑکیاں ہیں، وہ بھول گئیں کہ ہم مرد ہیں۔ مسلمان ہیں، پاکستانی ہیں، ہم بھول گئے کہ وہ ہندو ہیں، ہندی ہیں۔

کم از کم اس ایک دوکان میں پاکستان اور ہند کے درمیان ڈر خوف اور نفرت کی وہ دیوار جو دھرم بھرشٹ کے جذبے نے پیدا کر رکھی تھی معدوم ہو چکی تھی۔ انسانیت کے جذبے نے ہم سب کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

روز و شب

جب ہم اسلام آباد سے عازم سفر ہوئے تھے تو ہمارے لئے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کیا کیا سامان ساتھ لے جائیں۔

حج دفتر نے اس مسئلے میں ہماری رہنمائی نہ کی تھی۔ ہمیں یہ بھی علم نہ تھا کہ ہند میں ہم کس جگہ قیام کریں گے۔ آیا ہمیں چارپائیاں ملیں گی یا نہیں۔ بستر ساتھ لے جانے ہوں گے یا نہیں۔ وہاں کھانے کا کیا انتظام ہو گا۔ یہ انتظام، انتظامیہ کے ذمے ہو گا یا زائرین کو از خود کرنا ہو گا۔

حکم نامہ ہدایت نامہ

حج دفتر نے ایک تحریری ہدایت نامہ جاری کیا تھا۔ یہ ہدایت نامہ موسیٰ کے ہدایت نامے کے خطوط کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا جس میں DOS کی بجائے DONTS پر زور دیا گیا تھا۔ اس میں زائرین کو بتایا گیا تھا کہ وہاں کیا نہیں کرنا۔ یہ نہیں کہ وہاں کیا کرنا ہے۔ اور یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ اگر منفی ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو آپ کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

موٹی موٹی مناعیاں یہ تھیں۔

کیمرا، ریڈیو، دور بین، ٹیپ ریکارڈر ساتھ مت لے جاؤ۔

غیر مذہبی رسومات میں مت شامل ہونا۔

انٹرویو یا بیان مت دو۔

ممنوعہ اشیاء مت لے جاؤ یا مت لاؤ۔

زیارت پارٹی سے الگ قیام مت کرو۔

ہندی حکام یا سفارت پاکستان کو عرضی مت دو۔ ان سے سلسلہ جنبانی مت کرو۔

لیڈر کی حکم عدولی مت کرو۔

یہ ہدایت نامہ خبردار اور مت سے بھرا ہوا تھا۔

اپنی نوعیت میں یہ ہدایت نامہ ہدایت نامہ نہ تھا بلکہ حکم نامہ تھا۔ اگر اس حکم نامہ کے ساتھ ساتھ ایک ہدایت نامہ بھی شامل کر دیا جاتا تو ہمیں سہولت ہو جاتی۔ اب ہماری مشکل یہ تھی کہ کس سے پوچھیں کہ اپنے ساتھ کیا کیا لے کر جائیں۔

حج دفتر میں دوسری بار جانے کی میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر بھی اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہاں جا کر کچھ اتہ پتہ مل جائے گا تو میں یقیناً جانے کی جرات کر لیتا۔

لوٹا

اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں ایک خان صاحب ملے، بولے ”دیکھو بائی۔ اور کچھ لے کر جاؤ یا نہ جاؤ ایک لوٹا ضرور لے جانا“۔

ہم نے کہا ”خان صاحب لوٹا اتنا اہم ہے کیا“۔

خان صاحب بولے۔ ”تم یہ سمجھ لو بائی کہ وہاں ڈیرے پر دو کیو لگے رہتے ہیں۔ ایک لیٹرین پر دوسرا لوٹے پر۔ اس لئے ہم تم سے بولتا ہے کہ تم لوٹا ضرور لے کر جانا۔

ہم نے کہا ”کوئی دوسری چیز بتائیے جو ساتھ لے جانا ضروری ہو“۔

خان صاحب بولے ”دوسری چیز یہ ہے کہ ایک زنجیر اور تالا ساتھ لے جاؤ“۔

”وہ کس لئے خان صاحب“ ؟

”وہ اس لئے کہ جب تم لوٹا سرہانے رکھ کر سو جائے گا اور صبح جاگے گا تو دیکھے گا کہ لوٹا وہاں نہیں ہے۔ کوئی لوٹا لے جائے گا۔ اس لئے جب تم سونے لگو تو لوٹے کو زنجیر

سے باندھ کر چارپائی سے تالہ لگا دو تاکہ لوٹا محفوظ رہے"۔

"لوٹا اتنا ہی اہم ہے کیا"۔ اشفاق نے پوچھا۔

"بہت"۔ خان صاحب بولے۔ "دیکھو وہاں جا کر لوگ دو کام کرتا ہے یا تو نمازیں پڑھتا ہے یا لیٹرین جاتا ہے"۔

پانی اچار

دوسرے صاحب جو ہمیں ملے وہ بولے "دیکھئے جناب آپ کو وہاں پینے کے پانی کی بہت تکلیف ہو گی۔ لہٰذا اور کچھ لے جائیں یا نہ لے جائیں۔ ایک بڑا سا واٹر کولر ضرور لے کر جائیں۔ تاکہ آپ کو ٹھنڈا اور صاف پانی پینے کو ملے"۔

"انتظامیہ وہاں ٹھنڈے پانی کا بندوبست نہ کرے گی کیا"۔ اشفاق حسین نے پوچھا۔

"مشکل ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔ "انتظامیہ کو اور بھی کام ہوں گے جن سے فرصت نہیں ملتی"۔

"مثلاً ـــــ" میں نے پوچھا۔

"بھئی انتظامیہ کو سب سے بڑا کام تو انتظام کرنے کا ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اس لئے وہ پانی وانی کی طرف توجہ نہ دے سکے گی"۔

تیسرا آدمی جو ہمیں ملا ٹھیٹھ پنجابی اور تاجر تھا بولا "جناب آپ کچھ اور لے کر جائیں یا نہ جائیں لیکن کوئی کھانے پینے کی چیز ضرور لے جائیں"۔

"زائرین کے کھانے کا انتظام انتظامیہ کے ذمے نہیں ہو گا کیا"۔

"اونہوں۔ کھانے کا انتظام اپنا ہوتا ہے۔ وہاں حضرت نظام الدین کی بستی میں صرف دو تنور قسم کے ہوٹل ہیں۔ جہاں کھانا تو مل جاتا ہے۔ لیکن دو ہی دنوں میں یا تو ڈائریا ہو جاتا ہے اور یا پیچش"۔

"میں تو بیمار ہوں"۔ اشفاق حسین گھبرا کر بولا۔

"اگر یہ بات ہے تو آپ نہ جائیں"۔ وہ بولا۔

یہ سن کر اشفاق حسین تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"کھانے کی کس قسم کی چیز لے جائیں وہاں"۔ میں نے پوچھا۔

"ہم تو جناب سالٹڈ بیف کا ایک ڈبہ لے گئے تھے۔ ایک بوتل اچار کی ایک مربے کی ایک چٹنی کی اور وہاں جا کر ہم نے مچھلی کے ڈبے اور انڈے خرید لئے تھے۔ ساتھ ایک سٹوو رکھ لیا تھا"۔ جب ہم دلی پہنچے اور اس مقام کا جائزہ لیا جہاں ہمیں قیام کرنا تھا تو جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ جن معلومات سے ہم لیس ہو کر گئے تھے سب کی سب حرف بحرف درست تھیں۔

سکہ بند:

لوٹے کی جگہ ہم ایک بڑا مگ لے گئے۔ لیکن افسوس ہے کہ زنجیر نہ لے گئے۔ وہ مگ ہمارے پاس صرف ایک دن رہا۔ اگلے روز اپنی جگہ پر موجود نہ تھا۔

انتظامیہ وہاں انتظامات میں واقعی اس شدت سے مصروف تھی کہ پانی، چائے یا کھانے کے متعلق سوچنے کی اسے فرصت نہ تھی۔

لیڈران کرام خالص سوفی صد لیڈر تھے۔ ان کا برتاؤ سکہ بند لیڈروں کا سا تھا۔ وہ الگ کمرے میں ٹھہرے جو زائرین سے سو دو سو قدم پر تھا۔ وہیں سے ہدایات بھجواتے تھے۔

کبھی کبھار تشریف لاتے اور نہایت اخلاق اور محبت سے کہتے "آپ خیریت سے تو ہیں۔ امید ہے آپ کا وقت آرام سے گزر رہا ہو گا۔ اگر آپ کو کوئی تکلیف ہو تو از راہ کرم ہمیں اطلاع دیں۔ ہم خدمت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں گے"۔

بے شک ان کا رویہ خالص لیڈرانہ تھا۔

مجھے زندگی میں بہت سے لیڈر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہم لوگ خواہ مخواہ لیڈروں پر الزام دھرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لیڈر وہی روپ دھارنے پر مجبور ہو گا جسے پیروکار پسند کرتے ہیں۔ اگر پیروکار سرخ رنگ پسند کرتے ہیں تو وہ سرخ رنگ اختیار کر لیں گے۔ اگر سبز پسند ہے تو سبز اختیار کر لیں گے۔

مجھے یاد ہے۔ ہمارے ایک بہت بڑے محبوب لیڈر تھے۔ وہ ایک محل نما مکان میں رہتے تھے لیکن چونکہ تھے مزدوروں کے لیڈر اس لئے انہوں نے اپنا ڈرائنگ روم سرونٹ

کوارٹرز میں بنا رکھا تھا۔ جہاں التزاماً ٹوٹی ہوئی کرسیاں رکھی جاتی تھیں۔ مٹی کے پیالوں میں چائے پیش کی جاتی تھی۔ ٹرے کی جگہ چنگیر استعمال ہوتی تھی۔

مزدوروں کو علم تھا کہ رہائشی محل میں چاندی کے برتن استعمال ہوتے یں پھر بھی وہ سرونٹ کوارٹر کے انتظام پر بہت خوش تھے اور اکثر یہ کہتے مزدوروں کا لیڈر ہوا نا۔ واہ کیا لیڈر ہے۔

وہاں دلی میں میں بھی اپنے لیڈر پر بے حد خوش تھا۔ لیڈر ہوا نا۔ واہ۔ سبحان اللہ۔ کیا حسن اخلاق ہے۔ کیا میٹھی زبان ہے۔ آج کے دور میں لیڈر کے لئے میٹھی زبان سے بہتر کوئی وصف نہیں۔

شکوہ شکایت

اس ترکی حمام میں اسی پچاسی کے قریب زائرین مقیم تھے۔ ان میں رنگ رنگ کے لوگ موجود تھے۔ لیکن چند ایک خصوصیات کسی نا کسی حد تک سب میں موجود تھیں۔

وہ سب سادہ مزاج تھے، مخلص تھے، جذباتی تھے، اسلام پسند تھے۔ بیشتر نمازی تھے۔ کچھ عابد بھی تھے۔

ان میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ انہوں نے زندگی سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔

نہیں میں غلط کہہ رہا ہوں۔ زندگی سے امیدیں تو ہر کوئی استوار کرتا ہے۔ لیکن جو امیدیں مسلسل پوری نہیں ہوتیں انہیں امیدوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ صرف امیدیں باندھنا جانتے تھے خارج کرنا نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا ان امیدوں کی وجہ سے دکھی تھے۔ شکوہ شکایت سے یوں رس رہے تھے جیسے چیڑ کا تنا بروزے سے رستا ہے۔

شکوہ شکایت کرنے والوں میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ مل بیٹھتے ہیں۔ شکایت کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی سننے والا بھی ہو۔ چونکہ بار بار کی جاتی ہے۔ لہٰذا عادت بن جاتی ہے۔ وہ اس لئے نہیں کی جاتی کہ اسے کوئی دور کرے۔ نہ نہ۔ اگر دور ہو جائے تو پھر شکایت کرنے کی لذت ہی ختم ہو جائے۔ جب شکایت کرنا لذت دہ ہو جائے تو پھر

وہ آرٹ فار آرٹ سیک بن جاتی ہے۔ رو رو کر نہیں ہنس ہنس کر کی جاتی ہے۔ تفریح کے طور پر کی جاتی ہے۔ ٹیبل ٹاک کے طور پر کی جاتی ہے۔

زائرین فرصت کے وقت درختوں تلے چارپائیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ایک گروپ غسلخانوں کے پاس اپنا ڈیرہ جمالیتا۔ دوسرا پولیس چوکی کی جانب، تیسرا برآمدے میں۔ اور وہاں ٹیبل ٹاک شروع ہو جاتا۔

اس ٹیبل ٹاک کے تین موضوع تھے۔ ایک لیڈران کرام اور ان کے انتظامات۔ دوسرا ہند اور اس کا رویہ اور تیسرا ہند و پاک کا موازنہ۔

چائے اور سقاوے :

ترکی حمام میں صبح سویرے ایک لڑکا بائیسکل پر ایک صندوق رکھے آپہنچتا۔ صندوق سے سٹوو نکالتا۔ چائے کا دوسرا سامان نکالتا۔ سٹوو جلاتا۔ کیتلی چولھے پر رکھتا۔ چائے بناتا اور پھر انڈے ابال کر چھیل کر ایک پلیٹ میں سجا دیتا۔ پتہ نہیں یہ انتظامیہ کا انتظام تھا یا وہ لڑکا از خود آجاتا تھا۔ انتظامیہ کہتی تھی ہمارا انتظام ہے لڑکا کہتا تھا از خود آتا ہوں۔

بہرحال چائے کڑک ہوتی اور انڈے ہارڈ بائیل۔

اس قیام گاہ میں کئی ایک خوبیاں تھیں۔ ایک تو بہت فراخ تھی۔ دوسرے سارے زائرین ایک ہی کمرے میں سما گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ اس کے ارد گرد وسیع میدان تھا جس پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ چوتھے یہ کہ اس عمارت سے ملحقہ چار پختہ غسلخانے تھے۔ باتھ روم نہیں۔ غسلخانے جو پرانی طرز کے بنے ہوئے تھے جیسے پرانے زمانے میں کنوؤں کے ساتھ سقاوے بنے ہوا کرتے تھے۔ ان غسلخانوں کی خوبی یہ تھی کہ ان میں ہر وقت پانی چلتا تھا۔ کمیٹی کے نلکے کی طرح نہیں بلکہ کنویں کے سقاوے کی طرح۔ پانی کا دھارا گرتا تھا۔ بوند بوند میں نہیں۔ اور یہ پانی نلکے کی طرح ابلا ہوا نہ ہوتا بلکہ ٹھنڈا پانی ہوتا۔

دقت صرف یہ تھی کہ ۸۰ / ۸۵ آدمیوں کے لئے صرف چار فسلخانے تھے لیکن دقت صرف ان لوگوں کے لئے تھی جو صبح صبح نہانے کے عادی ہوتے ہیں۔ بے شک اس رہائش گاہ میں بڑی خوبیاں تھیں۔ نقص صرف ایک تھا۔ کہ دن کے وقت وہ قابل رہائش نہ تھی۔

جنتی مخلوق

پہلے دو ایک دن تو تمام زائروں کی توجہ حضرت امیر خسرو اور حضرت نظام الدین کی درگاہ پر مرکوز رہی۔ پھر سیر و تفریح کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت امیر خسرو کا عرس آگیا۔ عرس کے بعد سب لوگ خرید و فروخت میں مصروف ہو گئے۔

ہر زائر کے پاس فرمائشوں کی ایک لسٹ تھی جسے وہ بار بار کھولتا پڑھتا اور پھر سنبھال کر جیب میں رکھ لیتا تھا۔ ان لسٹوں میں سب سے زیادہ فرمائشیں گھر والیوں کی تھیں جنہیں پورا کرنے کے لئے سبھی جان کی بازی لگانے کو تیار تھے۔

مرد سے زیادہ معصوم اور جنتی مخلوق میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

مرد دن بھر کام کرتا ہے تاکہ گھر کے افراد کا پیٹ پال سکے۔ بیوی کی فرمائشیں پوری کر سکے۔ بیٹی کو اس کی ماں کے چاؤ کے مطابق جہیز دے سکے۔ بیٹے کا بیاہ ٹھاٹھ سے کر سکے تاکہ بیٹے کی ماں کی ناک نہ کٹے۔ اور یہ سب کام وہ صرف ایک بات کے عوض خوشی خوشی کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ مجھے گھر کا بڑا سمجھو۔ بڑا سمجھنے کے بعد چاہے مجھے اپنی خدمت میں لگائے رکھو۔ کہو چودھری پھر چاہے اپنے جوتے صاف کراؤ۔ جھاڑو دلاؤ۔ لیکن کہو چودھری۔

میں گھر کا بڑا ہوں۔ میں تمہارے لئے محنت کروں گا، مشقت کروں گا، کما کر لاؤں گا۔ جھولی بھروں گا۔ خبردار میرے ہوتے ہوئے کوئی کمانے کی فکر نہ کرے۔ جان من تم کیوں نوکری کرو۔ میں جو ہوں۔ جب تک میں جیتا ہوں۔ تم سب بیٹھ کر کھاؤ، پیو عیش کرو۔

آج کی بیوی کہتی ہے۔ نہیں میں آزادی چاہتی ہوں میں نوکری کروں گی۔ میاں کہتا ہے نہیں تم نوکری نہیں کرو گی۔ میں جو ہوں۔

ارے احمق تو اسے نوکری کرنے سے کیوں روکتا ہے۔ اسے کہو بی کر نوکری۔ میں گھر بیٹھ جاتا ہوں تو نوکری کر۔ خود بھی کھا مجھے بھی کھلا۔

قدرت اللہ شہاب دورے پر برما گئے تو اتنے متاثر ہو کر آئے کہ حد نہیں۔ بولے میرا جی چاہتا ہے برما میں جا کر مقیم ہو جاؤں۔

میں نے کہا "وہاں کی زندگی بہت پسند آئی"۔

بولے "بہت"۔

میں نے کہا "کیسی ہے"۔

بولے "مردوں کے لئے جنت ہے"۔

میں نے پوچھا "وہ کیسے"۔

بولے۔ "سارا کام عورت کرتی ہے۔ دکان چلاتی ہے۔ کاروبار کرتی ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہے کھانا پکاتی ہے بچے پالتی ہے گھر کا رکھ رکھاؤ کرتی ہے۔ رکشا چلاتی ہے"۔

"اور مرد کیا کرتا ہے" میں نے پوچھا۔

بولے "جھولے میں بیٹھ کر چرٹ پیتا رہتا ہے"۔

ہاں تو سکاؤٹ کیمپ کی اس پناہ گاہ میں ہر زائر کی جیب میں بیوی کی فرمائشوں کی ایک فہرست تھی جسے وہ یوں سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا جیسے جنت میں داخل ہونے کا پروانہ ہو۔

ہر زائر پیسے بچانے کی دھن میں لگا تھا۔ کم کھاتا تھا۔ رکشے کی بجائے پیدل چلتا تھا۔ بسوں کے انتظار میں دھوپ میں سوکھتا تھا۔ تاکہ کڑھائی والی کشمیری چادر کی گنجائش نکلے۔

خریداری کا یہ خبط عرس کے اختتام پر رونما ہوا۔

بیس اکیس بائیس

ایک روز ہم سب درختوں تلے بیٹھے مکھیاں اڑا رہے تھے کہ ایک زائر دوڑا دوڑا آیا کہنے لگا "لیڈر صاحب بلا رہے ہیں"۔ یہ پیغام سن کر زائرین بہت خوش ہوئے۔ سمجھے کہ شاید ہندوستانی کرنسی کا چوگا ملے گا"۔

جب ہم لیڈر صاحب کے کمرے میں پہنچے تو پتہ چلا کہ عرس کے متعلق اعلان ہو گا۔

لیڈر نے اپنی شیریں آواز میں اعلان کیا کہ عرس ۲۰ تاریخ کو ہو گا۔ اور عرس میں

اندرا کے خاص حکم کے تحت ہند کا ایک وزیر شرکت کرے گا۔ اور پاکستان زائرین سے ملاقات کرے گا۔

لیڈر صاحب نے سب کو تاکید کی کہ عرس میں باقاعدگی سے شمولیت کی جائے۔ جلوس کی شکل میں حاضری دی جائے۔ اور چادر چڑھائی جائے۔

اسی روز دوپہر کے وقت ایک صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے ایک چھپا ہوا پروگرام زائرین میں بڑے اہتمام سے بانٹا۔ اس پروگرام میں عرس کی تقریب کے لئے ۲۱ تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ پھر شام کے وقت دو چار اصحاب ایک اور چھپا ہوا پروگرام بانٹ گئے جس میں عرس کی تقریب ۲۲ کو دکھائی گئی تھی۔

اس بات پر میں بوکھلا گیا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عرس کی تقریب ۲۰ کو ہوگی ۲۱ کو یا ۲۲ کو۔ سلرا دن میں لوگوں سے پوچھتا پھرا کہ بھائیو عرس کی تقریب کب ہوگی۔

رات کو ایک بزرگ صورت زائر مجھے پریشان حال دیکھ کر بولے "آپ ناحق پریشان نہ ہوں۔ عرس کی تقریب ۲۰ کو بھی ہوگی ۲۱ کو بھی ۲۲ کو بھی۔ اور کچھ پتہ نہیں شاید ۲۴ / ۲۳ کو بھی ہو"۔

میں نے کہا "جناب بے شک عرس کی تقریبات چار ایک دن ہوتی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ختم کس روز ہو گا"۔

بزرگ مسکرائے۔ بولے "ختم ۲۰ کو بھی ہو گا ۲۱ کو بھی ہو گا اور ۲۲ کو بھی"۔

کرتا دھرتا

یہ سن کر میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے"۔

وہ بولے "یہ ممکن تو نہیں مگر رائج ہے۔ یہاں عرس کرنے والی چار ایک پارٹیاں ہیں۔ ہر پارٹی کا دعویٰ ہے کہ ہم نمائندہ پارٹی ہیں۔ وہ رجسٹر آپ نے دیکھے ہی ہوں گے"۔

"رجسٹر ــــ" میں نے چلا کر کہا ــــ "ہاں رجسٹر ــــ جی جی اس روز مزار شریف پر لوگ رجسٹر اٹھائے میرے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کہتے تھے دستخط فرما جائیں"۔

“بالکل —— بزرگ بولے “ہر پارٹی رجسٹر پر دستخط کرواتی پھرتی ہے۔ تاکہ ثبوت کے طور پر پیش کر سکے۔

“کس بات کا ثبوت”۔ میں نے پوچھا۔

“یہی کہ چونکہ ہمارے رجسٹر میں زیادہ تعداد میں دستخط ہیں اس لئے ہم نمائندہ پارٹی ہیں”۔

“نمائندہ پارٹی تسلیم کئے جانے پر کیا ہوتا ہے”۔

“بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ مسکرائے”۔

“مثلاً”۔

“مثلاً چودھری سمجھے جاتے ہیں۔ مرکز ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ کرتا دھرتا بن جاتے ہیں۔ یہ کیا کم ہے”۔

“کم ——” میں نے قہقہہ مارا۔ “دنیا میں بیشتر جھگڑے کرتا دھرتا بننے کی خاطر وجود میں آتے ہیں۔ مگر صاحب ——”

“مگر کیا ——”

“ہمارے ہاں تو خیر سب کو کرتا دھرتا بننے کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ لیکن۔ یہ تو ہند ہے”۔

“کیا مطلب ——” وہ بولے۔

“ہند میں ویسے ہی کسی اقلیت کی آواز نہیں ابھر سکتی۔ پھر مسلمان کی۔ یہاں کرتا دھرتا بننے کے لئے آپس میں رجسٹر بازی کرنا”۔

“دیکھ لو”۔ وہ ہنسے۔

“میں نے سنا تھا مسلمان نا مساعد حالات میں نکھرتے ہیں مساعد حالات میں نہیں”۔

“غلط سنا تھا”۔ کسی نے پیچھے سے کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو اشفاق حسین کھڑا تھا۔

میں نے کہا “یہ سنا تم نے۔ یہاں تو عرسوں کا کیو لگا ہوا ہے”۔

“کیا فرق پڑتا ہے”۔ وہ بولا “کسی ایک میں حاضری دے دیں گے”۔

"اونہوں"۔ میں نے جواب دیا۔ "عرس میں حاضری نہیں ہوتی"۔

"تو کیا ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا۔

"ہلا گلہ ہوتا ہے۔ حاضری تو ایک ذاتی چیز ہے جو فرد سے متعلق ہے، ہجوم سے متعلق نہیں"۔

"قوالی تو بہرحال سنیں گے آپ"۔ بزرگ بولے۔

"قوال تو بے سرے ہوتے ہیں"۔ اشفاق حسین بولے۔

"پڑے ہوں بے سرے"۔ میں نے کہا۔ "صرف احساس حاضری کو خود پر طاری کر کے گائیں۔ بس اتنی سی بات ہے"۔

"مطلب یہ ہوا کہ تمہارا عرس پر جانا بے کار ہو گا یہی نا"۔ اشفاق حسین نے کہا۔

"محض رسمی ہو گا"۔ میں نے جواب دیا۔

عرس کے روز تمام زائرین حضرت کے مزار پر حاضر رہے۔ صرف اشفاق حسین اور میں غیر حاضر تھے۔

تفریحات:

عرس کے بعد زائرین آزاد ہو گئے۔ ہر کوئی اپنی طبیعت کے مطابق مصروف ہو گیا۔

کچھ لوگ تفریح کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ جگہیں دیکھنے میں وقت گزارنے لگے۔ معدودے چند ہندی فلموں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ سیدھے کسی سینما ہال کا رخ کرتے۔ تین ساڑے تین روپے ادا کر کے ایر کنڈیشنڈ ہال میں جا بیٹھتے۔ ایک پر فضا موسم، دوسرے بنی بجی تکلفات سے بے نیاز ہیو گڈ ٹائم کی دلدادہ انڈین ہیروئنز۔ ایک ہال سے نکلتے دوسرے میں جا بیٹھتے۔ تین فلم دیکھ کر بھی پاکستان کی ایک فلم کے گیلری ٹکٹ سے زیادہ خرچ نہ آتا۔

کچھ لوگ جگہیں دیکھنے کے شوقین تھے۔ وہ صبح سویرے نکل جاتے۔ اڈوں پر بسوں کا انتظار کرتے اور پھر باری باری جگہیں دیکھتے پھرتے۔ ہمایوں کا مقبرہ. جنتر منتر.

قطب کی لاٹ۔ جب وہ شام کو ترکی حمام میں واپس پہنچتے تو گھاس پر بچھی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھ کر آگرے کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔

آگرہ اور مغل

“میں کہتا ہوں جی سارا قصور ہمارے لیڈروں کا ہے۔ انہوں نے کوشش ہی نہیں کی۔ ورنہ ہمیں آگرہ جانے کی اجازت ضرور ملتی” ایک کہتا۔

ہر مرتبہ ملتی ہے جی”۔ دوسرا ہاں میں ہاں ملاتا۔

“دو سال ہوئے میں آیا تھا یہاں۔ ہمیں آگرہ لے کر گئے تھے”۔

“او جی لیڈروں کی بے پرواہی ہے۔ ورنہ آگرہ جانے کا پروگرام طے کرنا کیا مشکل ہے”۔

“نہیں نہیں”۔ چھوٹی داڑھی والا کہیں سے آ نکلتا۔ “آگرے کی اجازت کا کاغذ پیچھے سے ہی انی شیٹ نہیں ہوا۔ اب سفارت کا دفتر کیا کر سکتا ہے بھلا”۔

چھوٹی داڑھی والا نوجوان ہمارے لئے ایک معمہ تھا۔ وہ ایک بے چین جوان تھا۔ حرکت، مسلسل حرکت اس کے لئے زندگی تھی۔ قیام موت۔ وہ ابھی یہاں ہوتا ابھی وہاں جا پہنچتا۔ ابھی ادھر ہوتا پھر جو دیکھتے تو ادھر کھڑا ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر بات سے متعلقہ ہر تفصیل سے واقف تھا۔

“بہر حال ! ایمبیسے والے کوشش کر رہے ہیں کہ آگرہ کی اجازت مل جائے”۔

“یہ بات تو لیڈروں کو پہلے سے طے کر لینی چاہئے تھی”۔

“ہٹاؤ بھائی صاحب۔ لیڈران کرام کو اتنی فرصت کہاں”۔

“کیوں وہ کیا چکی پر جتے ہوئے ہیں جو فرصت نہیں ملتی”۔

“ہاں چکی پر جتے ہوئے ہیں”۔

“کون سی چکی ذرا ہمیں بھی پتہ چلے”۔

“دعوت کی چکی”۔

“دعوت کی چکی ــــ کیا مطلب”۔ سبھی بولتے۔

"آج ادھر دعوت ہے۔ کل ادھر چائے ہے۔ کبھی نظامی کے ہاں کبھی بلگرامی کے ہاں، کبھی خاقانی کے ہاں۔ انہیں آگرہ جانے کی طلب نہیں"۔

"واہ کیا جگہ ہے آگرہ۔ پچھلی مرتبہ ہم گئے تھے۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا"۔

"اونہوں۔ اب وہ بات نہیں رہی۔ ارد گرد کارخانے بنوا کر بھارت سرکار نے برباد کر دیا"۔

"کیا مطلب"۔

"بھئی چمنیوں سے دھوئیں اٹھتے ہیں۔ وودھیہ سنگ مرمر دھندلایا جا رہا ہے۔ وہ چمک نہیں رہی"۔

"یار ہم بھی گئے تھے۔ وہاں سالہ گائیڈ مل گیا۔ زبردستی ساتھ ہو لیا۔ بات بات پر مغلوں کی نندا کرتا رہا۔ عیاش تھے، شرابی تھے، غنڈے تھے"۔

"منہ پر ایک تھپڑ دیا ہوتا"۔

"چلو مانا کہ سبھی کچھ تھے لیکن دیکھو تو کتنے بڑے بلڈرز تھے"۔

"یاد رکھو بھائی جو تعمیر کے متوالے ہوتے ہیں وہ بناتے ہیں توڑتے نہیں"۔

"دیکھو بھئی کہے دیتے ہیں ہم تو جائیں گے۔ آگرہ دیکھ کر رہیں گے"۔

"جاؤ گے کیسے"۔

"بس میں بیٹھ کر"۔

"اور جو پکڑے گئے تو۔

"ہمیں کون پکڑتا ہے جی۔ جس نے جانا ہو ہمارے ساتھ چلے۔ صبح جائیں گے۔ شام کو لوٹ آئیں گے"۔

"اونہوں۔ ایسا نہ کرنا"۔ چھوٹی داڑھی والا بولا۔ "ایمبیسے والے اجازت لے رہے ہیں۔ انشاء اللہ سبھی جائیں گے"۔

"ایمبیسے والے"۔ ایک نے قہقہہ لگایا۔ "ایمبیسے والوں پر امید نہ رکھو۔ وہ تو بس بیٹھ رہنا چاہتے ہیں۔ کرنا کرانا نہیں۔ اگر ہمارے ایمبیسے کام کے ہوتے تو پھر سمندر پار بسنے والے سکھی نہ ہوتے"۔

"نہیں بھائیو تمہیں علم نہیں۔ ایمبیسے والے بڑے باخبر ہیں"۔

"تو انہیں پتہ ہے کہ نوے زائرین کو انھوں نے ترکی حمام میں لا کر بند کر رکھا ہے۔ اندر تنور جلتا ہے باہر مکھیوں کی بارش ہوتی ہے۔

"نہیں نہیں۔ تمہیں پتہ نہیں کل ایمبیسیڈر خود آ رہے ہیں یہاں زائرین سے ملنے"۔ چھوٹی داڑھی والا بولا۔

"ساتھ فوٹوگرافر لائیں گے نا"۔

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوتا۔

شاپنگ

زائرین کی سب سے بڑی دلچسپی شاپنگ کی تھی۔

ہر آدمی شاپنگ میں مصروف تھا۔ شدت سے مصروف تھا۔ عام طور پر شاپنگ کے لئے زائرین کے گروپ بنے ہوئے تھے جو اکٹھے مل کر شاپنگ کرتے تھے۔ اور پھر شام کو ترکی حمام میں پہنچ کر اپنی اپنی چیزوں کی بر سر عام نمائش کرتے تھے۔

ذرا دیکھو تو کیا لایا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ سیٹھ جمنا داس کا دل چیر کر لے آیا ہوں۔ ہاں یہ دیکھو جناب یہ اصلی کشمیری شال ہے۔ ذرا کڑھائی دیکھو۔ دو ہزار کی چیز پانچ سو میں مار لایا ہوں۔ سیٹھ گھر جا کر زار و قطار نہ رویا تو میرا ذمہ۔ ہم نے سالے کی مت مار لی۔

دوسرا گروپ بولتا۔ ذرا یہ ساڑھی دیکھو خالص بنارسی ہے اور یہ کڑھائی کا تلا وہ سودا کیا ہے کہ جواب نہیں سیٹھ پانچ ہزار سے چلا تھا۔ سوا دو ہزار پر لے آئے اسے۔ اس کی بولتی بند کر دی ہم نے بھی۔ ہم چار تھے اور وہ اکیلا۔ چیختا ہی رہ گیا مہاراج اتنے پر تو ہمیں گھر نہیں پڑی۔

چند ایک زائر ایسے تھے جو اکیلے میں شاپنگ کر رہے تھے۔ وہ اپنی چیزوں کی نمائش نہیں کرتے تھے۔ الٹا چیز کو یوں چھپا چھپا کر رکھتے کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

اشفاق اور میری چارپائیوں کے ساتھ ہی ایک پٹھان کی چارپائی تھی۔ وہ بار بار چارپائی کے تلے جھا نکتا کہ سامان جوں کا توں قائم ہے! یا نہیں۔

سامان کو محفوظ دیکھ کر وہ آپ ہی آپ مسکراتا۔

باہر سے واپس آتا تو اندر داخل ہوتے ہی جھک کر چارپائی کے تلے جھانکتا بلکہ دونوں جہازی سوٹ کیس باہر کھینچ کر ان کے تالے آزماتا کہ کھلے تو نہیں۔

جب بھی ترکی حمام میں بھیڑ کم ہوتی یا لوگ باہر نکلے ہوتے یا مصروف ہوتے تو وہ اوٹ بنا کر سوٹ کیس باہر نکالتا۔ چیزیں ایک ایک کر کے دیکھتا انہیں از سر نو تہہ کر کے قرینے سے لگاتا۔

سامان کو دیکھنا۔ اسے الٹھنا پلٹھنا از سر نو تہہ کرنا، قرینے سے سوٹ کیس میں رکھنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ نہ اسے فلم دیکھنے کی آرزو تھی نہ جگہیں دیکھنے کی۔ آگرہ جانے کے خواہش پر اس نے کبھی زبان نہ ہلائی تھی۔ ویسے بھی وہ خاموش طبیعت فرد تھا۔ اس نے ہم سے کبھی بات نہ کی تھی۔ نہ ہی باہر درختوں تلے بیٹھی ٹولیوں میں حصہ لیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ وہ ورلڈ گریٹ پکچر یاد آ جاتی۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی۔ گردن جھکی ہوئی۔ کمر پر بوجھ اور ارد گرد ویرانی ہی ویرانی۔ تصویر کے نیچے کیپشن میں لکھا تھا۔

FOR HE HAD GREAT POSSESSIONS

رقم

شاپنگ کی نمائش کے دوران ہال میں رقم کی بات چھڑ جاتی۔

کوئی پوچھتا "یار تم اتنی رقم کیسے لے آئے۔"

"تم مانو گے نہیں" ایک آنکھیں چمکا کر جواب دیتا۔ "ہم اپنے ساتھ ایک روپیہ نہیں لائے جب روانہ ہوئے تھے تو دس روپے کا نوٹ جیب میں تھاقلیوں کو دینے کے لئے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"پھر یہ اتنا سامان کیسے خرید لیا۔"

"بس جی ہم جب بھی آتے ہیں ایک ہنڈی ساتھ لے آتے ہیں دس بیس ہزار کی۔ جتنے پیسے کی ضرورت پڑی لے لیا۔"

دوسرے بولتے۔ "ہم تو ہنڈی بھی نہیں لاتے۔ اپنا کاروبار ہے لالہ اور پربھ دیال کے ساتھ جتنا پیسہ مرضی ہے لے لیں۔"

تیسرا بولتا "اپنا تو ادھر بھائی ہے دلی میں آکر اسے لسٹ بنا کر دے دیتے ہیں۔ خود ہی ساری چیزیں خرید کر دیتا ہے۔ اپنی نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری۔ "

ایک اور صاحب بڑے فخر سے کہتے "بھئی اپنے دو بیٹے ہیں دوبئی میں۔ مہینے کے مہینے ہزاروں روپے بھیجتے ہیں اور سامان کا تو کچھ پوچھو نا۔ از خود بھیجتے رہتے ہیں۔ ہم روکتے ہیں پھر بھی بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں پتہ چلا کہ ابا ہند جا رہے ہیں۔ تو اپنے بنک کو لکھ دیا کہ ابا کو ہند کی برانچ سے جو وہ مانگیں بہم پہنچایا جائے۔ پانچ ہزار نکلوا چکا ہوں آج تک وہ تو دس دے رہے تھے۔ میں نے منع کر دیا۔ "

سارے ہال میں صرف دو زائر ایسے تھے جو سامان سے لاتعلق تھے۔ ایک اشفاق حسین اور دوسرے میں۔

ہند لوٹ

قیام کے تیسرے روز جب ہم دونوں کتابوں کے گٹھے اٹھا کر سکاؤٹ کیمپ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے سیکوریٹی والوں کی آنکھیں ابل آئیں۔ انہوں نے نیچی نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پہلے تو حیرت سے چہرے مسخ ہو گئے۔ پھر مسکراہٹیں ابھریں اور بالآخر کھی کھی کی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔

غالباً انہوں نے سوچا کہ یہ کون پاگل ہیں جو چیزوں کی بجائے کتابیں خرید کر لائے ہیں۔ احمق کہیں کے۔ پھر شاید انہیں خیال آیا ہو کہ ان کتابوں کی نوعیت کے بارے میں جاننا اشد ضروری ہے۔

سیکوریٹی سے گزر کر جب ہم پولیس پوسٹ پر پہنچے تو سارے سپاہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"بھگوان یہ کیا کتابوں کے بنڈل۔ "

اپنی جگھوں پر پہنچ کر ہم نے کتابوں کے بنڈل اونچی جگہ سٹیج پر رکھ دیئے۔ اس پر ہال والوں نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔

ایک صاحب دور سے چلائے "شاپنگ کر کے آئے ہیں۔ "

"جی۔ " اشفاق نے کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ ہند کو لوٹ کر لے آئے ہیں۔ "

یہ سن کر پولیس پوسٹ والوں کی توجہ اپنی بندوق کی طرف منعطف ہو گئی۔

"یہ کون سی وویا ہے مہاراج۔ " ایک نے اندر جھانک کر پوچھا۔

"مہاراج یہ ہندی وویا ہے۔ " اشفاق نے جواب دیا۔

"ہندی کی کتابیں ہیں یہ۔ کیوں مہاراج۔ "

"نہیں مہاراج۔ " اشفاق بولا "انگریزی کی کتابیں ہیں۔ "

اس پر وہ بوکھلا گئے۔

ایک زائر چلایا "آپ تو کہتے ہیں ہند کو لوٹ لائے ہیں۔ "

"ہاں لوٹ لائے ہیں۔ محمود غزنوی نے کیا لوٹا ہو گا۔ " اشفاق حسین اپنی طرف سے مزاح پیدا کر رہا تھا لیکن پولیس والوں کی جان پر بنی تھی۔

پولیس کا حوالدار جو دیکھنے میں حوالدار تو کیا سپاہی بھی نہیں لگتا تھا، ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ کبھی وہ کتابوں کے بنڈلوں کی طرف دیکھتا کبھی ہماری طرف۔ آخر میں بولا "مہاراج یہ لوٹ کا مال تو بہت کم دکھتا ہے۔ "

"خالص سونا ہمیشہ کم دکھتا ہے۔ " اشفاق حسین بولا۔ "پر ہوتا انمول ہے۔ یہ کتابیں نہیں ہندوؤں کی بدھی ہے۔ عقل ہے، دانش ہے۔ ان کتابوں میں ہندوؤں کی دانش ہے۔ "

حوالدار اس اثنا میں کتابوں کے بنڈل تک جا پہنچا تھا۔ اس نے دو ایک کتابوں کے نام پڑھے۔ ذہن سے فکر و پریشانی کے بادل چھٹ گئے۔ چہرے پر یوں مسکراہٹ پھوٹی جیسے پچھلے پہر پھوٹتی ہے۔ کہنے لگا "مہاراج یہ تو ہومیو پیتھی کی کتابیں ہیں۔ "

"ہاں ہومیو پیتھی کی کتابیں ہیں جبھی تو انمول ہیں۔ " اشفاق حسین نے جواب دیا۔

"یہ کتابیں ادھر پاکستان میں نہیں ملتیں کیا۔ "

"ادھر پاکستان میں انگریزوں کی لکھی ہوئی ملتی ہیں، جرمنوں کی لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ ہندوؤں کی لکھی ہوئیں نہیں ملتیں۔ "

"ہندو انگریزوں سے اچھی لکھتے ہیں مہاراج۔ "

"یورپی اپنے اپنے ملک کے تجربات لکھتے ہیں۔ وہ ہمارے جیسے ملک نہیں ان کی باتیں ہم پر نہیں بیٹھتیں۔ ہندو لکھنے والوں کی باتیں ہم پر بیٹھتی ہیں۔ " اشفاق حسین نے

کہا۔

”اچھا مہاراج۔ “ حوالدار کی گردن فخر سے اکڑ گئی۔

”جس روز سے ہم کتابیں خرید کر لائے تھے زائرین کی نگاہ سے گر گئے تھے۔ سیکورٹی کی نگاہ سے گر گئے تھے۔

دوکاندار خریدار

جب زائرین بازار سے سامان کی گٹھڑیاں خرید کر لاتے تو سیکورٹی والے نیچی نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتے۔

غالباً انہیں خوشی ہوتی کہ اتنے سارے خریدار ہند میں آ گئے ہیں۔

اگر حکومت ہند کو بھی یہ احساس ہوتا تو حالات قطعی طور پر مختلف ہوتے۔

پتہ نہیں ہندو کے ذہن پر کیوں پردہ پڑ گیا۔ حالانکہ ہندو ایک بہت سمجھدار اور زیرک قوم ہے۔

جب پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو گیا تو ہندو سمجھا کہ لٹیا ڈوب گئی۔ گلاب کے پھول میں کانٹا لگ گیا۔ اکھنڈ ہند میں جھول پڑ گیا۔ اس کے دل میں صدیوں کی نفرت حقارت اور دبے غصے کا پھوڑا پھوٹ نکلا۔

اس نے کہا نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ جلا دو، کاٹ دو، بھسم کر دو۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس روز تقسیم کی لکیر کھینچ دی گئی۔ بس اس روز پاکستان وجود میں آ جائے گا۔

نہ مہاراج۔ کبھی لکیریں کھینچنے سے ملک بن جاتے ہیں۔ پاکستان لکیر نے نہیں بنایا۔ تقسیم نے نہیں بنایا بلکہ ہندو کے غم و غصے اور انتقامی جذبے نے بنایا ہے۔

پاکستان کا استحکام

اگر تقسیم سے پہلے ہندو منظم طور پر مسلم کشی کی تحریک نہ چلاتے تو بیشک پاکستان کی لکیر وجود میں آ جاتی لیکن وہ ایک بے جان لکیر ہوتی۔ اس میں وہ زہر نہ بھرتا جو دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا۔

ہندو میں بہت سی خصوصیات ہیں مثلاً ہندو کاروبار کرنا جانتا ہے۔ اس بنایا۔ تقسیم نے نہیں بنایا بلکہ ہندو کے غم و غصے اور انتقامی جذبے نے بنایا ہے۔

میں بزنس انٹگرٹی ہے۔ وہ مصنوعات پروڈیوس کرنا جانتا ہے۔ وہ بیچنا جانتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان صرف خریدنا جانتا ہے۔ نہ پروڈیوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے نہ بیچنے کی۔ جو منافع کی ہوس سے اتنا سرشار ہو جائے کہ اندھا ہو جائے تو جان لو کہ وہ بیچنے کے فن سے کورا ہے۔ جس میں صبرو تحمل نہ ہو عجز نہ ہو وہ بیچنے کے فن سے محروم ہے۔

اگر ہندو تشدد اور انتقام سے کام نہ لیتا تو بے شک تقسیم کی لکیر پڑ جاتی مگر ہندو اسی طرح بیچتا۔ مسلان خریدتا۔ ہندو پروڈیوس کرتا۔ مسلمان کنزیوم کرتا۔ ہندو تاجر بن جاتا۔ مسلمان خریدار۔ یہ تعلق تقسیم کے باوجود قائم رہتا۔ روز بروز بڑھتا۔ حتیٰ کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو جاتے۔

سیدھی سی بات تھی جو ہندو کو یقینی طور پر سمجھنی چاہئے تھی۔ لیکن ٹھہریئے شاید قدرت کو منظور تھا کہ پاکستان قائم ہو جائے۔ اور استحکام حاصل کر لے اس لئے شاید اس نے ہندو کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہو۔ اسے تشدد پر آمادہ کر دیا ہو۔ حالانکہ تشدد ہندو کی سرشت میں نہیں۔ وہ صرف افراق و تفریق جانتا ہے جسمانی تشدد نہیں۔
شاید پاکستان کے قیام کو پختہ تر کرنے کے لئے ہندو کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے پر مائل کیا گیا ہو۔

یہ جو آئے دن ہند میں مسلم کش فسادات ہوتے رہتے ہیں شاید یہ اس لئے ہوں کہ پاکستان کے قیام میں سیمنٹ لگتا رہے۔

حیرت کی بات ہے کہ آج تک ہندو اس بات کو نہیں سمجھا کہ مسلمانوں کے خلاف غم و غصے کے اقدامات پاکستان کو تقویت دے رہے ہیں۔ ہند کو کمزور کر رہے ہیں۔ اللہ کے کاموں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ اگر لاکھوں مسلمانوں کو صرف اس لئے تہہ تیغ کر دیا جائے کہ وہ اللہ کا نام لیتے ہیں تو جس کا وہ نام لیتے ہیں اسے ضرور دھچکا لگتا ہے۔ اگر رام کا نام لینے والوں کو صرف اس لئے مولی گاجر کی طرح کاٹ دیا جائے تو رام کو یقیناً ناگوار گزرے گا۔

مہاراج آپ تو بہت زیرک لوگ ہیں پھر اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے آپ کی مسلمان اور پاکستان دشمنی پاکستان کے لئے باعث تقویت ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے استحکام کا باعث بنتی جا رہی ہے۔ اور ہندو کے اندر کا کینہ اور نفرت خود اسے ہی کھوکھلا کئے جا رہے ہیں۔

بیجی سار

وہ محترمہ جس نے ہمیں بیجی سار کی فرمائش کی تھی بڑی باعزت خاتون تھی۔ ساتھ ہی وہ عمر رسیدہ تھی۔ شاید عمر زیادہ نہ ہو لیکن انداز میں عمر رسیدگی تھی اور وہ تمام خواص موجود تھے جو عمر رسیدگی سے انسان میں پیدا ہوتے ہیں۔ تحمل، وقار، ٹھہراؤ، دانش۔ ان کی زبانی ہم نے پہلی مرتبہ بیجی سار کا نام سنا۔

دوا گلاس

خاتون نے کہا ”آپ دلی جا رہے ہیں۔ ہو سکے تو وہاں سے بیجی سار کے دو گلاس لے آئیں۔ “

”وہ کیا ہوتا ہے بیجی سار۔ “ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”بیجی سار کے گلاس ہوتے ہیں۔ “ محترمہ نے جواب دیا۔

”کھلونہ گلاس۔ “ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔ “ محترمہ مسکرائی۔ ”کھلونہ گلاس لے کر میں کیا کروں گی۔ وہ گلاس دراصل دوا ہیں۔ “

”گلاس دوا ہیں“ اشفاق ٹپٹا گیا۔

”ہاں۔ “ وہ بولی۔ ”یہ گلاس ذیابیطس کے لئے بہت مفید ہے۔ رات کو گلاس میں پانی بھر رکھو۔ صبح سویرے نہار منہ پانی پی لو تو ذیابیطس کے لئے بہت فائدہ مند ہوتا

ہے۔ "

"اچھا جی۔ " اشفاق حسین نے حیرت سے پوچھا۔

" آزمودہ ہے۔ " وہ بولی۔

"خوب۔ لیکن یہ گلاس ملیں گے کہاں۔ "

" دلی میں نیجی سار گلاس کو سبھی جانتے ہیں۔ آپ کہئے نیجی مار کا گلاس چاہئے۔ وہ بتا دیں گے۔ بس دو گلاس خرید لائیے۔ "

اتا پتا پوچھنے میں مجھ سے بڑا احمق شاید روئے زمین پر ملنا محال ہو گا۔ پتہ نہیں اتا پتا پوچھتے وقت میں اتنا بے صبرا کیوں ہو جاتا ہوں۔

اس وقت جب محترمہ نے کہا کہ نیجی سار کو دلی میں سبھی جانتے ہیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ نیجی سار ضرور امرت دھارا قسم کی چیز ہو گی۔ پوچھیں گے تو راہ چلتے لوگ رک جائیں گے۔ کہیں گے نیجی سار۔ ہاں ہاں سیدھے چلے جائیں۔ چوک سے بائیں ہاتھ مڑ جائیں۔ آگے نیجی سار بازار ہے۔ سارے بازار میں نیجی سار کے گلاس سجے ہوئے ہیں۔ جونسا پسند آئے خرید لیجئے۔

ویسے نیجی سار کا نام سن کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی سنیاسی قسم کی چیز ہو جو بندھیاچل کی پہاڑیوں میں اگتی ہو۔ ممکن ہے اس بوٹی پر پھولوں کی جگہ گلاس لگتے ہوں جنہیں سنیاسی توڑ کر لے آتے ہوں اور سر راہ مجمع لگا کر بیچتے ہوں جیسے ہمارے ہاں جواں مردی کی دوائیاں بیچی جاتی ہیں۔

کوئی بات بھی تو ہو

دلی پہنچ کر پہلے روز ہی ہم نے اقبال ہوٹل میں ناشتہ کرتے ہوئے ہوٹل والے سے پوچھا "کیوں بھئی یہ بتائیے کہ یہاں دلی میں نیجی سار کہاں ملے گا۔ "

"نیجی سار۔ " ہوٹل والے نے دہرایا۔

"اس پر سبھی لوگ جو ہوٹل میں بیٹھے تھے ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ "نیجی سار۔ " وہ گنگنائے۔

"کیوں میر صاحب۔ " ہوٹل والا چلا کر بولا۔ " نیجی سار کا پتہ ہے کہ

کچھ۔ "

" میر صاحب نے سر اٹھایا۔ بولے "اچھا بے جی سار ـــــ ہوں بیجی سار " اور پھر چپ ہوگئے۔

ان کے انداز سے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیجی سار کے جملہ رموز واسرار سے واقف ہوں۔

میر صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہم صاحب بولے "ہاں ہاں بیجی سار ہم اس لفظ سے خاصے مانوس ہیں۔ اگرچہ یاد نہیں آرہا اس وقت لیکن ہم بیجی سار سے اچھی طرح واقف معلوم پڑتے ہیں۔ "

ہم صاحب کے پہلو میں ایک دبلا پتلا نوجوان بولا۔ "اقبال بھائی پریشانی کی بات نہیں۔ نوری ابھی آئیں گے ان سے پوچھ لینا۔ دلی کی کوئی چیز ہو اور نوری نہ جانے یہ نہیں ہو سکتا۔ نوری سے کوئی چیز چھپی نہیں۔ ہاں ـــــ "

"بابو صاحب ـــــ " پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئے "گھبرایئے نہیں ابھی نوری آئے گا ادھر ہوٹل میں۔ اس سے ساری انفریشن لے لیں گے۔ آپ شام کو کھانا کھانے آئیں تو ہم سے ساری معلومات لے لیں۔ بلکہ بہتر رہے گا کہ آپ آرڈر دے دیں۔ گلاس یہاں پہنچ جائیں گے ہوٹل میں۔ آپ کہاں خراب ہوتے پھریں گے یہاں دلی میں۔ کوئی بات بھی ہو۔ "

" واہ کیا بات کی ہے۔ " ہم صاحب بولے " بالکل مناسب۔ "

میر صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں میاں آرڈر لے لو۔ یہی مناسب ہے۔ "

" آرڈر ہی لیں گے۔ " ہوٹل والے نے کہا۔

میں نے سوچا واہ کیا اتا پتا بتانا تھا محترمہ نے۔ واقعی یہاں تو سبھی بیجی سار کو جانتے ہیں۔ چلو یہ فریضہ بھی ادا ہوا۔ سمجھ لو کہ بیجی سار کی فرمائش پوری ہو گئی۔

ترکی حمام اور مکھیاں

اسی روز شام کے وقت ہم کیمپ کے ہال سے باہر گھاس پر بیٹھے مکھیاں اڑانے کے

شغل میں مصروف تھے کہ بیجی سار کی بات چل نکلی۔

وہ کیمپ ہال دراصل تھیٹر ہال تھا۔ جو اس لئے بنایا گیا تھا تاکہ رات کے وقت اس میں کھیل دکھایا جائے۔

وہ ہال دن کے وقت استعمال کے قابل نہ تھا خصوصاً گرمیوں میں۔ ان دنوں دلی میں سخت گرمی تھی۔ ہوا مستقل طور پر بند تھی۔ وہ پیڈسٹل فین جو ہال میں عارضی طور پر فٹ کئے گئے تھے، گھومنے والے پنکھے نہ تھے۔

صبح نو بجے تک ہال کی آب و ہوا خاصی اطمینان بخش ہوتی۔ پھر آہستہ آہستہ سورج اوپر آتا تو ٹین کی چھت گرم ہونا شروع ہو جاتی۔ گیارہ بارہ بجے تک چھت سے گرمی کے بھبھاکے نکلنے شروع ہو جاتے۔ تین بجے وہ ہال ترکی حمام میں بدل جاتا اور یہ کیفیت رات کے آٹھ بجے تک قائم رہتی۔

اس ترکی حمام کا ایک فائدہ ضرور تھا۔ دوپہر سے پہلے ہی لوگ ہال کو چھوڑ کر باہر درختوں کی چھاؤں میں آبیٹھتے۔ یوں مجبوری کے تحت میل جول کا سلسلہ قائم ہو جاتا۔ باہر کوئی پنکھا نہ تھا۔ اندر کے پنکھے دن کے وقت ہوا چلانے کے بجائے چھت کے ٹین کی گرمی کو سارے ہال میں پھیلاتے رہتے تھے۔

باہر گھاس پر چھت کے ٹین کی حدت تو نہ تھی لیکن وہاں لاتعداد مکھیاں تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کھلے میدان میں صاف ستھرے گھاس میں مکھیاں کیوں تھیں۔ نہ وہاں کھانے پینے کا سامان تھا نہ گندگی۔ اس کے باوجود وہاں مکھیوں کی یوں بارش ہوتی تھی جیسے دلی نہیں مکھیوں کی چراپونجی ہو۔ اس لئے لوگ ہاتھ کا پنکھا۔ اخبار کا کاغذ۔ کاپی یا کوئی اور چیز چلانے پر مجبور ہوتے چلائے جاتے پھر بھی بھن بھن کا جل ترنگ بجے جاتا۔

اشفاق حسین اور میں ہال کے پرلے کونے میں مقیم تھے۔ یہ جگہ سٹیج کے قریب تھی۔ سٹیج کے پہلو میں تھیٹر کا گرین روم تھا۔ گرین روم میں پولیس کی گارد رہتی تھی۔ پولیس کے کل چھ سات سپاہی تھے جو سارا دن ترکی حمام سے بچنے کے لئے باہر کیکر کی چھاؤں میں چارپائیوں پر بیٹھ کر مکھیاں اڑاتے رہتے۔ پھر رات کے نو بجے برآمدے میں جا لیٹتے۔

ہوٹل سے بیجی سار کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد جب ہم ترکی حمام

میں پہنچے تو باہر گھاس پر سپاہیوں کے پاس جا بیٹھتے۔

وہاں مکھیاں اڑاتے اڑاتے پتہ نہیں اشفاق کو کیا سوجھی کہ اس نے بیجی سار کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"بیجی سار" ایک سپاہی نے حیرت سے کہا۔ "نہ مہاراج ہم نے تو آج تک یہ نام نہیں سنا۔"

باقی سپاہیوں کے بھی منہ حیرت سے کھلے تھے۔ "بیجی سار۔"

میں نے وضاحت کرنے کے لئے کہا "یار کوئی نسیاسی چیز ہے۔"

سپاہی سوچ میں پڑ گئے۔

ایک بولا "نہ مہاراج ہمارے تھانے کے پاس ہی نسیاسی کا اڈا ہے۔ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں۔"

سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

بے خبر باخبر

"واہ۔" میں نے سوچا۔ یہ دلی کے ہندو کتنے بے خبر ہیں کہ ہندوستانیوں کی چیز سے بھی واقف نہیں۔ وہ اقبال ہوٹل کے مسلمان کتنے باخبر ہیں۔ ہر کسی کو بیجی سار کا نام کس قدر مانوس لگا تھا۔ انہوں نے یوں نام لیا تھا جیسے بیجی سار روز مرہ کے برتنے کی چیز ہو۔

"بس رات کو ہوٹل میں جانے کی دیر ہے۔" میں نے سوچا۔ نوری صاحب ساری اطلاعات دے گئے ہوں گے۔ صرف آرڈر دینے کی بات ہو گی۔ سو دے دیں گے۔ چلو بات ختم ہوئی۔

رات کو جب ہم اقبال ہوٹل کھانے کھانے کے لئے گئے تو پتہ چلا کہ نوری صاحب کسی وجہ سے نہیں آئے۔

اگلے دن جب ہم ہوٹل میں پہنچے تو اتفاق سے نوری صاحب وہیں بیٹھے تھے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ بہت ہی چاق و چوبند۔ تیز اتنا کہ بند بند رقصاں تھا اور گفتگو اتنی رواں جیسے منہ میں زبان کی جگہ قینچی لگی ہوئی ہو۔

ہمیں دیکھ کر نوری صاحب بولے۔ "ہاں جناب اقبال نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہاں ہاں بیجی سار۔ مطلب ہے کالی گھبرانے کی کوئی بات نہیں مل جائے گا۔ آپ کو کتنے چاہئیں۔ ایک درجن سے کم کیا ہو گا۔ سوغات کے طور پر لے کر جاتے ہیں نا۔ ہو جائے گا انتظام۔ "

نوری صاحب کو دیکھ کر ہمیں پتہ چل گیا کہ پوچھ گچھ کے بغیر بات نہیں بنے گی۔
پھر تو ہم نے ہر راہ چلتے شخص سے پوچھنا شروع کر دیا۔
"مہاراج آپ کو بیجی سار کا پتہ ہے۔ "
"جناب بیجی سار کہیں سے ملے گا۔ "
بیجی سار بیجی سار بیجی سار۔
ساری دلی ہمارے بیجی سار سے گونج اٹھی۔
ہم پر بیجی سار ایسا سوار ہوا کہ ہم اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے۔

بیساکھیاں

دراصل ہم دونوں کا آپس میں اتفاق نہ تھا۔ ہومیو پیتھی کا دیوانہ ہونے کے باوجود اشفاق حسین پیدائشی طور پر ایک ایم بی بی ایس ہے۔ اس پر عقل اور سائنسی رویہ اس حد تک سوار ہے کہ ان دونوں بیساکھیوں کا سہارا لئے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ روز ہومیو پیتھی کے معجزات دیکھتا ہے۔ ان پر تالی بجاتا ہے۔ لکے کبوتر کی طرح چھاتی نکال کر چلتا ہے۔ اپنی زبان سے کہتا ہے۔ دیکھا ہومیو پیتھی کا معجزہ اس کے باوجود وہ معجزوں پر یقین نہیں رکھتا۔ جب تک کوئی بات سو فی صد سائنٹیفک نہ ہو وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس عقل اور تجویز پر میرا بھروسہ ٹوٹ چکا ہے۔ بیشک میں نے زندگی برٹرینڈ رسل کے سکیپٹی سزم سے شروع کی تھی۔ جوانی میں عقل اور دلیل کی ڈگڈگی بجاتا رہا۔ لیکن اب نہ عقل پر بھروسہ ہے نہ سائنسی رویے پر۔

میرا خیال تھا کہ بیجی سار کے متعلق ویدوں سے پوچھو۔ سنیاسیوں سے پوچھو۔ ٹوٹکے ماننے والوں سے پوچھو۔ بازار میں دری بچھا کر قوت مردی کی گولیاں بیچنے والوں سے

پوچھو۔

اشفاق حسین کا خیال تھا کہ نہیں ان لوگوں سے پوچھو جو جانتے ہیں۔ سمجھتے ہیں۔ صاحب فکر ہیں۔ ڈاکٹروں سے پوچھو۔ تحقیق کرنے والوں سے پوچھو۔ زید اور بکر سے پوچھنا بے کار ہے۔

نتیجہ یہ تھا کہ وہ سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگوں سے پوچھتا تھا۔ میں دہقانی قسم کے عام لوگوں سے پوچھتا پھرتا تھا۔

دو ہی دنوں میں ساری دلی ہماری پوچھ گچھ کی لپیٹ میں آ گئی۔ لیکن کہیں سے امید کی کرن نہ پھوٹی۔

ایک دن چلتے چلاتے ہم دریا گنج میں بھنڈاری کی دکان کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اشفاق حسین بولا “ٹھہر یار کیوں نا ہم بھنڈاری کی دکان سے پوچھیں۔ ”

اشفاق حسین کو دیکھ کر دوکان کی ساری سیل گرلز اکھٹی ہو گئیں۔ اشفاق حسین کی بات سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ “بیجی سار۔ ” وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

پھر اوشا قہقہہ مار کر ہنسی۔ بولی “جا کر کسی سادھو سے پوچھئے۔ ہم نے تو ایسی بوٹی کا نام تک نہیں سنا۔ ”

“میں سمجھا شاید بھنڈاری جی نے اسے پوٹنٹائز کر لیا ہو۔ ” اشفاق حسین بولا

“اچھا۔ ” ایک بولی۔ “بیجی سار کسی دوا کا نام ہے کیا۔ ”

“ہند کی ایک بوٹی ہے۔ ” اشفاق حسین کہا “جو شکر کی بیماری میں بڑی مفید ہے۔ ”

“مفید بوٹیاں ہمارے کام کی نہیں۔ ” اوشا نے کہا “ہم تو ان بوٹیوں میں انٹریسٹڈ ہیں جو بیماریاں پیدا کریں۔ ”

“یہ تو ٹھیک ہے۔ پوٹنٹائز تو وہی ہو سکتی ہیں جو بیماری پیدا کریں۔ ” اشفاق حسین گنگنایا۔

ایک معزز لالہ جی جو اس دوران میں دوکان میں داخل ہو چکے تھے۔ بولے “بوٹی کی تلاش ہے تو کسی آیورویدک سٹور میں جا کر پوچھئے۔ ”

یہاں سے ہماری تلاش کو ایک نئی سمت مل گئی۔ ہم نے بیجی ساری کی پوچھ چھوڑ کر آیورویدک دوکانوں کی پوچھ شروع کر دی۔

آیورویدک کی پہلی ہی دوکان پر وید صاحب بولے ”مہاراج نام تو سنا ہے بیجی سار کا لیکن اس کے بارے میں اتا پتا معلوم نہیں۔“

تیسری دوکان پر ایک معزز ہندو بیٹھے تھے۔ بولے ”دیکھیئے اگر بیجی سار کا گلاس بنتا ہے تو آپ کسی ایمپوریم سے پوچھیں۔ ہند کے ہر علاقے کے ایمپوریم نئی دلی میں ملیں گے وہاں سے اتا پتا مل جائے گا۔“

جسم اور ذہن

”ایمپوریم کے لئے تو نئی دلی جانا پڑے گا۔“ میں نے اشفاق حسین سے کہا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ظاہر تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اشفاق حسین کی ہمت پر حیران تھا۔ وہ ایک بیمار آدمی تھا۔ گذشتہ چھ ماہ سے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے جسم اور ذہن میں چھ ماہ سے مسلسل لڑائی ہو رہی تھی۔

اس کا جسم بے حد سخت جان ہے۔ ذہن بے حد آرام پسند ہے۔ ایک کھدر ہے دوسرا مخمل۔ دونوں کی چخ چخ. جھک جھک لگی رہتی ہے۔

جسم کہتا ہے لے بھائی میں اٹھنے لگا۔

ذہن کہتا ہے اونہوں۔ احمق ابھی تیرے گھٹنے کمزور ہیں جو اٹھا تو ایسا نہ ہو کہ ہڈی کڑک جائے۔ جو کڑک گئی تو پھر بچو جی بیٹھنے سے بھی جائے گا۔

جسم کہتا ہے دیکھ اب میں بہت بہتر ہوں۔ اب تو اس کدو بازی کو چھوڑ۔ دہی کے ٹھوٹھے کو پھینک۔ مجھے انڈا گوشت کھلا۔

ذہن کہتا ہے نہ نہ نہ۔ جو تو نے احتیاط کو چھوڑ دیا تو تیرا کباڑہ ہو جائے گا۔ ابھی نہیں۔ ابھی کدو چلے گا۔ دہی چلے گا۔ پگلے تو صحت کے اصولوں سے واقف کیا۔ پرہیز کی اہمیت کو نہیں جانتا۔

اس پر جسم تاؤ کھا جاتا ہے۔ اچھا بچو کھا کدو۔ چھ مہینے اور کدو نہ کھلایا تجھے تو میرا نام بھی جسم نہیں۔

اس رات بلا وجہ اشفاق حسین کا بخار کم ہونے کے بجائے ایک درجہ بڑھ جاتا ہے۔

برٹرینڈرسل نے کیا خوب بات کی تھی۔ بچوں کی تربیت پر اپنی شہرہ آفاق کتاب میں لکھتا ہے۔ ”وہ بچے جو زبان سے احتجاج نہیں کر سکتے۔ پیٹ اور آنتوں سے احتجاج کرتے ہیں۔“

اشفاق حسین کے سارے ہی عضو عالم احتجاج میں ہیں۔

دراصل اشفاق حسین ایمن آباد کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کے بیشتر افراد بیک وقت قابل بھی ہیں. پاگل بھی ہیں۔ ان میں قابلیت کی چنگاری جلتی ہے. جس سے دیوانگی کے شرارے اڑتے رہتے ہیں۔

اشفاق حسین کا جسم اور ذہن بر سرپیکار ہیں۔

اس کے بھانجے احمد بشیر کا جو ایک جانا پہچانا جرنلسٹ ہے. ذہن دو مونہی سانپ کی طرح ہے۔ جس کے دونوں سروں پر سر ہوتا ہے۔ کبھی ادھر سے ادھر چلنا شروع کر دیتا ہے کبھی ادھر سے ادھر۔

اس کی بھانجی پروین عاطف جو ایک جانی پہچانی ادیبہ ہے۔ حرکت کی دیوانی ہے۔ اس کے لئے بائیسکل کی مصداق زندگی حرکت ہے۔ مسلسل حرکت اور سکون موت۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا ہے کہ جہاں خزانہ دبا ہوتا ہے وہاں سانپ ضرور ہوتا ہے۔ جہاں قابلیت ہوتی ہے. وہاں **گھمن گھیری** ضرور ہوتی ہے۔

ہاں میں اس بات پر شدت سے حیران تھا کہ دلی میں اشفاق حسین کا ذہن اور جسم ایک دوسرے سے تعاون کر رہے تھے۔ دونوں ہی ٹروس کا سفید جھنڈا گاڑے بیٹھے تھے۔

نئی دلی

میں نے کہا ”اشفاق حسین ایمپوریم پہنچنے کے لئے نئی دلی چلنا پڑے گا۔“

”وہاں تو جانا ہی ہے۔“ وہ بولا۔

”کیوں۔“ میں نے پوچھا۔

”اوشا کہتی تھی۔ نئی دلی میں ہماری برانچ ہے۔ وہاں ضرور جانا۔ وہاں آپ کے مطلب کی چار ایک کتابیں مل جائیں گی جو ہمارے ہاں آؤٹ آف سٹاک ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھ میں چمک لہرائی۔ مدہم آواز میں بولا ”اس نے فون بھی کر دیا تھا۔“

”کسے۔“ میں نے پوچھا۔

”نئی دلی کی برانچ میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یوں کرتے ہیں آج شام نئی دلی جائیں گے۔ ایمپوریم سے بیجی سلو پوچھیں گے اور بھنداری کی برانچ سے کتابیں خریدیں گے۔“

نئی دلی سے میں سرسری طور پر واقف تھا۔ آخری مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ بالکل ہی نئی تھی۔ یوں جیسے نئی داڑھی ہوتی ہے یہاں ہے وہاں نہیں ہے۔ ادھر کم کم ادھر گھنی۔ کہیں شربتی کہیں سیاہ۔

ان دنوں نئی دلی بن رہی تھی۔ کچھ بن رہی تھی کچھ بننے والی تھی۔ لہذا اکھڑی اکھڑی خالی خالی اجڑی اجڑی۔ اداس ویران تھی۔

شام کے وقت جب ہم رکشا میں بیٹھ کر نئی دلی کی طرف جا رہے تھے تو میں بڑی توجہ اور شوق سے گردوپیش کو دیکھتا جا رہا تھا۔

سڑک بڑی عمدہ تھی۔ چوڑی تھی۔ دلی کی ساری سڑکیں ہی اچھی تھیں۔ خصوصاً وہ جو شہر سے باہر کو جاتی تھیں۔ یہ سڑک تو نئی دلی کو جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سبزا تھا۔ مکانات تھے۔ لیکن اتنی اداسی کیوں تھی۔ منظر بے جان کیوں تھا۔ اتنا سکون کیوں تھا۔

پھر دفعتاً جیسے نگاہوں سے پردہ ہٹ گیا۔ ارے سڑک پر پر ٹریفک اس قدر کم کیوں ہے۔ ہمارے ہاں تو سڑکوں پر موٹریں کتوں کی طرح بھونکتی پھرتی ہیں۔ سڑک پر آدمی کم ہوتے ہیں موٹریں زیادہ۔ اور پھر ہمارے ہاں موٹر سائیکل بھی تو تفریحاً سائیلنسر نکال کر گھاؤں گھاؤں کرتے ہوئے۔ چنگھاڑتے ہوئے۔ گزرتے ہیں۔ ہر چند منٹ کے بعد گویا آواز کا ایک زلزلہ آ جاتا ہے گزر جاتا ہے تو شکر ہے میرے اللہ کی آواز اندر سے ابھرتی ہے۔

ہمارے ہاں پرائیویٹ کاریں چلتی نہیں. دوڑتی ہیں۔ ویگنیں رکتی ہیں. چلتی ہیں. رکتی ہیں. چلتی ہیں۔ "رک چل" کا ناچ ناچتی ہیں۔ موٹر سائیکل سانپ چال چلتے ہیں۔ ہمارے ہاں سڑک پر جاؤ تو جلدی کا بخار چڑھ جاتا ہے جلدی۔ اور جلدی— اور جلدی۔ جلدی چلو— چلدی پہنچو— جلدی لوٹو— جلدی جیو— جلدی مرو۔

ٹھنڈی سڑک کالی سڑک

دلی کی سڑکیں اس لحاظ سے سب ٹھنڈی سڑکیں تھیں۔ نہ شدت سے تپتی تھیں نہ جلدی سے بل کھاتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے ۱۹۲۲ء کا لاہور یاد آ گیا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب سڑکیں آرام سے درختوں کی چھاؤں تلے یوں لیٹی رہتی تھیں جیسے شہزادیاں ہوں۔ اسی لئے تو ان دنوں لاہور کی مال روڈ کو ٹھنڈی سڑک کہتے تھے۔ آج کل اسے کوئی ٹھنڈی سڑک نہیں کہتا۔ کیسے کہے بھلا۔

اس زمانے میں لاہور کے شوقین مزاج لوگ تانگے یا فٹن میں بیٹھ کر شام کے وقت ٹھنڈی سڑک پر ٹہل لگانے جایا کرتے تھے۔ گھوڑے کی دلکی کی لے سنتے. فراغت سے گردوپیش کی طرف دیکھتے اور مونچھ مروڑتے۔ مقصود نہ کہیں جانا ہوتا نہ پہنچنا ہوتا نہ کام نہ کاج خالی تفریح۔

آج کل تو سڑک کو کالی سڑک کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ لیٹی نہیں دوڑتی ہے. ریس کرتی ہے. چیختی ہے. دہاڑتی ہے۔

دلی کی سڑکیں سب ٹھنڈی سڑکیں تھیں۔ موٹریں شریفانہ انداز میں چلتی تھیں۔ موٹر سائیکل چیختے نہ تھے۔ رکشے سڑک پر فٹ بال نہیں کھیلتے تھے۔ اور سائیکل رکشے— وہ تو بچارے ہونک رہے تھے۔

ارے یہ کیا دلی سڑکوں پر ایک ہی موٹر چلتی ہے کیا۔ ہند کی بنی ہوئی موٹر۔ سبحان اللہ بات ہوئی نا۔ اپنی چیز بناؤ اپنی چیز برتو۔ ایک ہم ہیں کہ اپنا کپڑا بناتے ہیں اس پر دساور کی مہر لگاتے ہیں تاکہ بکے۔ "میڈان پاکستان" کوئی نہیں خریدتا۔

صاحبو! میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ "اپنی چیز بناؤ۔ اپنی چیز خرید" کا شدت سے قائل ہوں لیکن اس کا کیا جائے کہ اپنی سڑکوں پر رنگ برنگ اور طرح طرح کی موٹریں چلتے

ہوئے دیکھ کر فخر سے میرا سر اونچا ہو جاتا ہے اور دل سے آواز اٹھتی ہے۔ باغ وہ ہوتا ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول اگے ہوں۔ ایک رنگ کے ہوں تو وہ باغ تھوڑا ہوا۔ کھیت ہوا کھیت۔

دلی میں ہم چار پانچ دن رہے۔ ہم صبح شام سڑکوں اور بازاروں میں آوارہ گردی کرتے رہے لیکن ایک ایکسیڈنٹ بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ چلو حادثہ نہ سہی حادثے کے آثار ہی دکھائی دیتے۔ سانپ نہ سہی سانپ کی لکیر ہی سہی۔ یہاں تو سڑک پر ہر چند قدم کے بعد ایک نا ایک لکیر نظر آتی ہے بلکہ لکیریں ہی لکیریں۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری بولا ” یہ فلیٹیں دیکھیں تم نے۔ “

” کون سی فلیٹیں۔ “

وہ ہنسا ” نظر نہیں آتیں کیا۔ “

” میں تو بھئی سڑک کی جانب دیکھ رہا تھا۔ “

” بڑی ماڈرن فلیٹیں ہیں۔ “

” یا اللہ یہ فلیٹیں ادھر بھی آگئیں کیا۔ “ میں نے آہ بھری۔

” کیوں خوبصورت نہیں کیا۔ “

” بڑی خوبصورت ہیں دیکھنے میں. باہر سے۔ “

” کیا مطلب۔ “ اس نے تیکھی نظر سے میری طرف دیکھا۔

” فلیٹیں دیکھنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ رہنے سہنے کے لئے ہوتی ہیں۔ جتنی خوبصورت نظر آتی ہیں اتنی ہی غیر آرام دہ ہیں۔ “

مجھے عمر کا دوست پیٹر کنگ یاد آگیا۔ پیٹر کنگ انگریز ہے۔ لندن میں رہتا ہے۔ اس روز عمر کے گھر کنگ کی دعوت تھی۔ مسعود. عماد. سجاد اور میں بیٹھے تھے۔

عماد نے کنگ سے پوچھا ” ایر کنڈیشنر کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ “

وہ بولا ” بہت پر اثر چیز ہے۔ “

” کیا مطلب ہے۔ “ عمر نے پوچھا۔

” بولا۔ ایر کنڈیشنر نے ہمارے آرکیٹکچر کی ایسی کی تیسی پھیر دی ہے۔ “ کنگ نے ایک آنسو میں غم درد کہہ دیا۔

صاحبو! میں اسلام آباد میں رہتا ہوں۔ دیکھنے میں بے حد خوبصورت شہر ہے لیکن ایر کنڈیشنر طرز تعمیر پر بنا ہوا ہے۔ ایر کنڈیشنر کی میں توفیق نہیں رکھتا۔ اس لئے ایک خوبصورت گھر میں گرمیوں میں یوں اطمینان سے پڑا رہتا ہوں جیسے فرائی پین میں پڑا ہوا ہارڈ بائلڈ انڈا۔ "

نئی دہلی کی ان فلیٹوں کو دیکھ کر میرا جی چاہا ان مکینوں کو جو ایر کنڈیشنر کی توفیق نہیں رکھتے باری باری گلے لگا کر رو دوں۔

سڑک پر بس سٹاپوں کی وہی کیفیت تھی جو اس روز مہرولی کی بس میں سے نظر آئی تھی جب ہم قطب صاحب جا رہے تھے۔

نوجوان لوگ اڈوں پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ "لو جی آ گئی نئی دلی" رکشا والا بولا۔ ہم رکشا سے اتر کر پیدل چلنے لگے۔

بے شک عمارتیں شہر کی نسبت نئے ڈھب کی تھیں لیکن خاصی پرانی نظر آتی تھیں۔ ماحول اداس اداس تھا۔ لوگ فٹ پاتھ پر جا آ رہے تھے۔ پھر بھی اداسی چھائی ہوئی تھی جب ہم پوچھتے پوچھتے بھنڈاری کی برانچ تک پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ یہ برانچ بھی ایر کنڈیشنر طرز تعمیر کی بنی ہوئی تھی۔ اس وقت پاور فیل ہو چکی تھی۔ اندر سٹال پر کھڑی خاتون پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ مرد سیلزمین گھبرا کر دوکان سے باہر نکل آیا تھا۔

یہ دیکھ کر ہم واپس ہو لئے۔

ایمپوریم تلاش کرتے کرتے اندھیرا ہو گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ایک ہی جگہ چار ایمپوریم واقع تھے۔ لیکن ان میں سے تین بند ہو چکے تھے۔ چوتھا بھی بند ہونے کو تھا۔ ہم نے دکاندار سے پوچھا۔

وہ بولا "ہاں مہاراج ہوتے تو ہیں بیجی سار کے گلاس لیکن اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں۔ "

"کہاں سے ملیں گے۔ " اشفاق نے پوچھا۔

"سپلائی کے متعلق ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ آرڈر لکھوا جائیں۔ شاید دس پندرہ دنوں تک آ جائیں۔ "

"جناب ہم تو پردیسی ہیں دو ایک دن میں واپس چلے جائیں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ

ہمیں یہ گلاس کہاں سے مل سکتے ہیں۔ "

لالہ جی بولے "دیکھئے سیدھی بات ہے یہ گلاس لکڑی کے بنتے ہیں۔ چاندنی چوک کے پاس ایک لکڑی کا بازار ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں۔ ممکن ہے آپ کو وہاں سے اتہ پتہ مل جائے۔ "

یہ سن کر ہمیں خود پر بے حد غصہ آیا۔ کہ دیکھو سیدھی بات تھی اور ہم نے اسے خواہ مخواہ الجھا رکھا ہے۔ ہم یہ سمجھتے رہے کہ بیجی سار ایک بوٹی ہے۔ کتنی احمقانہ سوچ تھی۔ بھی بوٹی کا گلاس بھی بن سکتا ہے۔ گلاس تو لکڑی کا بنتا ہے چاہے وہ لکڑی بوٹی کی ہو۔ جھاڑی کی ہو یا درخت کی ہو۔ بہرحال وہ لکڑی ہے۔ لکڑی بازار سے پورا اتا پتا مل جائے گا۔ اب ہمیں اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ اس قدر سیدھی بات تھی جو ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ اس پہ اشفاق اور میں شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ اگرچہ بظاہر اس کا اعتراف نہیں کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر شرمندگی اور خفت کا کانٹا لگا ہوا تھا۔

پھر یہ بھی ہے کہ پیدا چل چل کر ہم تھک چکے تھے۔

اتنا لمبا فاصلہ ہم کبھی نہ چلے تھے۔

نئی دلی کی تمام تر دوکانیں بند ہو چکی تھیں حالانکہ ابھی پوری طرح سے رات نہیں پڑی تھی۔

نئی دلی ایک ویرانے میں بدل گئی تھی۔ مجھے تو اس ویرانے سے خوف آنے لگا تھا۔

اب ہم ٹیکسی یا رکشا کی تلاش میں تھے۔ سڑک پر نہ کوئی ٹیکسی تھی نہ رکشا۔ پرائیویٹ کار بھی کبھی کبھار گزرتی۔ جب بھی کوئی رکشا رکتا تو ہم اس کی طرف اٹھ بھاگتے۔ دقت یہ تھی کہ اس وقت کوئی ٹیکسی رکشا ہمایوں کے مقبرے کی طرف جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

نئی دلی کی اداسی اور ویرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

گل مہر پارک

ایک روز شام کے وقت جب ہم حسب دستور ترکی حمام سے باہر کیکر کے درخت تلے بیٹھے مکھیاں اڑا رہے تھے تو ایک زائر بھاگے بھاگے آئے بولے "آپ سے کوئی ملنے آیا۔"

آئے نہ آئے

"مجھ سے بھلا کون ملنے آئے گا۔" میں نے سوچا۔

دلی میں صرف ایک آدمی تھا جسے میں نے دلی آنے کی اطلاع دی تھی۔ پہلے خط میں لکھا تھا۔ میرے دلی آنے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ دوسرے خط میں لکھا تھا امیر خسروؒ کے زائرین میں میرا نام شامل ہو گیا ہے۔ ابھی پروگرام طے نہیں ہوا۔ تیسرے خط میں لکھا تھا۔ ہم سترہ اگست کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔ اسی رات امرتسر سے دلی کو بذریعہ ریل پہنچیں گے۔ یہ ریل گاڑی اٹھارہ کی صبح کو دلی پہنچے گی۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے ہم ہمایوں کے مقبرے کے قریب جو سکاؤٹ کیمپ ہے. وہاں ٹھہریں گے۔ اور خبردار جو میرے آنے کی اطلاع کسی ادب والے یا بے ادب کو دی۔ ورنہ خطرناک نتائج ہوں گے جو قتل و غارت تک پہنچ سکتے ہیں۔

آخری خط میں روانہ ہونے سے ایک دن پہلے حوالہ ڈاک کیا تھا۔

جب گاڑی دلی سٹیشن میں داخل ہوئی تھی تو میں نے چوری چوری پلیٹ فارم کا جائزہ لیا تھا۔ اس امید پر کہ شاید فکر سٹیشن پر آیا ہو۔ اسے وہاں نہ پاکر میں نے بے نیازی

سے کہا تھا۔ نہیں آیا تو کیا ہوا لیکن ہوا تھا۔ کچھ کچھ۔ اس کے بعد تین دن چوری چوری میں یہ امید لگائے بیٹھا رہا کہ آئے گا۔ جب وہ نہ آیا۔ تو میں نے خود کو حوصلہ دیا آئے نہ آئے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے خاصا فرق پڑ گیا تھا۔

دوسرے دن ایک صاحب کیمپ میں آئے وہ کسی دوست سے ملنے آئے تھے۔ میں نے انھیں فکر کا فون نمبر دیا کہ اسے فون کر کے اطلاع دیں۔ کہ ہم آئے ہوئے ہیں اور کیمپ میں رہائش پذیر ہیں۔

تیسرے دن بھی فکر نہ آیا تو میں اعلانیہ فکر کی آمد کی امید کو گل کر کے بیٹھ گیا۔ اس لئے اس روز مجھے یہ خیال ہی نہ گزرا کہ شاید فکر آیا ہو۔

فکر تونسوی میرا پرانا دوست۔ اگر چہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا ہے لیکن پیدائشی بڈھا ہے۔ اندر آگ جلتی ہے۔ اوپر راکھ کا ڈھیر ہے۔ اندر سے وہ فکر ہی فکر ہے باہر سے تونسوی ہی تونسوی ہے۔

ہم دونوں

فکر تونسوی برصغیر کا جانا پہچانا شاعر۔ نثر نویس۔ طنز نگار اور کالمسٹ ہے۔

فکر اور میں پرانے دوست ہیں۔

ہم دونوں کی تخلیق ایک ہی خمیر سے ہوئی ہے۔

دونوں ہی داستوو سکی کے ایڈیٹ ہیں۔

دونوں نے احساس کمتری کی دلدل میں ڈوبتے ابھرتے. ڈوبتے ابھرتے زندگی بتائی ہے۔

دونوں کو "میں تو کچھ بھی نہیں" نے کھالیا۔ سہارا دیا، بنا دیا۔

دونوں ہی دبلے پتلے ٹھگنے کالے۔ میڈیاکر۔ نہ گنتی میں نہ شمار میں۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

دونوں ہی غربت کے مارے ہوئے۔ دونوں کو پیٹ بھرنے کے لئے سب کچھ گوارہ۔

دونوں کی گردنیں لٹکی لٹکی۔ شانے جھکے جھکے۔ بشرے سہمے سہمے۔ فکر کے پاس ایک

ادھوری مسکراہٹ تھی۔ کاٹ بھری مسکراہٹ جو دوسروں کی نسبت خود کو زیادہ کاٹتی تھی۔ اب بھی ہے میرے پاس وہ بھی نہیں تھی۔

دونوں غصے سے جلے ہوئے۔ میرا بھڑک اٹھنے والا اس کا دم پخت۔ دونوں ہی ادب لطیف کے مدیر تھے۔ وہ کام ہی کام میں نام ہی نام۔ تقسیم سے پہلے ادبی ماہنامہ ادب لطیف مونچھوں پر تاؤ دیئے دانشوروں اور ادبی نورتنوں میں شہنشاہ کی طرح براجمان تھا۔

یہ سب ٹھاٹھ چودھری کی وجہ سے تھا۔ ادب لطیف چودھری برکت علی کا لاڈلا بچہ تھا۔ جسے وہ سینے سے لگائے پھرتا تھا۔

چودھری برکت علی

چودھری برکت علی بھی عجب شے تھا۔ اوپر سے مونچھ مروڑ باپ اندر سے ہنے میں واری ماں — ایک طرف گن گن کر چلنے والا کٹر دوکاندار جو پلی پلی جوڑتا ہے دوسری طرف کپا لنڈھانے والا غنی۔

ایک طرف گھن گرج ڈکٹیٹر دوسری طرف چھلکا چھلکا بچہ۔

ایک جانب غصے سے بھرا ہوا بھوت۔ جو پھبتی اڑاتا ہے۔ پان پت اتار کر خوش ہوتا ہے۔ بات منہ پر دے مارتا ہے۔ دوسری جانب رضائی میں منہ دے کر آنکھ پونچھنے والا زود پشیماں۔

فکر اور میں دونوں برکت علی کی شخصیت کے دونوں پاٹوں تلے اکٹھے پس رہے تھے۔

بہر حال ایک بات واضح ہے اگر چودھری برکت علی نہ ہوتا تو ممتاز مفتی ممتاز مفتی نہ ہوتا۔

بہرطور ہم دونوں فکر اور میں ایک ہی کشتی پر سوار تھے۔ یہ کشتی چودھری برکت علی تھا۔

یہ کشتی ڈگمگاتی تھی ڈولتی تھی۔ ڈوبتی تھی۔ ابھرتی تھی۔ لیکن منزل کی طرف چلے جا رہی تھی۔

بھگوڑے:

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فکر اور میں دونوں ہی بھگوڑے تھے کھرے بھگوڑے۔

فکر کی منزل ادب تھی۔
میں محض اتفاقاً ادب میں آ نکلا تھا۔

وہ گھر سے اس لئے بھاگا تھا کہ دنیا کو بدل دے۔ امیری غریبی کا فرق مٹا دے۔ تھانے دار کی مرغی کو جیو ساربان کی سوکھی روٹی میں بدل دے۔ جیو ساربان کی سوکھی روٹی پر مکھن لگا دے۔

فکر بڑا لمبا فاصلہ طے کر کے ادب لطیف میں پہنچا تھا۔ اس نے راستہ پا لیا تھا اس لئے سمجھتا تھا کہ منزل کچھ دور نہیں۔

دفعتہً تقسیم کے فسادات شروع ہو گئے۔

مشرقی پنجاب سے خون کے بھبھا کے اٹھے اور لاہور پر چھا گئے۔

مسلمانوں کے قتل و غارت کی خبروں نے لاہور میں ہلچل مچا دی۔ امرتسریوں نے لاہوریوں کو چوڑیاں بھیجیں۔ لاہوریئے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح چھڑ گئے۔ بھن بھن بھن بھن۔

لاہور میں ہندوؤں کا رہنا خطرناک ہو گیا۔

فکر گھبرا گیا۔ اب کیا کرے۔ وہ ہندو تھا نہ مسلمان۔ وہ جوجگ کو سمجھانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ جگ کے غیظ و غضب کے دھارے میں بے بس تنکا بن کر بہہ گیا۔

مجبوراً اسے شرنارتھی بن کر ہند میں پناہ لینی پڑی۔

تقسیم کا اثر فکر پر بھی ہوا اور مجھ پر بھی۔ اس کا مذہب پر اعتماد اٹھ گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شدت سے محسوس کیا کہ میں مسلمان ہوں۔ وہ سوشلسٹ بن گیا۔ میں مسلمان بن گیا۔

ہند میں فکر نے کھل کر اپنے قلم کا نشتر چلایا اور وہ پیاز کے چھلکے کھولنے کے عوض ملاپ کا کالم نگار بن گیا۔ میں وہی نور دین کا نور دین ہی رہا۔

ادھوری مسکراہٹ

جب ایک زائر نے مجھے اطلاع دی کہ مجھ سے کوئی ملنے آیا ہے تو میں حیران ہوا۔ مجھ سے بھلا کون ملنے آئے گا۔ فکر کو تو میں اپنے ذہن سے خارج کر چکا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ فکر تونسوی میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر وہی ادھوری مسکراہٹ تھی۔

“ارے۔ تو فکر ہے کیا۔ ” میں نے چلا کر کہا۔ “نہیں میں نہیں مانتا۔ تو تو کوئی بوڑھا کھوسٹ ہے۔ تو فکر نہیں۔ تو تو مجھ سے بھی زیادہ بوڑھا ہے۔ ”

وہ چپ چاپ مسکراتا رہا۔

فکر کے پاس ازلی طور پر اظہار کے لئے کچھ بھی نہیں۔ نہ الفاظ نہ اشارہ نہ آواز ـــــ خالی خولی ایک چپ ـــــ جس پر وہ ادھوری مسکراہٹ یوں ٹنگی رہتی ہے جیسے کھونٹی پر لنگوٹی۔

“چھوڑ بھئی یہ بہروپیہ پن۔ تو۔ تو مجھ سے پندرہ بیس سال چھوٹا تھا۔ لیکن اب تو مجھ سے کہیں بڑا دکھتا ہے۔ ”

ادھر وہی چپ اور اس پر ٹنگی ہوئی ادھوری مسکراہٹ۔

“آپ کس سے ملنے آئے ہیں جناب والا۔ ” میں نے بڑے اخلاق سے پوچھا۔

چپ اور گہری ہو گئی اور مسکراہٹ پر نم۔

میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔

“اور لکھ ” میں نے طنز کی دھار چلائی اور چلا قینچی اور کتر پیاز کے چھلکے۔ جو دوسروں کو سچ کی راہ دکھاتے ہیں ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔ احمق ہند میں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہ۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ ”

بڑی مشکل سے وہ بولا “ تیرا خط آج ہی ملا ہے۔ ابھی۔ ”

فکر کے ساتھ اس کا جوان بیٹا تھا۔ اپنے باپ کے دوست کے سامنے وہ ادب وہ احترام سے کبڑا ہوتا جا رہا تھا۔

“یہ تیرا بیٹا ہے کیا۔ ” میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

“اس کی بھی ایسی کی تیسی پھیر دی تو نے۔ ” میں نے غصے میں کہا۔ “خود کو نہ بچایا اسے تو بچالیا ہوتا۔ ”

“اسے کیا ہے” اس نے مدہم آواز میں کہا۔

“اس پر ادب و احترام کی اوس جو پڑی ہے۔ دیکھتا نہیں اس پر اپنا اثر نہ ڈالتا تو یہ مس فٹ نہ ہوتا۔ شوخی ہوتی. شرارت ہوتی. بغاوت ہوتی۔ یہاں شرافت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ یہ کیا آج کل کا رنگ ہے۔ ”

“تیرا بیٹا کیسا ہے۔ ” وہ بولا۔

“مجھ ایسا نہیں۔ مجھ سے بہتر ہے۔ ”

“یہ بھی مجھ سے بہتر ہے۔ فکر کی ادھوری مسکراہٹ چمکی۔ ”

“یہ بتا مجھ سے ملنے میرے گھر آئے گا۔ ” اس نے مجھ سے پوچھا۔

“آؤں گا”

“کب — ”

“کل شام کو۔ ”

بھیلی اور مکھیاں

اگلے روز شام کو اشفاق حسین اور میں نئی دلی میں گل مہر پارک کی طرف جا رہے تھے۔

نئی دلی نہ نئی دکھتی تھی نہ پرانی نہ وہاں رونق تھی۔ اداس. خاموش. ویران۔ وہی صاف ستھری فلیٹیں وہی کالی ویران سڑک. وہی دو کانیں جو کھلی تھیں لیکن باہر سے یوں لگ رہا تھا جیسے بند ہوں۔ وہی شاپنگ سنٹر جس میں شاپنگ کی گھما گھمی نہ تھی. صرف سنٹر ہی سنٹر رہ گیا تھا۔

ہمارے ہاں تو شاپ گڑ کی بھیلی کی طرح ہوتی ہے اور شاپنگ مکھیوں کی بھن بھن۔ یوں لگتا تھا جیسے نئی دلی کی مارکیٹ میں گڑ مرتبانوں میں رکھا ہوا تھا اس لئے وہ دو کانیں بھن بھن سے محروم تھیں۔

نئی دلی کی بات نہیں۔ ساری دلی میں حتیٰ کہ چاندنی چوک میں بھی دوکانیں تو مال سے سجی ہوئی تھیں۔ گڑ کی بھیلیاں مرتبانوں میں نہیں باہر دھری تھیں پھر بھی بھن بھن نہ تھی۔

دہائی خدا کی۔ یہ کون سا دیس ہے جہاں آج بھی دوکاندار گاہکوں کو خود بلا رہے ہیں۔ ان کی توجہ مال کی طرف منعطف کر رہے ہیں۔

ہمارے ہاں تو دوکاندار اکتائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کا رویہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ خریدنا ہے تو خرید نہیں تو راستہ ناپ۔ کھسماں نوں کھا۔

وہ دن گئے جب دوکاندار راستہ روکتے تھے بھائی جی ادھر آؤ۔ کیا چاہئے۔ اب تو خریدار دوکاندار کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ چھ مرتبہ بلاؤ تو ایک مرتبہ جواب دیتے ہیں۔

وہ پرانا دور ڈیمانڈ اور سپلائی کا دور تھا۔ ان دنوں دوکاندار ضرورت مند تھا کہ خریدار آئے۔ اب خریدار ضرورت مند ہے لیکن یہ ہند کیسا دیس ہے کہ دوکاندار ابھی تک منتظر بیٹھا ہے کہ کب کوئی آئے۔

ہمارا رکشا شاپنگ سنٹر سے نکل کر ایک طرف چل پڑا۔ ویرانی بڑھتی گئی بڑھتی گئی۔

نئی دلی کے مضافات بالکل ہی ویرانے ہیں۔ بے شک لوگ تو بستے ہوں گے لیکن اتنے صراط مستقیمی لوگ۔ نہ جگھٹے نہ شور نہ شرابانہ ہماہمی نہ گہماگہمی۔ اتنے امن پسند اتنے سکون زدہ۔ دیر تک رکشاوالا منتظر رہا کہ کوئی گزرے تو وہ گل مہر پارک کا راستہ پتہ پوچھے۔

محلے اور بنگلے

ہمارے ہاں اسلام آباد میں بھی سڑکیں ویران ہوتی ہیں۔ اصولی طور پر جہاں بنگلے ہوں گے وہاں ویرانی ہوگی جہاں محلے ہوں گے وہاں چہل پہل ہوگی۔

اسلام آباد میں ایسے علاقوں میں چلے جاؤ جہاں کوارٹر واقع ہیں تو رونق نظر آئے گی۔ یہ رونق لوگوں کی ہوگی۔ بنگلوں کے علاقوں میں رونق سڑکوں پر ہوگی۔ لوگوں کی نہیں بلکہ کاروں کی۔

نئی دلی کی اس سڑک پر نہ لوگوں کی رونق تھی نہ کاروں کی۔ کبھی کبھار کوئی اکا دکا موٹر سائیکل دلکی چال چلتا نظر آتا۔ اسلام آباد کے موٹر سائیکل دلکی چال سے محروم ہیں وہ صرف سرپٹ سے واقف ہیں۔ سوار دلکی کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ اور اگر موٹر سائیکل سرپٹ دوڑنے کے ساتھ ساتھ چنگھاڑتا جائے تو وہ باعث فخر ہے۔

بڑی مشکل سے ہمیں گل مہر پارک ملا۔ یہ علاقہ واقعی گل مہر تھا۔ وہاں گل بھی تھے اور سکوت کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

علاقہ خوبصورت تھا۔ چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے ہوئے تھے جو دیکھنے میں خوبصورت نہ تھے لیکن ان سے سکون اطمینان اور گھریلوپن کی خشبو آ رہی تھی۔

پھر وہی نمبروں کی مشکل در پیش آ گئی۔ جو ہمیشہ سے میرا مقدر رہے۔

اگر مجھے ۲۸۶ نمبر ڈھونڈنا ہو تو ۲۸۴ تک نمبر صاف چلے جائیں گے۔ پھر دفعتہ گلی ختم ہو جائے گی۔ اگلی اگلی ۳۰۱ سے شروع ہو جائے گی۔ زندگی بھر میری تلاش کی کمند لب بام سے دو چار ہاتھ پہلے ٹوٹ جاتی رہی۔

پورے دو گھنٹے ہم تلاش میں سرگرداں رہے۔ آخر میں ایک گمنام کونے سے فکر کا گھر بر آمد ہو گیا۔ اس کونے کو نمبروں کے تسلسل سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔

رکشہ کا شور سن کر فکر باہر نکل آیا۔ چہرے پر وہی ادھوری مسکراہٹ۔

گھر بڑا معقول تھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"اتنے عمدہ گھر میں رہتا ہے بے۔ " میں نے اسے ڈانٹا۔

"دیکھ لے۔ "

"کتنا کرایہ دیتا ہے۔ " میں نے کہا۔

"میرا اپنا گھر ہے۔ " وہ بولا۔

میں نے دوبارہ گھر کا جائزہ لیا۔ "اونہوں میں نہیں مانتا۔ "

"نہ مان۔ "

"پیاز کے چھلکے چیرنے والا کالمسٹ اور اپنے گھر میں رہے۔ میں نہیں مانتا۔ نہ تو روز نامہ ملاپ اتنا دیا لو ہے اور نہ حکومت ہند۔ حکومتیں تو لکھنے والوں کو صرف جھنجھوڑتی ہیں۔ لکھنے والو جاگو اور قوم کو راستہ دکھانے کا فریضہ ادا کرو۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ انہوں نے

لکھنے والوں سے کبھی نہیں پوچھا کہ بھئی رات کو کھانے کے لئے روٹی ملی تھی کیا۔

اشفاق حسین ہنسا۔ بولا ”نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔ جب لکھنے والا مر جاتا ہے تو حکومتیں افسوس کا پیغام چھاپتی ہیں۔ “

” یہ فکر مرتا بھی تو نہیں۔ حکومت کو پیغام چھاپنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ “

”اس گھر میں تو اکیلا رہتا ہے کیا — “ میں نے فکر سے پوچھا۔

”نہیں۔ “ وہ بولا۔ ”میرا بیٹا میرے ساتھ رہتا ہے۔ “

”بڑا خوش قسمت ہے تو۔ “

وہ کس لئے۔ “ فکر نے پوچھا۔

”اس لئے کہ تیرا بیٹا تیرے مکان میں رہتا ہے۔ اس کے برعکس میں اپنے بیٹے کے مکان میں رہتا ہوں۔ تیری پوزیشن سپیریئر ہے۔ “

ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ ایک کھلا سا کمرا تھا جو آج کل کے ڈرائنگ روم اور پرانے زمانے کی بیٹھک کا امتزاج تھا۔

کمرے میں چار اصحاب بیٹھے تھے۔ فکر نے میرا تعارف کرا دیا۔ پروفیسر وحید. مجتبے حسین. بلراج کومل اور ورماجی۔ بلراج کومل کو تو میں پہلے سے جانتا تھا لیکن پہچان نہ سکا۔ ہم چالیس سال کے بعد ملے تھے۔ چالیس سال کے بعد تو انسان کا نام ہی نام رہ جاتا ہے باقی سب بدل جاتا ہے۔ “

دستہ اور پھل

ایک لکڑہارا اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اس کا کلہاڑا چالیس سال پرانا ہے۔

ایک دن ایک شخص نے پوچھا۔ کیا گذشتہ چالیس سال کے دوران کلہاڑے کو مرمت بھی کرایا۔

لکڑہارا بولا۔ ہاں مرمت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔

کتنی بار مرمت کروائی۔

لکڑہارا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ سات مرتبہ اس کا دستہ نیا لگوایا۔ اور سمجھ لو چار مرتبہ پھل بدلا ہو گا۔

ہم سب لکڑہارے کے اس کلہاڑے کے مصداق ہیں۔ میں وہ ممتاز مفتی نہیں ہوں جو چالیس سال پہلے تھے۔ فکر وہ فکر نہیں جو چالیس سال پہلے تھا۔ دستے بھی بدلے گئے. پھل بھی بدلے گئے۔ صرف نام وہی ہے۔

مجھے یاد ہے بلراج کومل۔ ایک کومل سا نوجوان تھا جسے نظمیں لکھنے کا جنون تھا۔ اب وہ خالی بلراج تھا۔ لیکن چہرے پر وہی معصومیت تھی۔ سادگی تھی وہی خلوص تھا۔ یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ بلراج کومل چالیس سال زندگی میں لت پت رہنے کے باوجود اپنی معصومیت برقرار رکھے ہوئے تھا۔

آذر ذوبی

۱۹۴۸ء میں ذوبی نے میرا مجسمہ بنایا۔ بنا چکا تو میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے کہا ”ابے او آرٹسٹ کے بچے یہ کیا بنا دیا تو نے۔ “

ذوبی نے کچھ جواب نہ دیا۔

میں نے غصے میں کہا ”میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔ “

بولا ”میں سمجھا میرے بیٹے سے پوچھ رہا ہے چونکہ میں آرٹسٹ ہوں آرٹسٹ کا بچہ نہیں ہوں۔ “

میں نے کہا ”ابے او آرٹسٹ یہ کیا بنا دیا تو نے۔ “

بولا ”تیرا سر بنایا ہے۔ “

”لیکن یہ چہرہ بھی تو دیکھ۔ “

”کیوں چہرے کو کیا ہوا ہے۔ “

یہ تو کسی جرائم پیشہ کا چہرا ہے۔ “

”اچھا۔ “ وہ بولا۔

”میرے چہرے میں شر تو نہیں۔ اس میں تو شر ہے۔ “

ذوبی کہنے لگا مجھے تو جیسا دکھا میں نے بنا دیا۔

”لیکن میرا چہرا ایسا تو نہیں۔ “

”ایسا نہیں تو ایسا ہو جائے گا۔ ہم لوگ تو اندر کے انسان کو دیکھتے ہیں۔ “

آج ۳۳ سال بعد اس بست کو دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا چہرا روز بروز اس بت کے رنگ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔

ایک روز بھائی جان نے مجھے سرکار قبلہ کا بیاض دیا۔ بولے "مفتی جی اسے اپنے پاس رکھئے۔ "

بھائی جان ایک بزرگ تھے۔ جن سے میں پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ملا تھا۔ میری زندگی میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے میرا رخ بدل دیا۔

میں تے کہا "بھائی جان یہ سرکار قبلہ کا بیاض ہے۔ مجھے رکھنے کے لئے نہ دیجئے۔ "

بولے "وجہ۔ "

اندر کا باہر کا

میں نے کہا "پہلے بھی ایک بار میں نے غلام محمد کے سرکار قبلہ کی بیاض اپنے پاس رکھی تھی۔ بڑی ندامت اٹھانا پڑی تھی۔

بھائی جان نے پوچھا "وہ کیسے۔ ؟"

اس پر میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا۔

میں نے کہا "جناب آج سے پنتالیس سال پہلے میں ساہیوال میں سول ماسٹر تھا۔

وہاں ایک صاحب تھے جن کا نام غلام محمد تھا۔ میرا دوستانہ ہو گیا۔

غلام محمد ستار بہت خوب بجاتا تھا۔ خصوصاً جب وہ نماز سے فارغ ہوتا۔

غلام محمد کہا کرتا تھا۔ نماز تو میں جیسی لیسی ادا کر لیتا ہوں لیکن مجھ میں دعا مانگنے کی صلاحیت نہیں۔ دعا مانگنا میری ستار پر ختم ہے۔ ایسی منتیں کرتی ہے۔ باڑے کرتی ہے۔ روتی ہے۔ سسکیاں بھرتی ہے۔ اتنی التجائیں کرنی آتی ہیں اسے کہ اللہ میاں سن کر خود تشریف لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

واقعی جب غلام محمد نماز سے فارغ ہوتا تو وہیں مصلے پر بیٹھے بیٹھے یوں ستار چھیڑتا کہ

سارا کمرا التجاؤں سے بھر جاتا۔

ایک روز میں نے غلام محمد سے کہا۔ "یہ جو تو نے گیتوں کے بول کاپی میں لکھ رکھے ہیں جنہیں تو ستار پر بجاتا ہے۔ یہ بڑے پر اثر بول ہیں ایک دن کے لئے یہ کاپی مجھے دے دے۔ میں نقل کر لوں۔ "

"نہ۔ " وہ بالا۔ "یہ کاپی نہیں دوں گا میں۔ یہ میرے سرکارؒ قبلہ مرحوم کی کاپی ہے۔ یہ بڑی پاکیزہ چیز ہے۔ "

میں نے چار ایک دن مسلسل منتیں کیں تو غلام محمد مجھے کاپی دینے پر آمادہ ہو گیا۔

میں کاپی گھر لے گیا۔

ان دنوں میں ایک بہت بڑے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ آدھی رات کے وقت پڑوسیوں نے شور مچا دیا۔ بولے "اٹھ بھائی۔ کوئی شخص گھنٹہ بھر سے تیرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ "

میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے غلام محمد کھڑا تھا۔ کہہ رہا تھا وہ کاپی مجھے واپس کر دے ابھی اس وقت۔ "

میں نے پوچھا "کیوں کیا ہوا۔ "

غلام محمد کہنے لگا "سرکار قبلہ نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا۔ کہتے ہیں جا کر کاپی واپس لا۔ تو نے ہماری چیز کو پیشاب کے مٹکے میں کیوں ڈال دیا۔ "

واقعی میں پیشاب کے مٹکے کی طرح ناپاک ہوں۔

بھائی جان مسکرائے بولے "مفتی جی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج آپ وہی ہیں جو آج سے پینتالیس سال پہلے تھے۔ "

میں نے عرض کی کہ میں تو اس سے بھی بدتر ہو گیا۔ روز بروز میرا چہرا زوبی کے بت کے مطابق ہوتا جا رہا ہے۔

بولے "کیا مطلب۔ "

میں نے کہا "جناب میرے چہرے پر شر کا عنصر ابھرتا جا رہا ہے "

بھائی جان بولے "اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ "

مجھے غصہ آ گیا۔ بولا "جناب شر کا ابھرنا رحمت ہے کیا۔ "

بولے "مفتی جی جب اندر کا شر باہر چہرے پر آ جائے تو سمجھ لو کہ اندر پاکیزہ ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی آپ وہ نہیں ہیں جو پینتالیس سال پہلے تھے۔ "

اس روز نئی دلی کی گل مہر کالونی میں نہ میں وہ تھا۔ نہ فکر وہ تھا۔ نہ بلراج کومل وہ تھا جسے ہم جانتے تھے۔ لیکن ہم تینوں سمجھ رہے تھے کہ ہم وہی ہیں۔

بلراج ورما ایک جاٹ طبیعت کا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا میں اسے نہیں جانتا تھا لیکن اسے دیکھ کر یوں محسوس کر رہا تھا جیسے جانتا ہوں۔ جیسے وہ اپنا ہی ہو۔ جانا پہچانا ہو۔ جذبات کا مارا ہوا رکھ رکھاؤ کا کچلا ہوا۔ یارباش۔ مگر ہلکا سا معتبر۔ دور سے دیکھو تو معزز۔ قریب جاؤ تو پینڈو۔

پروفیسر وحید صاحب جوان تھے۔ خوش شکل تھے کچھ زیادہ ہی محبوبیت کے مالک تھے۔ کلف لگا ہوا تھا۔ گردن میں ذرا سا خم ویسے بڑے پولایٹ۔ وہ ہم میں سے نہیں تھے۔ وہ میلے کو جا رہے تھے۔ ہم میلے سے لوٹ رہے تھے۔ مجتبٰے حسین بین بین تھے۔

انہوں نے میرا جائزہ لیا۔ پھر چہرے بولنے لگے۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر مجھے وہ محترمہ یاد آ گئی۔

میرے ایک ملنے والے صاحب تھے۔ ان کا نام شمیم تھا۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ شمیم کی ملاقات ایک بیگم قسم کی محترمہ سے تھی۔ محترمہ شمیم صاحب سے میری تعریفیں سن سن کر مجھ سے ملاقات کا اشتیاق رکھتی تھیں۔

ایک دن اتفاق سے سر راہ ملاقات ہو گئی۔ محترمہ نے میری طرف دیکھا۔ ان کی نگاہ میں حیرت چھلکی۔ پھر انہوں نے ہونٹوں کا بٹوہ بنایا اور شمیم صاحب سے سرگوشی میں بولیں "یہ ہیں ممتاز مفتی؟"

فکر اور کومل کے سوا حاضرین کے چہروں پر وہی تاثر تھا لیکن فکر کو کچھ پتہ نہ لگا۔ وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی ریجھا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ محبت کا اظہار کرتا جاتا توں توں حاضرین کے چہروں پر محترمہ والا اظہار اور بھی ابھرتا۔ ظاہر تھا کہ ان کی توقعات بری طرح سے مجروح ہوئی تھیں۔

شکر ہے میرے ساتھ اشفاق حسین تھا لہٰذا ان کی توجہ اشفاق پر مرکوز ہو گئی اور میں

نے اشفاق حسین کی اوٹ میں پناہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔

محرومی، پتھر

فکر کے جذباتی اضطراب کو اور کوئی راستہ نہ ملا تو وہ بولا "مفتی کی آمد کو منایا جائے۔" یہ سن کر حاضرین جو اجازت لینے کی سوچ رہے تھے پھر سے جم کر بیٹھ گئے۔

فکر بولا "مفتی تو شریک ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "میں محروم ہوں۔"

"واقعی میں محروم ہوں کیا۔"

چھوٹے چھوٹے واقعات انسان کی زندگی کے دھارے کو کس طرح موڑ دیتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے واقعہ نے مجھے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا تھا۔

کالج کے زمانے میں مجید ملک کی ہمشیرہ سے میرا جذباتی لگاؤ ہو گیا پہل محترمہ نے کی تھی۔ مجید ملک نے مجھ سے پوچھا کہ پہل کس نے کی تھی۔ میں نے کہا سارا قصور میرا ہے۔ اسے میرے بیان پر یقین نہ آیا۔ مجھ سے سچ اگلوانے کے لئے وہ مجھے سمعر لے گیا۔ سٹفلز اس زمانے میں لاہور کا پاش ہوٹل تھا۔ وہاں جا کر اس نے وسکی کا آرڈر دیا۔ میں نے معذرت کی۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر شامل نہ ہوئے تو ہمارے تعلقات ختم سمجھو۔ میں سمجھ گیا کہ بات اگلوانے کے لئے مجھے پلا رہا ہے۔ میں پتھر ہو گیا۔ میں اپنا بیان نہیں بدلوں گا نہیں بدلوں گا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پی تھی۔

پھر جب بھی پی۔ ۔ پتھر بن گیا۔

یوں وہ چیز جو چھلکا کر چھینٹے اڑاتی ہے میرے لئے پتھر ساز ہو کر رہ گئی۔

"ہمیں اجازت ہے۔" فکر نے پوچھا

"بالکل۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ۔" وہ اشفاق حسین سے مخاطب ہوا۔

"میں بیمار ہوں۔" اشفاق حسین بولا۔

فکر نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ بوتل لے آ۔

حاضرین کے چہرے کھل گئے۔

جب ہم امرتسر میں سکھ کے تانگے پر ہال بازار کا چکر لگا رہے تھے تو لوگوں کو شدت سے مصروف دیکھ کر میں نے کہا تھا۔ یہ لوگ مصروفیت کے خول میں کیوں رہتے ہیں۔ نہ ہلا گلا نہ سو دہاٹ نہ ہٹاؤ۔ اتنی مصروف اور اداس زندگی۔

سکھ ڈرائیور بولا۔ "مہاراج یہ دن کے وقت یونہی رہتے ہیں. بند کلی کی طرح جب رات پڑتی ہے تو سب الٹا پلٹا ہو جاتا ہے۔ بند کلی کھل کر پھول بن جاتی ہے۔ "

"وہ کیسے سردارا۔ " میں نے پوچھا تھا۔

"مہاراج رات کو بوتل جو کھل جاتی ہے۔ "

بوتل کھلی تو سارا گھر موجود تھا۔ بیوی بچے سبھی۔ کوئی بندش نہ تھی۔ حجاب نہ تھا چوری نہ تھی۔ مجھے کانگڑا یاد آگیا۔

جھول کا جھولا

کانگڑے کی پہاڑیوں میں آوارہ گردی کے دوران بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اتفاق سے ایک پہاڑی گھروندہ نظر آیا۔ میں پناہ لینے کے لئے اندر چلا گیا۔ اہل خانہ نے میرا خیر مقدم کیا اور میں بیٹھ گیا۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ ایک طرف چار عورتیں بیٹھی کچھ بن رہی تھیں۔ دوسری طرف ایک مرد بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

وہ سب بیٹھے گیت گا رہے تھے۔ عورتیں کام کرتے ہوئے مل کر ایک بول کہتیں۔ پھر مرد اکیلا دوسرا بول کہتا۔

ہر چند منٹ کے بعد ایک عورت اٹھ کر مٹکے سے چاولوں سے بنی ہوئی خانہ ساز شراب جھول نکالتی اور ہر فرد کے سامنے پڑا ہوا آبخورہ بھر دیتی۔ جسے سب ایک سانس میں پی جاتے اور پھر سے کام میں مصروف ہو کر گانا شروع کر دیتے۔

میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

گھر میں غربت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے لیکن کتنی بے فکری تھی. کتنی خوشی تھی. کتنی معصوم مستی تھی۔

اس وقت فکر کے ڈرائنگ روم کی اس گھروندے جیسی کیفیت تھی۔ فکر ایک

دوست کی آمد پر چھلک رہا تھا اور اس چھلک و قیام بخشنے کے لئے تلخ گھونٹ کا سہارا لے رہا تھا۔

حاضرین مفت کی پی رہے تھے۔ اہل خانہ خوش تھے کہ گھر رونق سے بھرا ہوا تھا۔

فکر کے گھر میں جس شخص نے مجھے متاثر کیا وہ اس کا نوجوان بیٹا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ نوجوان ہے۔ چونکہ وہ سادگی. معصومیت اور خلوص سے یوں چپ چپ کر رہا تھا۔ جیسے جلیبی شیرے سے چپ چپ کرتی ہے۔

فکر کو دیکھ کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ رو دوں۔

تونسے کے ایک میر منشی کا بیٹا پتہ نہیں کس خوش فہمی کے تحت شعر و ادب کو دیوتا بنا کر گھر سے نکلا تھا۔ بچپن ہی میں سارے کنبے کے پیٹ پالنے کی چِتا آ پڑی تھی۔ ذمہ داری کی اس گٹھڑی کو اٹھا تو لیا لیکن شعر و ادب کی لت نہ چھوڑی۔

ادب کی دہلیز پر پڑا رہا. پڑا رہا۔ یہاں تک کہ لکھاڑ بن گیا۔ سارے ہند دیس میں شہرت پائی۔ طنز و مزاح کے تیر چلاتا رہا. چلاتا رہا۔ اور آخر تھک کر بیٹھ گیا۔

خالی خولی نام کے سہارے کوئی کب تک کھڑا رہے۔ جب ادیب تھک کر بیٹھ جائے تو کبھی کبھار اٹھنے کے لئے اسے سہارا لینا پڑتا ہے۔

بدیشی میڈل

جب فکر مجھے اپنے میڈل اور امتیازی نشانات دکھا رہا تھا تو میری آنکھیں پر نم ہوئی جا رہی تھیں۔ کاش کہ ان امتیازی تمغوں میں ایک ہند کی طرف سے دیا ہوا تمغہ بھی ہوتا۔ فکر ایک ہندی ادیب ہے. صحافی ہے۔ اس نے ساری زندگی ہند کی خدمت میں بسر کر دی ہے اور وہ امتیازی تمغہ جو وہ اپنے دوست کو دکھا رہا تھا ایک اجنبی ملک کا دیا ہوا تھا۔

ایک ساعت کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ شاید فکر نے اسی لئے اس تلخ گھونٹ کا سہارا لیا تھا کہ وہ بدیشی تمغہ مجھے دکھا سکے۔

فکر کی کہانی ایک عام سی کہانی ہے ایسے ہر بڑے ادیب کی کہانی ہے جس نے اپنی تحریر کا سودا نہ کیا۔ یہ کہانی بڑی دکھ بھری کہانی ہے۔

ہند ادیبوں. فن کاروں. گائیکوں کا بے حد قدر دان ہے۔ پاکستان سے فنکار ہند جاتے ہیں۔ انھیں ہند پلکوں پر بٹھالیتا ہے ان کے وارے نیارے جاتا ہے ان کی دھوم مچاتا ہے حتیٰ کہ فن کار بوکھلا جاتا ہے۔ ایسے محسوس کرتا ہے جیسے سوتے جاگتے کا قصہ بیت رہا ہو۔ بے شک ہند فن کا مداح ہے۔ فنکار کا پروانہ ہے لیکن شرط یہ ہے وہ فنکار باہر سے آیا ہوا ہو۔ پاکستان سے آئے تو کیا کہنا۔ ۔ مہاراج آپ کے اپنے دیس میں جو جوگی بیٹھے ہیں۔ ان کی طرف بھی نگاہ کرم ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ ان سے اتنی بے مروتی تو نہ کیجئے کہ وہ اپنے دوستوں کو بیرونی ممالک کے بخشے ہوئے تمغے دکھانے پر مجبور ہو جائیں۔

میں ہند کی اس پالیسی کا بڑا معترف ہوں۔ سبحان اللہ کیا فن کی قدر دانی ہے۔ یہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن تھوڑی سی فن کار کی قدر دانی بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

بوتل خالی ہو گئی تو ہم اٹھ بیٹھے۔ ”اچھا بھئی اب اجازت۔ “

حاضرین رخصت ہو گئے۔

فکر کا بیٹا ہمارے لئے رکشالانے کے لئے اپنے سکوٹر پر چلا گیا۔

فکر نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبایا۔ بولا۔ ”کچھ لکھے گا۔ “

میں نے پوچھا ”کیا“

افیون کی لت

”سفر نامہ“

”دلی کا۔ “

”ہاں۔ “

”کیا فرق پڑتا ہے۔ “

”پڑتا ہے۔ “ وہ بولا۔

”تو نے زندگی بھر لکھا۔ “

”اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ “

”مجھ سے بہتر لکھا۔ “

”نہیں۔ “ ادھوری مسکراہٹ بوڑھے چہرے پر پھر سے ٹنگی گئی۔

“میں نے کہانیاں لکھیں. جھوٹی کہانیاں۔ پتہ ہے میری بیوی کیا کہتی ہے۔ ”

“کیا کہتی ہے۔ ”

“کہتی ہے بس کر اب۔ ”

کیوں۔ ”

“کہتی ہے کیوں جھوٹی کہانیاں لکھ لکھ کر اپنی عاقبت بگاڑ رہا ہے۔ ”

“یہ بھی یہی کہتی ہے۔ میری گھر والی۔ ” وہ بولا۔

“تو نے تو ہند کی سماج کو نکھارنے کے لئے لکھا۔ ”

“ہاں۔ ” وہ بولا “اسی خیال سے۔ ”

“پھر کیا پایا۔ ”

“کھویا تو نہیں۔ ” وہ بولا۔

“کھویا بالکل کھویا۔ کھو دیا۔ ” میں نے کہا۔

“کیا۔ ” اس نے پوچھا۔

“خود کو کھو دیا۔ ”

“اچھا۔ ” وہ سوچ میں پڑ گیا۔

“فکر۔ ” میں نے کہا “بڑے بڑے لکھنے والوں نے لکھا۔ ” ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہیں۔ ”

“سچ ہے۔ ” وہ بولا۔

“پھر کیا ہوا۔ ”

کچھ بھی نہیں۔ ”

“یہی ہمارا مقدر ہے۔ تیرے پاس دکھانے کے لئے بدیشی تمغے ہیں۔ میرے پاس وہ بھی نہیں ہیں۔ ”

بڑوں کی شوبھا

“اچھا۔ ” اس نے آہ بھری۔ “تو تو سفرنامہ نہیں لکھے گا۔ ”

“کیا پتہ لکھ دوں۔ یہ جو افیون کھانے کی لت پڑی ہے۔ اس کے ہاتھوں مجبور ہو

جاؤں۔ "

"اچھا ہو گا۔" وہ بولا۔

"تیری خوش فہمی نہ گئی۔ "

"اور میرے پاس ہے ہی کیا زندگی بتانے کے لئے۔ " اس نے جواب دیا۔

"سچ کہتا ہے تو۔ "

"ہمارے حق میں لکھے گا۔ " اس نے پوچھا۔

"تیرے۔ "

"نہیں ہند کے۔ "

"ہند ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ میری کیا حیثیت ہے۔ نہ میری نہ میرے ملک کی۔ میرا ملک ایک چھوٹی سی پناہ گاہ ہے۔ ہند جیسے عظیم ملک کے متعلق میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ صرف ایک درخواست ہے۔ ایک منت۔ ایک بنتی۔ "

"وہ کیا۔ " اس نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ہے ہند مہاراج۔ تم بڑے ہو تو وہ ہوں سے ایسا سلوک کرو جو بڑوں کو شوبھا دیتا ہے۔ "

رکشا کے شور نے ہمارا سلسلہ کلام کاٹ دیا۔

فکر نے محبت سے میرا ہاتھ دبایا اور وہی ادھوری مسکراہٹ پھر سے ٹانگ لی۔

واپسی پر نئی دلی بالکل ہی ٹھپ تھی۔ دکانیں بند تھیں۔ فٹ پاتھ پر اکا دکا آدمی چل رہا تھا۔ سڑکیں چپ چاپ لیٹی ہوئی تھیں جیسے آرام کر رہی ہوں۔ بتیاں جل نہیں سلگ رہی تھیں۔ حالانکہ ابھی نو بجے تھے۔ راستے میں اشفاق حسین اور میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اسلام آباد کی بتیوں سے بات شروع ہوئی پنڈی کی بتیوں تک پہنچی۔

دفعتاً رکشا ڈرائیور بولا "مہاراج آپ پنڈی سے آئے ہیں۔ "

بالکل۔ " ہم نے جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گیا۔

جب ہم حضرت نظام الدین ؒ کی درگاہ پر پہنچے تو رکشا رک گیا۔ رکشے کا ڈرائیور نیچے اترا۔

وہ ایک نوجوان ہندو تھا۔ معصوم۔ محنتی۔ جذباتی۔

وہ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بولا "مہاراج۔ کیا سچی مچی آپ راولپنڈی کے ہیں۔"

اشفاق حسین مسکرایا۔ بولا "ہاں ہم پنڈی کے ہیں۔"

نوجوان بولا۔ "مہاراج آپ مخول تو نہیں کر رہے۔"

"بالکل نہیں۔" اشفاق حسین نے کہا۔

"تم نے پنڈی دیکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مہاراج میں نے نہیں دیکھی پر میں اسے جانتا ہوں۔"

"وہ کیسے۔" اشفاق حسین نے پوچھا۔

نوجوان بولا۔ "جی میری نانی سارا دن پنڈی کی باتاں کرتی رہتی ہے۔ سارا دن ہمیں بتاتی رہتی ہے یہ لئی کا نالہ ہے۔ اس پر پل ہے۔ اس طرف باغ ہے۔ ادھر گوالمنڈی ہے۔ میری نانی کا گوالمنڈی میں گھر تھا۔ میں نے وہ گھر نہیں دیکھا جی۔ پر مجھے سب پتہ ہے۔ ادھر دروازہ تھا اندر ویہڑا تھا۔ پھر برانڈہ اور جی۔ ۔" اس کا گلا جذبات سے رندھ گیا۔

دفعتاً وہ ہمارے رو برو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "مہاراج میرے ساتھ ہمارے گھر چلو۔ ادھر پاس ہی ہے۔ بہتی دور نہیں۔ میری نانی روز مجھ سے کہتی ہے جیون لال جو تیرے رکشے پر کوئی پنڈی کی سواری بیٹھے تو اسے گھر لے آنا یہاں۔ ادھر میرے پاس میں اس کی کھاتر کروں گی اسے اپنے ہاتھ کے جمے ہوئے دہی کی لسی پلاؤں گی۔ بس تو اسے لے آ۔ چلو مہاراج میرے گھر چلو۔" اس نے منت کی۔

ہم دونوں نے اسے بہت سمجھایا بجھایا پر اس نے منتیں جاری رکھیں۔ "بھگوان کے لئے میرے ساتھ چلو جی۔ جو نانی کو پتہ چلا کہ پنڈی کی سواری لے کر میں گھر نہیں لایا تو ۔ ۔"

"بڑی مشکل ہے پیارے۔" اشفاق حسین بولا۔ "ہم تھکے ہوئے ہیں۔ میں بیمار

ہوں۔ ہمیں معافی دے دے۔ یہ لے اپنے پیسے شاباشے۔"

"نہ مہاراج۔" وہ مایوس ہو کر رکشا میں بیٹھ گیا۔

"پیسے تو لے جا۔" میں نے کہا۔

"نہ مہاراج۔" وہ رکشا سٹارٹ کر کے بولا "جو نانی کو پتہ چل گیا کہ میں نے پنڈی کی سواری سے پیسے لئے ہیں تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گی۔" یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا۔

ہم دونوں چپ چاپ کھڑے اسے دیکھتے رہے. دیکھتے رہے۔

راگ ودیا

اشفاق حسین راگ کا رسیا ہے۔

بے شک راگ کا شوق اللہ کی دین ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ شوق ایک حد سے بڑھ جائے تو بیماری بن جاتا ہے۔ اشفاق کا یہ شوق عرصہ دراز سے بیماری بن چکا ہے۔ راگ کے شوق میں سب سے پہلے آپ اپنی قوت سماع کو جگاتے ہیں۔ کانوں میں یہ صلاحیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ شدھ سر کو پہچانے اور آپ اس سے لطف اندوز ہوں۔ پھر جب شدھ سر کی حس پیدا ہو جاتی ہے تو آپ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ ہر غیر شدھ سر آپ کے لئے شور و غوغا کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اور پھر آپ کے ارد گرد شور شغب کا ایک جنگل جاگ اٹھتا ہے۔ بے سری کرخت آوازوں کا سمندر۔ سمندر میں آپ ڈبکیاں کھاتے ہیں۔

مصور زیادہ دیکھتے ہیں۔ موسیقار زیادہ سنتے ہیں۔ زیادہ دیکھنے کی افتاد اس قدر قیامت خیز نہیں جتنی زیادہ سننے کی۔ وہ آوازیں جو میرے لئے خوش کن ہیں۔ اشفاق حسین کے لئے باعث کوفت ہوتی ہیں۔ جسے میں گانا سمجھتا ہوں اشفاق حسین کے لئے وہ بے ہنگم شور ہے۔

اشفاق حسین کے کمرے میں دن کے وقت ڈبل بیڈ کے ایک حصے پر وہ خود لیٹا ہوتا ہے دوسرے پر اس کی ستار لیٹی ہوتی ہے۔ جب وہ ماحول کی آوازوں کی بے ربطی سے گھبرا جاتا ہے تو اپنی ستار اٹھا لیتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ستار یا تو ہچکیاں لے لے کر روتی ہے اور یا شوخ چنچل باتیں کرتی ہے۔

بیماری میں وہ اس کی واحد ساتھی ہے۔

اشفاق حسین کو مدتوں سے یہ شکایت تھی کہ اس کی ستار بولتی نہیں۔ بولے بھی تو اس کی آواز میں وہ لوچ پیدا نہیں ہوتا جو جانے ان جانے میں ایک جوان عورت اپنی آواز کے زیر و بم سے پیدا کر سکتی ہے۔ کرتی ہے تاکہ توجہ کا مرکز بنے۔

گونگی مہارانی

جب ہمارا ہند جانے کا پروگرام پکا ہو گیا تو اشفاق حسین کا چہرا پھول کی طرح کھل اٹھا۔ حالانکہ ان دنوں وہ بیمار تھا اور اسے خوف دامن گیر تھا کہ شاید وہ سفر کی تکلیفیں برداشت نہ کر سکے گا۔

بار بار وہ اپنی ستار کو دیکھتا۔ پیار سے اسے تھپتھپاتا جیسے تسلیاں دے رہا ہو۔ وہ اپنی ستار کو ہمیشہ سے ایک جیتا جاگتا ساتھی سمجھتا ہے۔ میں اس کی ستار کو مہارانی کہا کرتا ہوں۔

ایک دن میں نے پوچھا “آج کل مہارانی کی طرف بڑی توجہ ہے خیریت تو ہے”

“بالکل نہیں” وہ بولا۔ “خیریت بالکل نہیں۔ سکون نہیں ہیجان ہے ہیجان۔”

“وہ کیوں۔” میں نے پوچھا۔

“دونوں ہی چھڑے ہوئے ہیں۔” وہ بولا۔ “اس نے ستار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔” اور میں بھی۔

“لیکن ہیجان کیوں۔”

“پتہ نہیں” وہ بولا۔ ” “میں اسے تسلیاں دے رہا ہوں۔ یہ مجھے تسلیاں دے رہی ہے۔”

“ہاں سمجھا۔” میں نے ویسے ہی کچھ کہنے کو بات چلا دی۔ “تمہارے ہند جانے کی وجہ سے یہ اداس ہو گی۔ جدائی۔”

“نہیں” وہ بولا۔ ” الٹا یہ خوشی سے ناچ رہی ہے کہ میں ہند جاؤں گا۔ گزشتہ تیس سال سے اس کی زبان میں لکنت ہے۔ بے چاری بولتی تو ہے پر بول نہیں سکتی۔ باتیں تو

کرتی ہے لیکن زبان سے نہیں اشاروں سے۔ کیا کرے مہارانی کو آج تک تاریں میسر نہیں آئیں۔ اب میں دلی جاؤں گا وہاں سے تانبے کی تاریں لاؤں گا پھر تم سننا اسے یوں بولے گی جیسے جوانی سے چور مٹیار بولتی ہے۔"

اشفاق حسین سر میں مینڈھ کا عاشق ہے۔ میں بھی مینڈھ کا شوقین ہوں۔ اگرچہ میں مینڈھ کو ویسے نہیں سنتا جیسے اشفاق حسین سنتا ہے۔

دراصل اپنے تمام دوستوں میں میں سب سے کم سنتا ہوں۔ اس لئے سب سے زیادہ سکھی ہوں۔

میرا دوست اشفاق احمد بھی مجھ سے زیادہ سنتا ہے اس کا کان بہت حساس ہے۔ راہ چلتے چلتے وہ کسی نا کسی کا ڈائیلاگ بن کر اسے ذہن میں ریکارڈ کر لیتا ہے۔ پتہ نہیں اپنے ذہن میں اس نے ریکارڈ سسٹم کیسے بنا رکھا ہے۔ اس کے ذہن میں بیسیوں بولیاں محفوظ ہیں۔

پھر وہ محمد حسین تھا جو دنیائے آواز کا بادشاہ تھا۔ وہ ظالم مکالمے میں مینڈھ لگانا جانتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ریڈیو پر ایسے ایسے رول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا کہ جواب نہیں۔ وہ آواز کے اتنے شیڈ سمجھتا تھا کہ آج تک میں نے محمد حسین سا صدا کار نہیں دیکھا۔

سنگیت کا گھر

ہند جاتے وقت اشفاق حسین صرف اس بات پر خوش نہ تھا کہ وہاں سے اپنی ستار کے لئے تاریں لائے گا۔ یہ تحفہ تو وہ ستار کے لئے لانا چاہتا تھا۔ اپنے لئے اس کا پروگرام خاصا وسیع تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہند سے پرانے گائیکوں کے کیسٹ لائے۔

مثلاً وہ کئی ایک ستار نوازوں کے سنگیت لانا چاہتا تھا۔ عبدالکریم۔ جعفر خان۔ ولایت خان۔ ان کے والد عنایت خان۔ ڈی وی پلوسکر کی ساز سنگیت کا کیسٹ لانے کی اسے بے حد لگن تھی۔ ڈی وی پلوسکر جانے پہچانے گائیک وشنو ڈیگمبر کا بیٹا تھا جو ۳۲ سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا اور جس کی گائیکی کا کوئی نمونہ اس کے پاس نہ تھا۔

ان کے علاوہ اسے بسم اللہ کی شہنائی لانے کی آرزو تھی۔ اللہ رکھے کا طبلہ۔ اتنا لمبا چوڑا پروگرام۔ میں نے اشفاق حسین سے پوچھا۔

“بھئی ہند جا رہے ہیں۔” وہ بولا۔

میں نے کہا “یار ان گائیکوں کی چیزیں یہاں پاکستان میں نہیں مل سکتیں کیا۔”

“یہاں بازار میں۔ اونہوں۔” اس نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

“لیکن ہیں۔ افراد کے پاس موجود ہیں۔ وہ دیتے نہیں۔ ریکارڈ کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔”

“وہاں ہند میں بازار میں ملیں گی کیا۔”

“بالکل۔” اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا “ہند کو کیا سمجھتے ہو تم۔ ہند موسیقی کا گھر ہے۔”

“اچھا۔ ۔ بے شک ہند موسیقی کا گھر ہے۔ لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی۔”

“کیا۔” اس نے پوچھا۔

“پھر موسیقی کے بڑے بڑے گائیک مسلمان کیوں ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔”

“ٹھیک ہے۔” وہ بولا۔ “بے شک بڑے بڑے گائیک مسلمان ہیں۔”

“کیوں۔” میں نے پوچھا۔ “ہندو راگ کو مانتا ہے۔ مناتا ہے مسلمان نہ مانتا ہے نہ مناتا ہے لیکن بڑے بڑے استاد مسلمان ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔”

“پتہ نہیں۔” وہ بولا۔ “لیکن ہند موسیقی کا گھر ہے۔”

“وہ تو ہے۔ ہندو بہت قدر دان ہے نا اس لئے۔”

“دلی میں پورا ایک دن میں کیسٹوں کے چناؤ پر لگاؤں گا تم برا تو نہ مانو گے۔” اشفاق حسین نے پوچھا۔

“بالکل نہیں۔” میں نے جواب دیا۔ “مجھے تو صرف ایک کام ہے ہومیوپیتھی کی کتابیں خریدنا۔ اس کے بعد جو جی چاہے کرنا۔”

“اس کے بعد صرف دو کام ہیں بیجی سار اور راگ و دیا۔” اشفاق نے جواب دیا۔

“اور وہ جو پروین سلطانہ ہے۔” میں نے اسے طعنہ دیا۔

“ہاں پروین سلطانہ۔” اس نے آہ بھری۔ “یار مفتی۔ زندگی میں میری صرف ایک خواہش ہے کہ میں پروین سلطانہ کا انٹرویو لوں اور پھر دنیائے موسیقی سے اسے متعارف

کراؤں کہ اندھو دیکھو۔ دیکھو کہ شدھ سر کس طرح جسم میں ڈھل گئی ہے۔ دیکھو کہ گلے کا معراج کیا ہے۔ سنو اور سر دھنو۔ وہ جذباتی ہو گیا۔ "

لتا کا دیش

کاش کہ میں بھی کان والا ہوتا۔ میں نے کہا۔

"اونہوں۔ " وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اپنے حق میں بد دعا نہ کرو۔ "

"میرا جی چاہتا تھا۔ " میں نے کہا۔

"کیا۔ " اس نے پوچھا۔

"میرا جی چاہتا تھا کہ جب دلی کے سٹیشن پر اتروں تو دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لوں اور پھر آنکھیں بند کر کے ہونٹ ہلائے بغیر کہوں ۔۔ "اے لتا منگیشکر کے دیس میں تجھے پرنام کرتا ہوں۔ میرا اسلام قبول کر۔ "

"لتا تو بمبئی میں رہتی ہے۔ " وہ بولا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو میرے دل میں رہتی ہے۔ زندگی میں جتنا سکھ جتنی خوشی مجھے لتا نے دی ہے. کسی اور فرد واحد نے نہیں دی۔ جوانی میں اس نے مجھے دل کی دھڑکنیں دیں۔ بڑھاپے میں دل کا سکون دیا۔ ظالموں نے اسے مندر سے نکال کر فیشن پریڈ میں بٹھا دیا ہے۔

"کیا مطلب۔ " وہ بولا۔

لتا کو موسیقی سے نکال کر پاپ گانوں میں ڈال دیا۔ تمہیں پتہ نہیں اشفاق حسین میرے دل میں ہندی فلم سازوں کی کتنی عزت تھی۔ پہلے نیشنل تھیٹرز تھے۔ پھر پربھات آئی۔ بمبئی ٹاکیز آئیں۔ اور وہ ظالم سہراب مووی۔ انہوں نے خالی ڈرامہ ہی نہیں وہ وہ سنگیت فلمائی کہ جواب نہیں۔

"ہند کیا کرے۔ " اشفاق حسین بولا۔ "نئی روش بیماری کی طرح آئی ہے۔ "

"اونہوں۔ میں نہیں مانتا۔ " میں نے کہا "میرا دل نہیں مانتا۔ ہندو اور شدھ سنگیت چھوڑ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ "

دریا گنج میں چلتے چلتے دفعتاً اشفاق حسین رک گیا بولا "یار بڑی بھول ہوئی۔ "

"کیا" میں نے پوچھا۔

دلی پہنچنے پر میں نے تمہیں یاد نہ کرایا کہ لتا کے دیش کو سلام کرنا ہے۔

اس روز ہم دونوں راگ ودیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہند میں راگ ودیا کی تلاش کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ راگ ودیا تو ہند کی روح ہے پھر تلاش کا کیا مطلب۔

قدر دان ہند

مجھے یاد ہے۔ لاہور اوپن ایر تھیٹر میں محفل موسیقی جمی ہوئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے ٹیلے پر ہجوم نے یورش کر رکھی ہو۔ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ چوٹی کے گلوکار اپنے فن کی نمائش کر رہے تھے۔ سامعین بڑے شوق سے سن رہے تھے۔

دفعتاً گائیک ناظرین کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اس اسٹیج کے قریب ایک معمر اور معزز لالہ جی دونوں ہاتھ جوڑ ماتھے پر رکھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ناظرین نے شور مچا دیا۔ بیٹھ جاؤ۔ لالہ جی بیٹھ جاؤ۔

اس کے باوجود لالہ جی جوں کے توں کھڑے رہے۔

ہجوم نے پھر شور مچا دیا۔ بیٹھ جاؤ لالہ جی بیٹھ جاؤ۔

لالہ جی لولے۔ "مہاراج کیسے بیٹھ جاؤں۔ "

ہجوم سے آواز آئی۔ "کیوں کیا تکلیف ہے۔ "

لالہ جی بولے۔ مہاراج جب گنی دیوتا کھڑے ہوں تو میں کیسے بیٹھوں۔ "

میں سمجھتا تھا کہ ہند میں گنی دیوتا کے ارد گرد سبھی ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں گے۔ تلاش کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔ لیکن دو گھنٹے سے ہم دلی میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ مہاراج یہ بتایئے کہ راگ ودیا کی دکان کدھر ہے۔ راگ ودیا کا نام سن کر کوئی بھی توجہ نہ دیتا تھا۔ نوجوان حیرت سے ہمیں دیکھتے۔ انکے ہونٹوں پر تمسخر کھیلتا۔

تاریں

در اصل ہم غلط توقعات لے کر ہند پہنچے تھے۔ پھر دوسرے دن جب ہم بھنڈاری جی کی دوکان تلاش کر رہے تھے تو دریا گنج میں پانی کی ریٹری کے سامنے ایک سکھ کی دکان نظر آئی جس میں موسیقی کے ساز سجے ہوئے تھے۔ اشفاق حسین رک گیا۔

دکان کے اندر ایک بانکا سکھ نوجوان مصروف کار تھا۔

"سروار جی ــــ" اشفاق حسین نے کہا۔ "ستار کی تاریں ہوں گی آپ کے پاس۔"

جتنی مرضی ہے لو مہاراج۔ " سکھ نے جواب دیا۔

لیکن سردار جی چاہیں تانبے کی۔

"بالکل تانبے کی۔" وہ یوں بولا جیسے تاریں کسی اور چیز کی بنتی ہی نہ ہوں۔

"واہ" اشفاق حسین بولا۔ " یہ کام تو چلتے چلتے ہی ہو گیا۔ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکڑی۔"

"کتنی تاریں چاہیں آپ کو۔" سکھ نے دو چار تاریں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اونہوں۔" اشفاق حسین بولا۔ "اتنی سی نہیں۔ پانچ وس سال کی ذخیرہ اندوزی تو ہو سروار جی۔"

"اچھا مہاراج۔" سکھ ہنسا۔ "وہاں نہیں ملتیں کیا۔"

"وہاں کہاں۔" اشفاق نے پوچھا۔

"ادھر پاکستان میں۔" وہ بولا۔

"اونہوں ــــ ادھر تانبے کی نہیں ملتیں۔"

"ایک بات پوچھوں سردار جی۔" میں نے کہا۔

"پچھوجی پچھو۔" وہ پنجابی پر اتر آیا۔

" آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔" سکھ ہنسا۔ کہنے لگا۔ "مہاراج جو سیبوں کے ٹوکرے میں انار رکھ دو تو پتہ نہیں چلے گا کیا۔"

"اچھا۔" اشفاق حسین ہنسا۔ "میں سمجھا کہ آپ نے ہماری باتوں سے اندازہ لگایا ہو گا۔"

"صرف باتوں سے نہیں۔ ہر بات سے پتہ چلتا ہے۔ چال سے۔ ڈھال سے۔ رنگ سے۔ بولی سے۔ پھر آپ تو میرے گرائیں ہیں مہاراج۔ "

"ارے۔ " اشفاق حسین چلایا۔

"ہم بھی پچھل پنڈی سے ہیں۔ " سکھ ہنسا۔

اشفاق حسین نے اسے چھیڑا۔ بولا۔ "ہم تو اسلام آباد سے ہیں۔ "

سکھ بولا۔ "لو مہاراج وہ کیا دو ہیں۔ پنڈی اور اسلام آباد۔ پنڈی سمجھ لوو گھر اے اسلام آباد اس کا ڈرینگ روم ہے۔ "

پھر وہ کاروباری انداز سے بولا "مہاراج جو زیادہ تاریں لینی ہیں تو کل آ جاؤ۔ میں سٹور سے نکال رکھوں گا۔ جیسی مرضی ہو لے لینا جتنی مرضی ہے لینا۔ "

دکان سے باہر نکل کر اشفاق حسین بولا۔ "میں نے کہا نہ تھا ہند سنگیت کا گھر ہے۔ دیکھ لو پہلی ہی دکان سے تاریں مل گئیں۔ "

"مان گئے۔ " میں نے جواب دیا۔

بیگمات

اسی روز شام کے وقت جب ہم جامع مسجد کے قرب و جوار میں آوارہ گردی کر رہے تھے تو اشفاق بولا۔ "یار تھک گئے۔ "

"تھک گئے ہو تو چلو واپس چلتے ہیں۔ پکڑوں رکشا۔ "

"اونہوں۔ " وہ بولا۔ "ابھی سے واپس چلے جائیں کیا۔ "

"تو پھر "

"ذرا دیر یہاں بیٹھتے ہیں۔ دم لے کر آگے چلیں گے۔ "

ہم دونوں ایک تھڑے پر بیٹھ گئے۔

اشفاق نے کہا "یار ادھر عورتیں نظر نہیں آ رہیں۔ "

"عورتیں تو بہت سی دیکھی ہیں میں نے۔ پر وہ نظر آنے والی نہیں۔ "

"یہ کیا بات ہوئی۔ " وہ ہنسا۔ "وہ عورت ہی کیا ہوئی جو نظر آنے والی نہ ہو۔ "

"یہاں ہند میں تو نظر آنے والی عورت دیکھنے میں نہیں آئی۔ ورکنگ وومن ہیں۔ جو ورکنگ زیادہ ہیں وومن کم کم۔ "

"نہیں یار" — وہ بولا۔ "یہ چاندنی چوک کا علاقہ ہے۔ شاپنگ سنٹر ہے۔ شاپنگ سنٹر میں عورت نہ ہو۔ "

"دیکھ لو نہیں۔ " میں نے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں تو شاپنگ سنٹر میں بیگمات ہی بیگمات ہوتی ہیں۔ "

"ہاں۔ " میں نے جواب دیا۔ "ہم نے آزادی کے دور میں بیگمات پروڈیوس کی ہیں۔ ہند نے اسلحہ پروڈیوس کیا ہے۔ دونوں میں چنداں فرق نہیں۔ "

اشفاق حسین ہنسا۔ بولا "یار تھوڑی سی بیگمات بھی پروڈیوس کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ بازاروں میں رونق ہو جاتی۔ اب دیکھ لو یہاں ہم کس قدر روکھے پھیکے بیٹھے ہیں۔ "

اتنے میں ایک سائیکل رکشا گزرا جس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی۔

میں نے اشفاق حسین کو کہنی ماری۔ "لو اپنی روکھ پھیک دور کر لو۔ "

وہ ہنسا۔ بولا یار اس منظر سے تو روکھ پھیک اور بڑھ گئی ہے۔

"اس لئے کہ برقعہ ہے۔ " میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "یہ برقعہ تو بالکل ہی برقعہ ہے۔ "

"ہمارے ہاں بھی تو برقعے ہوتے ہیں۔ "

"وہ برقعے اور یہ برقعہ اور۔ "

"کس طرح۔ "

"ہمارے ہاں تو برقعہ حسن کو اور بھی نمایاں کرتا ہے وہ تو ڈیکوریشن ہوتا ہے اور یہ اس نے تو سرپوش کی طرح ڈھانپ رکھا ہے — مستور کر دیا ہے۔ اور پھر یہ خاتون تو خود برقعہ بی بی تھی۔ برقعے کے اوپر برقعہ۔ "

عین اس وقت اوپر سے ایک سریلی سی آواز سنائی دی۔ اشفاق چونکا۔ "یہ کیسی آواز ہے۔ "

"باجہ ہے۔ " میں نے کہا۔

"اعلیٰ قسم کا باجہ ہے۔ " وہ بولا " آرگن لگتا ہے۔ "

ہم اٹھ بیٹھے۔ چوبارے پر بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ نیشنل سنگیت کمپنی۔

" یہ تو دکان معلوم پڑتی ہے۔ چلو اوپر چلیں۔ " وہ بولا۔

اوپر ایک بہت بڑا کمرا تھا جس میں سنگیت کے ساز پڑے تھے۔ ہارمونیم. طبلے. ستاریں۔ ایک بانکا سکھ دو فارینرز سے باتیں کر رہا تھا۔

" آؤ مہاراج آؤ۔ بیٹھو۔ " اس نے ہم سے کہا۔

ہم بیٹھ گئے۔

" میں ذرا ان سے فارغ ہو جاؤں۔ " وہ بولا۔

وہ دونوں ستار کی خریداری کی بات کر رہے تھے ایک جرمن تھا ایک انگریز۔ انگریز باتیں کر رہا تھا۔ جرمن چپ چاپ بیٹھا مسکرائے جا رہا تھا۔

کچھ دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ پہلے تو اشفاق حسین چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر دخل در معقولات سے بولا۔ "ایک بات بتائیے۔ "

انگریز چونکا۔

اشفاق حسین نے کہا۔ " آج کل یورپ میں ستار کیوں مقبول ہوتی جا رہی ہے؟۔ "

سکھ نے جواب دیا۔ " مہاراج میں پانچ سال پیرس میں رہ کر آیا ہوں۔ وہاں بھی ہماری ایک دکان ہے۔ ہم یہاں سے ستاریں منگواتے تھک جاتے تھے۔ وہاں یہ صورت تھی کہ آئی اور بکی. آئی اور بکی۔ "

انگریز بولا۔ "یہاں مغرب کی دھن لگی ہے وہاں مشرق کی دھن سوار ہے۔ "

جب فارنرز چلے گئے تو اشفاق حسین نے تاروں کی بات چھیڑ دی۔

سکھ نے کہا۔ " مہاراج۔ جتنی تاریں کہو۔ "

اشفاق نے کہا " جرمنی کی بنی ہوں۔ تانبے کی ہوں۔ "

" بالکل جرمنی کی۔ " سکھ نے کہا اور پھر تاروں کا ایک پلندہ لا کر ہمارے

سامنے ڈھیر کر دیا۔

اشفاق حسین نے اپنی مرضی کی تاریں چن لیں۔

جب ہم دکان سے نیچے اترے تو اشفاق نے فخر سے کہا۔ “میں نے کہا نہ تھا یہ ہند ہے اور ہند سنگیت کا گھر ہے۔ ”

ستار کی تاریں اتنی آسانی سے مل گئیں تو ہم سمجھے کہ بڑے بڑے گائیکوں کی چیزیں بھی آسانی سے مل جائیں گی۔ لیکن اس روز ہم چاندنی چوک کے قرب و جوار میں دو گھنٹے سے سرگرداں پھرتے رہے لیکن کسی دکان سے شدھ سنگیت کے کیسٹ نہیں مل رہے تھے۔

کیسٹ بازار

ہمیں یوں سرگرداں دیکھ کر ایک لالہ جی رک گئے۔ کہنے لگے آپ کیسٹ ڈھونڈ رہے ہیں تو کیسٹ بازار میں جائیے۔ انہوں نے ہمیں راستہ سمجھا دیا۔

کیسٹ بازار کو دیکھ کر اشفاق حسین کی امیدیں پھر سے جاگ اٹھیں۔ کہنے لگا۔ “اب آئے صحیح جگہ۔ اب سمجھ لو بات بن گئی۔ ”

پہلی دکان سے پوچھا تو دکاندار نے بات سنے بغیر ہی سر ہلا دیا۔ اور خود دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جب چھٹی دکان پر بھی یہی ہوا تو ہم سٹپٹا گئے۔ ساتویں دکان میں ہم آرام سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جب دکاندار فارغ ہوا تو اشفاق حسین نے پوچھا۔ “مہاراج ہمیں پکے راگ کے کچھ گانے چاہیں۔ کہاں سے ملیں گے؟۔ ”

دکاندار بولا۔ “پکے راگ کے کیسٹ ادھر تو نہیں ملیں گے۔ یہاں تو مہاراج فلمی میوزک ہے جتنی مرضی ہے لے لو۔ ”

“تو کہاں ملیں گے۔ ” اشفاق حسین نے پوچھا۔

“وہ تو جی بمبئے میں ملیں گے۔ ادھر دلی میں نہیں۔ ”

“ہند تو موسیقی کا گھر ہے مہاراج۔ ” میں نے کہا۔

“ہو گا مہاراج۔ ” دکاندار بولا۔ ” پر ادھر تو فلم گیت کے سوا کوئی خریدار

نہیں۔ "

میں نے کہا۔ "جناب چلئے ایک فلمی کیسٹ ہی دے دیجئے۔ "

"جون سا مانگو مہاراج۔ "

"کملا جھریا کا دے دیجئے۔ " میں نے کہا۔

"کملا جھریا۔ " وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "وہ کون ہے جی۔ ہم نے تو نام نہیں سنا۔ "

میں نے کہا۔ "مہاراج وہ مشہور گانے والی تھی پرانے زمانے کی۔ "

"نہ مہاراج۔ پرانے زمانے کے نہیں چلتے۔ ادھر تو نئے زمانے کے چلتے ہیں۔ پاپ میوزک۔ "

کیسٹ بازار میں کوئی بیس بائیس دکانیں تھیں۔ ہم نے کوئی دکان نہ چھوڑی۔ ہر جگہ سے وہی جواب ملا۔

دفعتہً اشفاق حسین کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بولا۔ "کہیں بیٹھ جائیں۔ "

سکرٹ اور پونی ٹیل

ہم پھر سے ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔ مایوسی نے اسے تھکا دیا تھا اس لئے وہ چپ تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ اگر کوئی بات کی تو وہ تڑخ جائے گا۔

دفعتہً ساتھ والی گلی سے بچیوں کا ایک غول نکلا۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت صاف ستھری زندگی سے بھرپور۔ مہذب بچیاں۔

ان بچیوں نے نیلے رنگ کے کاٹن کے سکرٹ پہن رکھے تھے۔ اوپر سفید بلاؤز۔ سفید موزے اور جوتے۔ بال انگریزی اسٹائل کے۔

اتنے سارے خوبصورت بچے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔

"ضرور کوئی انگلش سکول لوٹا ہے۔ " میں نے کہا۔

"حد ہو گئی۔ " اشفاق حسین بولا۔ "بالکل ہی انگریزی۔ ذرا فرق بھی تو

نہیں۔ ”

“ہندو سے مجھے امید نہ تھی۔ ” میں نے کہا کہ وہ اس قدر مغرب پسند ہو جائیں گے۔

“ہم کیا کم ہیں۔ ” اشفاق نے کہا۔

“جب انگریز گیا تھا تو لاہور میں سات انگلش سکول تھے۔ اب ۳۱۶ ہیں۔ ” میں نے جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گیا۔

دیر تک ہم خاموش رہے۔

پھر میں نے اسے چونکایا “کیا سوچ رہے ہو۔ ”

“میں سوچ رہا ہوں ” وہ بولا کہ “جسے میں راگ ودیا کا گھر سمجھ رہا تھا. وہ تو راگ ودیا کا قبرستان بن گیا ہے۔ ”

“کیوں۔ ”

“جس دیس کی بچیاں سکرٹ اور بلاوز پہنتی ہیں۔ سفید رنگ کی جرابیں چڑھاتی ہیں اور پونی ٹیل بناتی ہیں وہاں ہندئی راگ ودیا کا قبرستان نہیں بنے گا تو کہاں بنے گا۔ ”

زیارتیں

ایک روز صبح سویرے ہی چھوٹی داڑھی والا نوجوان ہال میں گھوم پھر رہا تھا۔

چھوٹی داڑھی والا ایک جاذب توجہ کردار تھا۔ اس کے کردار کا رخ باہر کی جانب تھا۔ اندر کی جانب نہیں۔ جسے عام طور پر ایکسٹروورٹ کہتے ہیں۔ ملنسار تھا. باتونی تھا چاک وچوبند تھا۔ اس میں ذرا جھجک نہ تھی۔ برتاؤ میں بے تکلف تھا۔

امرتسر کے سٹیشن پر وہ دفعتۃً نمودار ہوا تھا۔ دلی تک اس نے ہمارے ساتھ سفر کیا تھا۔ دلی سٹیشن سے سکاؤٹ کیمپ تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ یوں زائرین سے گپ شپ مارتا رہا جیسے ہم میں سے ہو۔ پھر دفعتۃً گم ہو جاتا۔

پھر کسی روز بن بتائے. بن تذکرہ کئے کہ وہ گم ہو گیا تھا یا کیوں گم ہو گیا تھا یا کہاں رہا تھا. وہ ادھر ادھر سے دفعتۃً یوں نمودار ہوتا اور ہم میں شامل ہو جاتا جیسے گم ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے مسلسل ہمارے ساتھ رہا ہو۔

وہ آ رہے ہیں:

ایک روز اس نے آکر اعلان کیا۔ "وہ آ رہے ہیں۔" اس پر سبھی چونکے. کون آ رہے ہیں۔

"میں کہتا ہوں وہ خود آ رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "وہ خود۔"

"کہاں آ رہے ہیں" زائرین نے پوچھا۔

“یہاں آ رہے ہیں۔ ” اس نے جواب دیا۔ “خود۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں— ”

“یہاں کہاں۔ ”

“زائرین سے ملنے آ رہے ہیں۔ ”

“کیا کہا ہم سے ملنے آ رہے ہیں۔ ہم سے۔ ”

“ہاں۔ آپ سب سے ملنے آ رہے ہیں۔ ”

“نہیں یار مخول نہ کر۔ ” ایک صاحب بولے۔ “ہم سے ملنے کون آتا ہے۔ ”

“میں جو کہہ رہا ہوں کہ وہ آ رہے ہیں۔ ” چھوٹی داڑھی والا سنجیدہ ہو کر بولا۔

“سچ کہہ رہا ہے کیا۔ ”

“بالکل۔ ” وہ بولا۔ “انہوں نے خود فرمایا ہے کہ ہم جائیں گے۔ ”

اس پر سارے کیمپ میں شور مچ گیا۔

“بھئی سنا تم نے۔ وہ آ رہے ہیں۔ ”

“یار ادھر ادھر نہ جانا۔ وہ آ رہے ہیں۔ ”

“سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جانے کا۔ ”

“یہ کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں۔ وہ ہر جگہ نہیں جاتے۔ ہاں۔ ”

“بالکل ٹھیک۔ سمجھ لو ہند میں وہ ہمارے مائی باوا ہیں۔ ”

“سولہ آنے بات کی تو نے۔ ”

میں نے کہا۔ “بھئی ہال کے اندر صفائی وفائی کر لو۔ ” ایک بزرگ بولے۔

“چیزیں ٹھیک ٹھاک رکھ لو وہ آ رہے ہیں۔ ”

دوسرے صاحب بولے۔ “جناب اگر وہ دوپہر کے وقت آئیں تو بڑا اچھا رہے۔ ”

“کیوں ” کسی نے پوچھا۔ “دوپہر کے وقت کیوں۔ ”

“جو وہ دوپہر یا سہ پہر کے وقت آئیں تو انہیں ہال کے اندر بٹھانا۔ ذرا اس تنور کا

مزا چکھ لیں۔ “

”ہاں گرمی کے بھبھا کے اٹھیں گے تو انہیں پتہ تو چلے گا نا۔ “

”باہر بٹھانے میں کیا حرج ہے۔ “ ایک اور صاحب بولے ”ذرا انکھیوں کا سماں بھی دیکھ لیں گے۔ “

”اونہوں۔ ایسی باتیں ٹھیک نہیں “ چھوٹی داڑھی والا سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”بھئی وہ تو آپ سب سے ملاقات کرنے آئیں گے خود۔ “

”کیوں ٹھیک کیوں نہیں۔ بھائی صاحب ہمیں جو جو تکلیفیں ہیں یہاں انہیں نہ بتائیں تو کسے بتائیں۔ یہاں ہند میں ہمارا اور کون ہے۔ “

”بھئی تکلیفیں ہوتی ہی ہیں۔ “ ایک معمر زائر بولا ”ایسی بات ان سے کہنا مناسب نہیں۔ ایک اعلیٰ عہدہ دار اپنی مصروفیات کو چھوڑ کر خود آپ سے ملنے آئے اور آپ شکایات کا دفتر کھول بیٹھیں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ “

خود:

”بالکل ٹھیک کہتے ہیں یہ۔ “ ایک بزرگ زائر بولے۔

”ہاں ہاں ان کی بڑی کرم نوازی ہے جو ہم سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں۔ “ ایک اور عمر رسیدہ صاحب بولے۔

”یار ان سے آگرہ جانے کی بات نہ کی جائے۔ “

”کیوں نہ کی جائے۔ “ ایک نوجوان نے کہا ”اگر وہ ہند سرکار سے بات کریں تو یوں ... “ اس نے چٹکی بجا کر کہا ”ہاں یوں اجازت مل جائے آگرہ جانے کی۔ “

”وہ کر رہے ہیں۔ وہ کر رہے ہیں۔ “ چھوٹی داڑھی والے نے کہا۔ ”وہ آپ کے لئے کچھ کر رہے ہیں۔ “

”پھر تو سمجھو آگرے کی بات بن جائے گی۔ “

”ہاں بھئی اگر وہ کر رہے ہیں تو پھر کیسے نہ بنے گی۔ ضرور بنے گی۔ “

”مشکل یہ ہے کہ چھوٹی داڑھی والے نے کہا“ کہ آپ کا آگرے جانے کا کاغذ اسلام آباد والوں نے بھیجا ہی نہیں ورنہ کوئی بات ہی نہ تھی ان کے لئے۔ “

"پتہ نہیں کیوں نہیں بھیجا۔ "

"کون پرواہ کرتا ہے جی کاغذ بھیجنے کی۔ "

"ہٹاؤ جی۔ " ایک بزرگ بولے۔ " آخر اتنے سارے انتظامات تو کیے ہیں نا۔ آگرے کی بات رہ گئی تو کیا ہوا۔ "

"ہاں جی۔ " ایک اور معمر صاحب بولے "یہ کیا کم ہے کہ وہ ہم سے ملنے آرہے ہیں۔ خود۔ "

"ہاں ہاں بالکل۔ بڑی بات ہے جی۔ "

چھوٹی داڑھی والے نے ان کے آنے کی خبر کا پتھر ایسا مارا کہ سارا دن زائرین کے تالاب میں لہریں چلتی رہیں۔ ہر طرف ایک ہی سرگوشی چلتی رہی۔ وہ آرہے ہیں خود۔ میں نے دوڑ کر اندر اشفاق حسین کو بتایا۔ میں نے کہا۔ "سنا تم نے وہ آرہے ہیں خود۔ "

"کون آرہے ہیں۔ " اشفاق حسین نے پوچھا۔

"بھئی زائرین سے ملنے آرہے ہیں وہ۔ "

بڑی خوشی کی بات ہے "بولا" جم جم آئیں۔ پر ہم اپنا پروگرام نہیں بدل سکتے آج کا۔ "

"نہیں نہیں" ہمارا پڑوسی بولا " آج نہیں آرہے۔ "

"تو کب آئیں گے" اشفاق حسین نے پوچھا۔

بڑے لوگ

"وہ۔ " چھوٹی داڑھی والا کہہ رہا تھا۔ ابھی تو انہوں نے آنے کا ارادہ کیا ہے۔ ابھی پروگرام مرتب نہیں ہوا۔ " معمر صاحب بولے۔

"اچھا اچھا۔ " اشفاق حسین بولا۔ "بسم اللہ جب جی چاہے آئیں۔ "

ایک بزرگ جن کی چارپائی ہم سے کافی دور تھی وہیں سے چلا کر بولے۔

"ادھر آئیں یا نہ آئیں۔ ملاقات تو بہر حال ہوگی۔ "

"ملاقات بہر حال کیسے ہوگی؟ " پڑوسی بولا۔

"عرس کے روز بہر حال ہو گی۔ "

"میں سمجھا نہیں۔ " میں نے کہا۔

"بھائی صاحب عرس پر تو وہ بہر حال آئیں گے۔ "

"اونہوں ــــ " ان کے قریب بیٹھے ہوئے صاحب بولے۔ "عرس پر نہیں آیا کرتے۔ "

"یہ کیسے ہو سکتا ہے مسلمان کے تہواروں پر تو ضرور آتے ہوں گے۔ "

"میں ادھر کئی بار آیا ہوں عرس پر۔ اجمیر شریف بھی عرس پر حاضری دی ہے۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں کسی کو عرس پر آتے۔ "

"سنا ہے۔ " پڑوسی نے کہا "حضرت امیر خسروؒ کے عرس پر ہند سرکار اپنا ایک وزیر ضرور بھیجتی ہے۔ "

"اچھا۔ بڑی اچھی بات ہے۔ "

"او جی بہت سے ہندو اور سکھ عرس پر آتے ہیں۔ "

"ہاں جی عقیدت کی بات ہے۔ "

"اس روز بھی تو ہندوؤں کا ایک ٹولہ کھڑتالیں بجاتا ہوا آیا تھا۔ حضرت نظام الدین کے مزار پر۔ "

"کیوں نہ آئیں ان کے در پر۔ " معمر صاحب بولے۔ نظام الدین اپنے زمانے میں عوام سے بڑے تپاک سے ملتے تھے۔ چاہے کوئی بھی ہو۔ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ لیکن بادشاہ ملنے کی درخواست کرتے تو ٹال دیتے تھے۔ بڑے آدمیوں سے ملنے سے گریز کرتے تھے۔ بلکہ کہلوا بھیجتے تھے کہ آپ اس دروازے سے داخل ہوں گے تو ہم اس دروازے سے باہر نکل جائیں گے۔ "

"بالکل بالکل۔ " بزرگ صاحب بولے "شاید اب بھی وہ بڑے آدمیوں کو مزار پر آنے نہ دیتے ہوں۔ "

"پھر تو مشکل ہے۔ " نوجوان بولا۔

"کیا مشکل ہے۔ "

"پھر تو شاید وہ نہ آسکیں۔ خود۔ "

“کیوں نہ آ سکیں۔ ”

“ آپ خود ہی فرما رہے ہیں کہ بڑے آدمیوں کو حضرت نظام الدینؒ آنے نہیں دیتے۔ ”

“ میں نے تو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ وہ عرس پر نہیں آتے۔ اس کے باوجود وہ یہاں آ رہے ہیں. زائرین کو ملنے۔ ”

اس پر واہ واہ کا شور مچ گیا۔

اگلے روز جب میں ہوٹل کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں مجھے چھوٹی داڑھی والا نوجوان مل گیا۔ بڑے تپاک سے مجھے ملا۔

میں نے کہا۔ “جناب آپ کہہ رہے تھے کہ وہ آ رہے ہیں۔ ”

“ہاں ہاں” وہ بولا “یقیناً آ رہے ہیں لیکن ــــــ ”

“کب آ رہے ہیں۔ ” میں نے پوچھا۔

“ان کی خواہش تو ہے کہ وہ زائرین سے آ کر ملیں ـــ لیکن ـــ ”

“لیکن کیا۔ ” میں نے پوچھا۔

“بڑی مصروفیت ہوتی ہے انہیں۔ بالکل وقت نہیں ملتا۔ ”

“ہاں یہ تو ہے۔ مصروفیت تو ہوتی ہی ہے۔ ” میں نے کہا۔

“دیکھو۔ ” وہ بولا “اگر وہ خود نہ آ سکے تو شاید شیخ صاحب کو بھیج دیں۔ ”

“ “وہ کون ہیں شیخ صاحب۔ ” میں نے پوچھا۔

“وہ ہمارے کلچرل اتاشی ہیں آپ نہیں جانتے انہیں۔ ”

“نہیں بھئی میں بڑے آدمیوں کو کیسے جانوں گا بھلا۔ ”

“وہ زائرین میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہاں۔ ”

“پھر تو عرس پر تشریف لائیں گے۔ ”

“عرس میں تو خیر نہیں آ سکیں گے۔ ”

“عرس بھی تو کلچرل ہوتا ہے۔ ”

“ہاں ہوتا ہے لیکن وہ ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ ”

”کلچرل اٹیچی جو ہوئے۔ “ میں نے کہا۔

”نہیں نہیں۔ “ وہ بولا ” آپ کو نہیں پتہ وہ بہت بڑے ادیب اور فن شناس ہیں۔ “

”اچھا__ “ میں نے کہا۔

”ہاں__ “ وہ بولا۔ ”یہاں بڑے کلچرل وفد آتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی دو شاعر آئے ہوئے ہیں۔ “ اس لئے وہ بہت مصروف ہیں۔ بالکل فرصت نہیں۔ “

فرض اور سبکدوشی

دو ایک دن کے بعد سویرے ہی ہال میں شور مچ گیا۔ چلو بھئی چلو۔ جلدی کرو۔

”کیوں کیا ہوا۔ “

”اپنا اپنا حصہ لے لو بھئی۔ “

”حصہ۔ کیسا حصہ۔ “

”وہی۔ ہندی روپے میں رقم۔ “

”اچھا تو چوگا مل رہا ہے۔ “

”ہاں لیڈر صاحب کا کہنا ہے ہمیں اس فرض سے جلد سبکدوش کر دیا جائے۔ “

خود ہی سبکدوش نہیں ہونا چاہتے ورنہ ساری رقم ایک ہی دفعہ ہاتھ میں تھما دیں۔ “ نوجوان بولا۔

”ہاں یار۔ یہ قسطوں میں کیوں دیتے ہیں۔ رقم تو ہماری اپنی ہے۔ “

”ایک ہی مرتبہ کیسے دے دیں۔ بھئی وہ ڈرتے ہیں کہ ہم ایکدم ساری خرچ نہ کر دیں۔ “

اس پر سارے ہال میں قہقہہ گونجا۔

”یہ کیا آخری قسط ہے۔ “ ایک نے پوچھا۔

”اونہوں۔ “ ایک زائر جو رقم وصول کر کے آ رہا تھا. بولا ”صرف سو روپے دے

رہے ہیں۔"

"کل ڈھائی سو واجب الادا ہے۔" معمر صاحب نے کہا۔

"دوسرا سو تو آج مل رہا ہے نا۔"

"اور باقی پچاس کیا لاہور میں جا کر دیں گے۔" نوجوان بولا۔

"نمبر چالیس۔" باہر سے آواز آئی۔ پھر ایک صاحب داخل ہو کر بولے۔

"کیوں بھئی کوئی ہے نمبر چالیس۔ حاضر ہو جائے ادھر لیڈران کے کمرے میں۔"

یہ سن کر میں چونکا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نمبر چالیس ہوں۔

لیڈران کرام کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ سب آرام سے اپنی اپنی چارپائی پر دراز ہیں۔ اور خازن ایک کرسی میں بیٹھا یوں روپے بانٹ رہا ہے جیسے اپنے پلے سے دان کر رہا ہو۔

"آپ کے مزاج اچھے ہیں۔" لیڈر صاحب نے مجھے دیکھ کر نہایت اخلاق سے کہا۔

"جی آپ کی بڑی نوازش ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں۔"

"نہیں جناب۔ تکلیف کیسی۔"

"کوئی تکلیف ہو تو آپ ہم سے کہیں۔" انہوں نے بڑے پیار اور دریا دلی سے کہا۔

"یقیناً جناب یقیناً۔" میں نے یوں جواب دیا جیسے ترکی حمام کی بجائے میں شاہی باغ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور کیکر کی چھاؤں میں بیٹھ کر مکھیاں اڑانا میرا موروثی شغل تھا۔

آ گئے آ گئے

عین اس وقت چھوٹی داڑھی والا داخل ہوا "وہ آ رہے ہیں۔ وہ آ رہے ہیں۔" وہ یوں انبساط بھری سرگوشی میں بولا جیسے حضرت امیر خسروؒ بنفس نفیس تشریف فرما ہو رہے ہوں۔ —— "اونہوں۔" وہ بولا "خود نہیں۔ فسٹ سیکرٹری صاحب کو بھیجا ہے۔"

لیڈران کرام لپک کر اٹھ بیٹھے۔ ایک ساعت میں جبہ و دستار اپنے اپنے مقام پر قائم ہو گئے اور لیڈر صاحب کے چہرے پر ایک روغنی تبسم پھیل گیا۔ وہ سب دروازے کی طرف دوڑے۔

دروازے سے باہر ایک اونچا لمبا شخص کھڑا تھا۔ کھلا کھلا رنگ. متناسب خدو خال. چہرے پر ذہانت اور کلچر کے واضح نشان۔ بدن متناسب. شلوار اور قمیص میں ملبوس۔ انداز میں ٹھہراؤ. چہرے پر سکون. وقار. احساس برتری۔

باری باری انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا جب میری باری آئی تو میرے ہاتھ میں ایک ٹھنڈا بے جان ہاتھ تھا۔ جیسے وہ اسکیمولینڈ سے خاص طور پر میرے لئے امپورٹ کیا گیا ہو۔

زائرین جذبہ شوق اور مسرت سے چھلک رہے تھے۔ آ گئے آ گئے آ گئے۔

وہ ہر ایک سے باری باری پوچھ رہے تھے ”مزاج اچھے ہیں۔“ یہ سوال متکلم کم تھا اور اشاراتی زیادہ۔ انہوں نے کسی سے نہ پوچھا. کوئی تکلیف تو نہیں۔ پوچھ لیتے تو بھڑوں کا چھتہ چھڑ جاتا۔

بہر حال معزز مہمان کو دیکھ کر ہم اس قدر متاثر ہوئے کہ نہ گرمی یاد رہی نہ مکھیوں کی چراپونجی۔

جب وہ رخصت ہوئے تو تمام زائرین نے مودبانہ خدا حافظ کہا۔

معمر صاحب بولے ”الحمد للہ کہ زیارت ہو گئی۔“

بے شک بے شک کی آوازیں گونجیں۔

”سفارت کے سوا یہاں ہمارا ہے ہی کون۔“

ونڈر فل جاب

بڑی طاقت نے سوچ بچار کر کے حالات کو قابو میں لانے کے لئے فیصلہ کیا کہ صدر ایوب کو راہ راست پر لانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے مشیر کو الگ کر دیا جائے۔ انہوں نے صدر کو صاف صاف کہہ دیا کہ قدرت اللہ شہاب کو شعبہ اطلاعات سے الگ کر دیا جائے۔

صدر ایوب نے سوچا کہ اتنی سی بات سے بڑی طاقتوں کی خشنودی حاصل ہوتی ہے تو کیا حرج ہے۔

صدر نے قدرت کو بلا کر پوچھا۔ آپ کون سا محکمہ لینا پسند کریں گے۔
قدرت اللہ بھانپ گئے۔ بولے۔ ”میں ریٹائر ہونا پسند کروں گا۔“
صدر کو یہ بات گوارہ نہ تھی۔
دیر تک مذاکرات جاری رہے۔
نتیجہ یہ نکلا کہ قدرت اللہ شہاب کو ہالینڈ کا سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔
ایک سال کے بعد قدرت چھٹی پر آئے تو میں نے ان سے پوچھا۔ ”یہ نوکری کیسی رہی۔“

بولے۔ ”ونڈر فل جاب۔“
”پھر بھی کتنی ونڈر فل۔“
بولے۔ ”ایسی ونڈر فل جاب مجھے آج تک نہیں ملی تھی۔“
میں نے پوچھا۔ ”اس نوکری میں کیا خوبی ہے۔“
بولے۔ ”خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”مثلاً۔“
بولے۔ ”مثلاً بولنا نہیں پڑتا۔“
”اور“
”مانا ملانا نہیں پڑتا۔“
”اور“
”لکھنا نہیں پڑتا۔“
میں نے کہا۔ ”کچھ تو کرنا پڑتا ہو گا۔“

بولے۔ ”چار ایک کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک یہ کہ ڈپلومیٹک فنکشن کے لئے ڈریس اپ کرنا پڑتا ہے۔ پھر حاضری دینی پڑتی ہے۔ سر جھکانا پڑتا ہے اور مسلسل مسکرانا پڑتا ہے۔“
”اور دفتر میں کیا کرنا پڑتا ہے۔“

”سنجیدگی سے سر اٹھا کر دیکھنا اور سر ہلانا۔ “

”اور۔ “ میں نے پوچھا۔

”جتنا کم بولو اتنے کامیاب۔ جتنے کم ملو اتنے باعزت۔ ذرا مشکل کام ہے۔ “

”کیا۔ “ میں نے پوچھا۔

”کم بولنا مشکل کام ہے لیکن مجھے سوٹ کرتا ہے۔ “

” آپ تو کہتے تھے بڑی اچھی نوکری ہے۔ “

”ہے۔ “ وہ بولے ”ونڈر فل جاب۔ جو عبادت کرنا چاہے اس کے لئے بہت موزوں ہے۔ جو تصنیف کرنا چاہے اس کے لئے بہت عمدہ ہے۔ جو مطالعہ کرنا چاہے اس کے لئے بہت اچھی۔ “

”میں نے سنا ہے وہاں ذات پات بہت ہوتی ہے۔ “

قدرت مسکرائے۔ ”اس کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ “

قدرت کی بات یاد آئی تو میں نے معزز مہمان کا از سر نو جائزہ لیا۔ وہ جاذب نظر صورت. مہذب خدوخال. برتاؤ میں ٹھہراؤ. سکون. خاموشی. ہلکی سی مسکراہٹ اور پر وقار انداز ـــــ میری ساری شکایات دور ہو گئیں۔ بے شک انہیں ایسا ہی ہونا چاہے تھا جیسے وہ تھے۔

جب وہ چلے گئے تو لیڈر صاحب نے سب زائرین کو اکٹھا کیا۔ بولے ” آپ سب کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ کل ہم دلی کی زیارتیں کریں گے۔ آپ سب صبح دس بجے تیار ہو رہیں۔ ہم نے بسوں کا انتظام کر لیا ہے۔ دس بجے دونوں بسیں یہاں پہنچ جائیں گی۔ سیکوریٹی نے ہمیں اجازت دے دی ہے۔ بہر حال وہ لوگ جو ہمارے ساتھ زیارتوں پر جانا چاہیں کوئی ذاتی پروگرام نہ بنائیں۔

اگلے روز صبح دس بجے دونوں بسیں سکاؤٹ کیمپ کے احاطے میں آ کھڑی ہو گئیں۔ زائرین بسوں میں سوار ہو گئے اور ہمارا قافلہ چل پڑا۔

دم پخت

ابھی ہم سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ لیڈر نے بسوں کو رکنے کا حکم دیا۔ بسیں رک

گئیں۔ لیڈر صاحب باہر نکلے اور سکاؤٹ کیمپ سے ملحقہ عمارت میں داخل ہو گئے۔

اس روز شدید گرمی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔

بس کھڑی ہو گئی تو ساری سواریاں گویا دم پخت ہو گئیں۔ پھر گرمی نے رنگ دکھایا۔ مزاجوں میں تلخی پیدا ہو گئی۔ کسی نے دل ٹھنڈا کرنے کے لئے پھر سے آگرے کا ذکر چھیڑ دیا۔ بولا۔ “افسوس کی بات ہے ہم آگرے سے محروم رہے۔ ”

نوجوان زائر بولا۔ ہم محروم ہونے والے نہیں۔ ہم تو آگرہ دیکھ بھی آئے۔

“ارے — ” سب حیرت سے بولے “وہ کیسے۔ ”

نوجوان نے مونچھ مروڑ کر کہا۔ “ہمیں کون روک سکتا ہے جی۔ بھلا کوئی بات ہے کہ دلی آؤ اور آگرہ نہ دیکھو۔ ”

“لیکن کیسے دیکھا — ” دو ایک نے پوچھا۔

“سوتے میں دیکھا ہو گا۔ ” ایک معمر صاحب بولے۔

“سوتے میں نہیں جناب جاگتے میں دیکھا۔ ”

“لیکن گئے کیسے۔ ”

“بس میں بیٹھے ٹکٹ خریدا اور آگرہ جا پہنچے۔ ”

“اور جو پکڑے جاتے تو۔ ”

“پکڑے جاتے تو پلس والے ادھر کیمپ میں لے آتے اور کیا۔ ”

“کیسا رہا آگرہ۔ ” معمر صاحب نے پوچھا۔

“واہ کیا چیز بنائی ہے مغلوں نے۔ ”

“بہت بڑے معمار تھے۔ کیا کہنا ہے۔ ”

“ادھر دلی ہی میں دیکھ لو۔ چپے چپے پر مسلمانوں کی یادگاریں ہیں۔ ”

“انہیں دیکھ کر دلی والوں کو مسلمانوں کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا کیا۔ ”

“ہوتا ہے ہوتا ہے۔ ان یادگاروں کو دیکھ کر انہیں غصہ آتا ہے۔ کہتے ہیں ان کا نام و نشان مٹا دو۔ ”

اس پر بس میں قہقہہ گونجا۔

“بھئی وہ لیڈر صاحب کیا ہوئے ”

"ابھی آتے ہیں۔ "

"جب تک اپنا تو شیرہ چو جائے گا۔ "

"ہاں بھئی دیکھو تو سہی کیا کر رہے ہیں لیڈر۔ "

"میں بتاؤں۔ " بس سے باہر کھڑے زائر نے کہا۔ "اندر ٹیلی فون کر رہے ہیں۔ "

"ٹیلیفون کر رہے ہیں یا پائے پکار رہے ہیں۔ "

"برا حال ہو رہا ہے یار۔ اپنا تو۔ "

"انہیں احساس بھی ہو کہ بتیس آدمی ادھر گرمی میں ابل رہے ہیں۔ "

"کبھی لیڈر کو بھی دوسروں کا احساس ہوا ہے۔ "

"ساتھیوں کا احساس ہو تو پھر وہ لیڈر کیسا۔ "

"میں ولاؤں گا احساس" نوجوان بولا۔

"تم کیسے دلاؤ گے میاں" بزرگ بولے" ساری قوم گذشتہ اتنے برس سے نہ دلا سکی۔

"دینا یار ذرا آواز۔ "

اس پر سبھی باری باری چلانے لگے۔ "لیڈر صاحب آ جایئے اب۔ "

"بہت ہوئی جناب۔ "

"اپنا تو کباڑہ ہو گیا۔ دم پخت ہو گئے۔ "

آوازیں سن کر لیڈر صاحب باہر نکلے۔ بولے "مجھے افسوس ہے کہ .. "

"ہونا چاہئے ضرور ہونا چاہئے۔ "

"دراصل کنکشن نہیں مل رہا تھا۔ "

"ادھر ہم سب ڈسکنکٹ ہوئے بیٹھے ہیں۔ "

"لیڈر صاحب نے فضا کا رنگ دیکھا تو چپ ہو گئے اور آ کر بس کے اندر بیٹھ گئے۔

زائر چلائے "چلو بھئی چلو۔ اپنا تو مربہ بن گیا۔ "

ڈرائیوروں نے بسیں سٹارٹ کیں اور قافلہ پھر سے روانہ ہو گیا۔

سمجھے بے سمجھے:

اس وقت تقریباً گیارہ بجے تھے۔ سڑکوں پر کوئی رش نہ تھا نئی دلی کی دکانوں پر بھی بھیڑ نہ تھی۔ پیومنٹ پر بھی اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے۔ پھر صرف بس شاپوں پر کچھ لوگ کھڑے نظر آتے تھے۔

“یار یہ ویرانی سی کیوں ہے ادھر۔ ” ایک نے پوچھا۔

دوسرا بولا “شام کو رونق ہوتی ہے۔ ”

“شام کو—” اشفاق حسین نے دہرایا۔ “ہم نے تو نہیں دیکھی۔ ”

“پتہ نہیں کیا بات ہے۔ ” معمر صاحب بولے “بھیڑ ہے پر گہما گہمی نہیں۔ لوگ ہیں پر رونق نہیں۔ موٹریں ہیں پر سڑک اونگھ رہی ہے۔ ”

“بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ”

اس پر بس میں خاموشی طاری ہو گئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک صاحب بولے۔ “ہم جا کہاں رہے ہیں؟”

“زیارتیں کرنے۔ ”

“وہ تو ہے پر اس وقت کون سی زیارت پر جا رہے ہیں۔ ”

“کیا پتہ۔ لیڈر صاحب سے پوچھو۔ ”

لیڈر بولے “جناب پہلے ہم حضرت قطب صاحب کے مزار اقدس پر حاضری دیں گے۔ پھر قطب مینار دیکھیں گے اس کے بعد شاہ چراغ دہلوی کے مزار پر حاضری دیں گے پھر حضرت باقی باللہ اور آخر میں جناب محدث دہلوی صاحب۔ اس کے بعد جامع مسجد پہنچ کر جو زائر واپس آنا چاہیں آ جائیں۔ جو وہیں رکنا چاہے رک جائیں۔ ”

حضرت قطب صاحب کے مزار پر پہنچے تو اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری بولا۔ “یار بڑا اچھا ہوا کہ یہاں آ گئے میرا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر حاضری دوں۔ ”

“اچھا—” میں نے طنزاً کہا۔ تو تو بزرگوں کو مانتا ہی نہیں۔ ”

“دراصل—” وہ بولا “مجھے بزرگوں کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ ”

“مجھے بھی تو سمجھ میں نہیں آتیں۔ ”

“پھر تو ایک ہی بات ہے۔ ” وہ بولا۔

“ایک بات نہیں بڑا فرق ہے۔ ”

“کیا— ” اس نے پوچھا۔

“تو سمجھ کر مانتا ہے، میں بن سمجھے مانتا ہوں۔ یہ بزرگ لوگ اتنے بڑے ہیں اتنے بڑے ہیں کہ میری چھوٹی سی سمجھ میں نہیں آتے۔ نہیں آسکتے۔ ”

“یہ بھی ٹھیک ہے۔ ” وہ بولا۔

“آج کی دنیا اپنی سمجھ کو بہت بڑا سمجھتی ہے۔ اتنا بڑا کہ جو چیز اس میں فٹ نہ ہو اسے نہیں مانتی۔ ”

اشفاق حسین خاموش ہو گیا۔

ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

بادشاہ بغیر دربار

دفعتاً وہ بولا “اس مزار شریف کی بات الگ ہے۔ ”

“وہ کیسے۔ ”

“میرا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر آؤں۔ ”

“اچھا— لیکن وجہ۔ ”

“پتہ نہیں” وہ بولا “یہاں آکر مجھے اک ان جانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ”

“اچھا۔ ”

“ہاں۔ ” وہ بولا “یہاں اک لطافت ہے۔ گھٹن نہیں۔ وسعت ہے پابندی نہیں آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ بالکل ویسے جیسے داتا کے دربار میں ہوتا ہے۔ ”

“اچھا۔ ” میں نے بات ختم کرنے کے لئے کہا۔

“تم نے کبھی سوچا ہے” وہ بولا۔

“کیا۔ ؟”

“کہ ہم اسے دربار کہتے ہیں۔ لیکن وہ دربار نہیں لگتا۔ ”

“کیوں۔ ”

"دربار وہ ہوتا ہے جہاں ایک بادشاہ ہو۔ "

"بادشاہ تو ہیں وہ۔ " میں نے جواب دیا۔

"بے شک ہوں گے۔ " وہ بولا۔ "لیکن وہاں وہ آکر درباریوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یوں جیسے ہم میں سے ہوں۔ الگ نہیں بیٹھتے۔ "

"درویش کی یہی پہچان ہے کہ وہ ہوتے بادشاہ ہیں مگر الگ نہیں۔ بندوں کی صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ "

"بالکل۔ " وہ بولا "اس لحاظ سے قطب صاحب بہت بڑے درویش ہیں۔ بہت بڑے۔ "

ہمارے سامنے حضرت قطب الدین کے مزار کا صدر دروازہ تھا۔ وہی جوتے سنبھالنے والا۔ وہی لمبی گلی۔ وہی بے رنگے بھکاری۔

گلی میں چلتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ اس روز تو شاہ بابا کا پیغام لایا تھا۔ اس حوالے نے میری ایک حیثیت پیدا کر دی تھی اس روز تو مور کے پر لگا کر آیا تھا آج تو کالا کوا ہوں۔ کیسے حضرت کے سامنے جا کھڑا ہوں گا۔ کیا کہوں گا۔

پھر خیال آیا چاہے کچھ بھی ہوں۔ کیوں نہ اپنا سلام پیش کروں۔

مجھے یاد آیا کہ بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر پہلے درود شریف پڑھتے ہیں تاکہ حضرت متوجہ ہوں پھر سلام عرض کرتے ہیں۔

مزار مبارک پر وہی روشنی تھی۔ وہی لطافت۔ وہی وسعت۔ میں ایک کونے میں مودبانہ کھڑا ہو گیا اور درود شریف پڑھنے لگا۔

مجھے ایک ہی درود شریف یاد ہے جسے پڑھنے میں مجھے لذت حاصل ہوتی ہے۔ درود تاج میں نے درود تاج پڑھنا شروع کر دیا۔

مین اس وقت جب میں اپنا سلام حضرت کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا دفعتاً مزار مبارک میں شور و غل کا ایک دہارا اچھلنے لگا۔

لیڈر صاحب کی متکلم دعا جاری ہو چکی تھی۔ میری عجز بھری معدومیت کی پھپھوندیاں اڑ گئیں۔

قطب مینار

ہماری دوسری زیارت قطب صاحب کی لاٹ تھی۔ قطب کی لاٹ کو میں نے اس زمانے میں دیکھا تھا جب میں مڈل میں پڑھا کرتا تھا۔ اندازاً میں اسے ساٹھ پینسٹھ سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ لیکن جونہی میں نے اس پر نگاہ ڈالی تو محسوس ہوا جیسے میں اس سے بے حد مانوس تھا۔ جیسے میں روز ہی اسے دیکھتا تھا۔

اتنی مانوسیت میں نے کبھی کسی جگہ کے لئے محسوس نہ کی تھی۔ پتہ نہیں اس لاٹ کا کیا اعجاز ہے کہ وہ آپ کو یوں اپنا لیتی ہے کہ حیرت یا اچنبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کا ایک ایک پتھر مانوس تھا۔ دیواروں کا ایک ایک زاویہ مانوس تھا۔ دیواروں پر کندہ ایک ایک لفظ مانوس تھا۔ شاید اس لئے کہ زندگی میں ہم نے اس لاٹ کی تصویریں بار بار دیکھی ہیں۔

میرا جی چاہتا تھا اس عظیم عمارت کے سامنے چوکڑی مار کر بیٹھ جاؤں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں گھر آ گیا تھا۔

وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ دروازے کے سامنے پائپ کا ایک جنگلا بنا ہوا تھا۔ میں اس جنگلے کے ایک پائپ پر بیٹھ گیا۔

اللہ کی شان ہے جس کی یہ لاٹ ہے. جسے دیکھنے پتہ نہیں کہاں کہاں سے لوگ آتے ہیں۔ وہ خود لاہور میں انار کلی کے پچھواڑے ایک گمنام مکان کے نیچے گمنامی میں پڑا سو رہا ہے۔ جہاں کوئی مقبرہ نہیں کوئی محراب نہیں نشاندہی کرنے والا کوئی پتھر نہیں۔

ازمندیاس

مجھے ازمندیاس کی نظم یاد آ گئی۔ کتنی عظیم نظم ہے۔ کتنا عظیم موضوع ہے۔

مجھے نظم پوری طرح تو یاد نہیں لیکن کچھ ایسا ہی مطلب ہے۔

”صحرا میں۔ پتھر کے تھڑے پر ایک بت ایستادہ ہے۔“ نیچے عبارت کندہ ہے۔

”میں ازمندیاس ہوں۔ دیکھو میرے ارد گرد دیکھو۔ یہ عالی شان عمارات پر شکوہ

محل عظیم، عالیشان ایوان یہ سب میں نے بنوائے ہیں۔ دیکھو میری عظمت کو دیکھو۔ میری ہیبت سے ڈرو۔ "

پتھر کے اس بت کے اردگرد جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ ریت ہی ریت پھیلی ہوئی ہے۔

تمام عظیم معمار بالآخر بت بن جاتے ہیں۔

صرف مسلم معمار مبرا ہیں۔ چونکہ ان کی تعمیرات کا رخ خود کی جانب نہیں ہوتا تھا۔

یہ پر ہیبت لاٹ یقیناً بت بن جاتی اور اس کا بنوانے والا ازمندیاس......... اگر اس پر آیات قرآنی نقش نہ ہوتیں۔

تاج محل میں کبھی یہ حسن پیدا نہ ہوتا اگر اسے بنوانے والے کا رخ محبوب کی جانب نہ ہوتا۔ ہر معمار جس کی تعمیر کا مقصد ذات ہو ازمندیاس بن جاتا ہے۔

بولو مہاراج

چند ایک غیر ملکی سیاح بڑے غور سے لاٹ کو دیکھ رہے تھے۔ اس پر شوکت محراب کو دیکھ رہے تھے جو لاٹ کے متصل کھڑی ہے۔ بھارت کے ٹورازم کے کارکنان سیاحوں کو لاٹ کی عظمت کے نکات سمجھا رہے تھے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ ان کارندوں سے جا کر پوچھوں۔

"مہاراج یہ آپ انہیں کیا دکھا رہے ہیں۔

انہیں اپنی دلی دکھایئے۔ بیگانی چیزیں دکھانے سے فائدہ۔

جن مسلمانوں نے آپ کے دیش کو اتنی عظیم تعمیرات بخشی تھیں جنہوں نے دلی کے چپے چپے کو سجایا تھا۔ جنہوں نے آپ کے دیش کو تن من دھن سب کچھ دیا تھا۔ ان مسلمانوں کو آپ نے کیا دیا۔ انہوں نے پناہ گاہ کے طور پر ایک ٹکڑا زمین مانگا تھا۔ آپ نے غصے میں آ کر خون کی ندیاں بہا دیں۔ لاشوں کے پشتے لگا دیئے۔ آج چونتیس سال ہو چکے ہیں آپ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ آپ کے سیکولر دیش میں فسادات کا تانتا نہیں ٹوٹا۔ "

"ذرا ان سیاحوں سے پوچھئے تو . کیا یہ آپ کی دلی دیکھ رہے ہیں یا مسلمان

بادشاہوں کی۔ بولو مہاراج۔ "

سیلاب میں سوکھا

صرف قطب مینار ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں میرے خیالات میں کوئی مخل نہ ہوا۔ باقی تمام زیارتیں حضرت باقی باللہ. حضرت شاہ چراغ حضرت محدث دہلوی سب متکلم دعا کے سیلاب میں بہہ گئیں اور میں سوکھا کا سوکھا رہ گیا۔

یہ سب میری ذات کا قصور ہے۔

میری ذات میں ایک بت ہے۔

میری عقیدت ابھرنے کے لئے تخلیہ مانگتی ہے۔

میرے سجدے شور و شغب کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

میری سرشاری عام دربار میں رنگ نہیں لاتی۔

میری مانگ آواز کی محتاج نہیں۔

میری لگن اپنے اظہار کے لئے اشارے ڈھونڈتی ہے۔ وضاحت کی متحمل نہیں ہوتی۔

میری دعا ایک منت ہے۔ ایک ترلا ہے۔ ایک بینتی ہے۔ بے آواز ۔ بے الفاظ۔

میری معراج سپردگی ہے. حوالگی ہے. معدومیت ہے۔

فرمائشیں

شام کا وقت تھا۔ ترکی حمام ابھی تک اپنی بھڑاس نکالنے میں شدت سے مصروف تھا۔ اندر بیٹھنا مشکل تھا۔ زائرین باہر گھاس پر چارپائیاں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ مکھیاں سورج کی آخر کرن کے ساتھ جا چکی تھی۔ باہر گھاس پر بیٹھنے کا یہ بہترین وقت تھا۔

سورج ڈوب رہا تھا، ہوا بند تھی. پھر بھی ہلکی ہلکی خنکی بوند بوند گر رہی تھی۔ اشفاق حسین اور میں دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ہم سے چند گزوں کے فاصلے پر زائرین کی محفل جمی ہوئی تھی۔ باآواز باتوں کا تار بندھا ہوا تھا جس میں قہقہے تیر رہے تھے۔

جھونگا

اشفاق حسین نے آہ بھری۔ ”یار بات نہ بنی۔ “

”کیوں۔ “ میں نے پوچھا۔

”کسی کی فرمائش پوری نہ کر سکے۔ “

”کسی کی بات چھوڑ اپنی تو پوری ہو گئی نا۔ “

”کیا مطلب؟ “ اس نے پوچھا۔

”بھئی ہومیوپیتھی کی کتابیں لینے آئے تھے سو مل گئیں۔ بلکہ ساتھ جھونگا بھی مل گیا۔ “

”جھونگا ..... کون سا جھونگا؟ “ اس نے پوچھا۔

"کتابوں کے ساتھ ساتھ اوشا مل گئی۔ "

"اشفاق حسین ہنسا۔ تم اسے جھونگا کہتے ہو۔ "

"اور کیا کہوں۔ "

"نہیں یار۔ " وہ بولا۔ اس کے ساتھ انصاف کرو۔ "

"اونہوں۔ " میں نے جواب دیا۔ عورت کے ساتھ مرد کبھی انصاف نہیں کر سکتا۔ فرشتے آکر کر لیں تو کر لیں۔ "

"نہیں یار۔ " وہ بولا۔ "یہ غلط بیانی ہے۔ اوشا کی حیثیت اونچی ہے۔ "

"جتنی اونچی چاہو اتنی اونچی کر دیتا ہوں۔ محبوبہ کی کر دوں۔ "

"نہیں یار۔ " وہ مسکرایا "ایسی کوئی بات نہیں۔ "

"اچھا تو ناری کی حیثیت ٹھیک رہے گی کیا۔ "

"نان سنس۔ " وہ چلایا۔ یقین جانو میں نے اسے مرد کی حیثیت سے نہیں دیکھا صرف فرد کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے آپ ملتے ہیں۔ کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ کوئی آرزو نہیں ہوتی لیکن وہ ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسا کہ سالہا سال زائل نہیں ہوتا۔ اوشا وہ اثر ہے۔ "

لکی ڈیول

"بے شک۔ " میں نے کہا۔ "بہرصورت۔ ہمیں کتابیں مل گئیں۔ ساتھ مفت میں ایک خوشگوار اثر مل گیا۔ تیری ستار کی تاریں مل گئیں۔ پھر تو کیوں آہیں بھر رہا ہے کہ بات نہیں بنی۔ "

"میں اپنی بات نہیں کر رہا۔ میں تو ہند کو لوٹ کر لئے جا رہا ہوں۔ "

"کامیاب لٹیروں کو کبھی آہیں بھرتے دیکھا ہے تو نے۔ " میں نے پوچھا۔

"بھئی میں اپنی نہیں دوسروں کی بات کر رہا ہوں۔ "

"کیا ہے دوسروں کی بات۔ "

"نہ بیجی سار کی فرمائش پوری ہوئی نہ راگ ودیا کی ... کتنے افسوس کی بات

ہے۔۔۔”

“چھوڑ یار دوسروں کو” میں نے کہا۔

“تو بڑا خود غرض ہے مفتی۔” وہ بولا۔

“ہوں۔” میں نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔

“بری بات ہے۔” وہ بولا

“بالکل نہیں۔” دیکھ جو اپنا نہیں بنتا وہ دوسروں کا کیا بنے گا۔”

“معقول بات۔ کتابی بات۔”

“بھئی ہم نے کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہے کہ نہیں۔”

“یہ تو ہے۔”

“تجھ میں ایک عیب ہے۔” میں نے کہا۔

“کیا۔” وہ بولا۔

“تم سو فی صد تدبیریے ہو۔”

“کیا مطلب۔”

“تدبیریے ہر بات اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ بھائی میرے کچھ باتیں اللہ کے ذمے ڈالنا بھی سیکھو نا۔”

“میں نہیں سمجھا۔” وہ بولا۔

“میرا ایک بزرگ دوست ہے۔ وہ تین مرتبہ تدبیر کرتا ہے۔ تن من دھن سے کوشش کرتا ہے۔ پھر بھی کام نہ ہو تو وہ اس کام کو اللہ کے در پر رکھ دیتا ہے۔ کہتا ہے۔ مجھ سے تو یہ کام نہیں ہوا۔ اب میں اسے تیرے در پر رکھ رہا ہوں۔ چاہے تو کر دے نہیں تو نہ سہی تیری مرضی۔ تو مالک ہے۔”

اشفاق حسین قہقہہ مار کہ ہنسا۔ بولا “یار تو تو ایک لکی ڈیول ہے جو تجھے ایسے دوست ملتے ہیں۔ مجھے تو کبھی ایسا دوست نہیں ملا۔”

“ہاں ہوں۔ لکی ڈیول ہوں۔” “میں نے کہا” دیکھ اشفاق حسین۔ ہم نے جتنی کوشش ممکن تھی کر دیکھی۔ اب تو ان کاموں کو اللہ کے در پر رکھ دے۔ اسے منظور ہوا تو ہو جائیں گے۔ نہیں تو نہ سہی۔ خود کو دکھی نہ بنا۔ یہ کام نہ کر سکے تو چلو کوئی اور کام

کرلیں۔ ”

ان کہی

“اور کام۔ ” وہ بولا۔ “اور کون سا کام۔ ”

“ایک اور فرمائش جو ہے اسے پورا کرلیں۔ ”

“اور فرمائش تو کسی نے کی ہی نہیں۔ کون سی فرمائش کی بات کر رہے ہو؟ ”

“ہے ایک فرمائش۔ ”

“میں کہتا ہوں اور فرمائش کسی نے کی ہی نہیں۔ ” وہ چڑ گیا۔

“وہ ایک ان کہی فرمائش ہے۔ ”

“بھئی یہ جو گھر والی ہوتی ہے نا۔ اول تو وہ فرمائش کئے بغیر رہتی نہیں۔ اور اگر منہ سے نہ کرے تو دل ہی دل میں کہتی ہے۔ دیکھوں یہ میرے لئے کیا لاتا ہے۔ ”

اشفاق حسین قہقہہ مار کہ ہنسا۔ کہنے لگا “یار میری گھر والی نے تو فرمائش کی تھی نور جہانی فرمائش۔ ”

“وہ تجھے یاد کیوں نہ رہی۔ ”

لاحول ولا۔ ” وہ بولا۔ “وہ فرمائش یاد رکھنے والی ہوتی تو یاد رکھتا نا۔ ”

“کیا تھی وہ نور جہانی فرمائش۔ ”

وہ پھر قہقہہ مار کر بولا “کشمیری چادر مانگتی تھی۔ خالص کشمیری کڑھائی سے بھرپور ۔ ہزار ڈیڑھ ہزار سے کم کی نہیں اور اسے علم تھا کہ میرے پاس کل آٹھ سو روپے ہیں۔ ”

“ہنستا کیوں ہے۔ ” میں نے اسے ڈانٹا۔ “یہ گھر والیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ انہیں خوش کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ ”

“وہ تو کسی صورت خوش ہوتی ہی نہیں۔ ” اشفاق حسین نے جواب دیا۔

“ہوتی ہیں ہوتی ہیں۔ ”

“کیسے۔ ” اس نے پوچھا۔

“منہ زبانی باتوں کے جال بنو۔ بنتے جاؤ۔ خواب دکھاؤ جاگتے کے خواب۔

جذباتی باتوں کے ہار پرو کر گلے میں ڈالو۔ ڈالتے جاؤ۔ ڈالتے رہو۔ "

"مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب کچھ۔ " وہ بولا۔

"ہوتا مجھ سے بھی نہیں۔ " میں نے کہا۔

"پھر" وہ ہنسا۔

"پھر یہ کہ شال لے جاؤ۔ کہو "مہلوانی یہ تیرے لائق تو نہیں۔ "

"لیکن ہزار روپیہ کہاں سے لاؤں۔ " اس نے پوچھا۔

"سو دو سو کی خرید لو۔ اس کی پرائس ٹکٹ پر ۲۰۰ کو ۵۰۰ میں بدل دو۔ " وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

"ہنسو نہیں۔ اتنی سی بات سے گھر جنت بن جائے گا۔ "

"صرف ایک ہفتے کے لئے" وہ بولا۔

"پھر بھی مہنگا سواد نہیں۔ ایک ہفتے کی جنت صرف دو سو روپے میں۔ دیکھ میری جان! اس پلیسے کو رشوت دیتے رہو دیتے رہو۔ "

"پلیسہ - " وہ گھبرا گیا۔ " پلیسہ کون؟"

"گھر والی کی بات کر رہا ہوں۔ "

اشفاق حسین اتنے زور سے ہنسا کہ زائرین گھبرا گئے۔ وہ حیران تھے کہ یہ دو شخص جو الگ تھلگ بیٹھے کھیاں اڑاتے رہتے ہیں ان کو کیا ہوا جو کھڑ کھڑ ہنسنے لگے۔

بن کہے

معمر زائر ہمارے پاس چل کر آ گیا۔ بولا "خیر تو ہے۔ "

میں نے کہا۔ "جناب خیر کہاں۔ "

"کیوں کیا ہوا۔ " اس نے پوچھا۔

"جناب اس بات پر ہنس رہے ہیں کہ گھر واپس جائیں گے تو پٹائی ہو گی۔ "

"کیوں۔ " معمر زائر نے پوچھا۔ "پٹائی کیوں ہو گی۔ "

"جناب بیجی سار کا گلاس لانے کی فرمائش کی تھی گھر والوں نے۔ وہ نہیں ملا۔ "

"بیجی سار کا گلاس ۔ " معمر صاحب نے دہرایا۔ "وہ جو لکڑی کا گلاس ہوتا ہے۔ "

"بالکل بالکل۔ " اشفاق چلایا۔

"جو شوگر کی بیماری کے لئے ہوتا ہے۔ "

"بالکل بالکل۔ " ہم دونوں چیخ اٹھے۔

"وہ گلاس تو میرا چھوٹا بھائی لے کر گیا تھا ادھر سے۔ "

"سچ۔ کیا دلی سے لے کر گیا تھا۔ "

"ہاں دلی سے۔ " وہ بولا۔

"کہاں ملتا ہے۔ "

"بھئی ایک خرادیئے کی دکان ہے بلی ماراں میں۔ بھلا سا نام ہے اس کا۔ اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ "

"ہم اسے کیسے تلاش کریں گے۔ " اشفاق حسین پر پھر سے مایوسی چھانے لگی۔

معمر صاحب بولے "ہاں یاد آیا۔ اس کی دکان ہندوستانی دواخانے کے پاس ہے۔ "

"کوئی پتا۔ " اشفاق حسین نے پوچھا۔

"بلی ماراں چلے جاؤ۔ وہاں ہندوستانی دواخانہ پوچھ لو۔ ہندوستانی دواخانے سے خرادیئے کا پوچھ لو۔ انہیں اس گلاس کا علم ہے۔ "

معمر صاحب چلے گئے تو اشفاق حسین بولا "یار کمال ہو گیا۔ تین دن ہم پوچھتے رہے۔ تلاش کرتے رہے۔ کھجل ہوتے رہے پر کام نہ بنا۔ اب گھر بیٹھے بٹھائے ہو گیا۔ "

میں نے کہا۔ "دیکھ لے جس نے اپنی گھٹڑی یہ کہہ کر اس کے در پر رکھ دی کہ "لے تو جان اور تیرا کام۔ " وہ بادشاہ بن گیا۔ جو اپنی گھٹڑی اپنے سر پر دھرے رہا وہ پانڈی ہی رہا۔ تو نے وہ نہیں سنا۔ "

"کیا۔ " اشفاق نے پوچھا۔

میں نے یہ بول گنگنانے شروع کر دیئے۔

لگ لگ کہے نہ لگے
بن کہے لگ جا

"یہ تو پہیلی ہے۔" وہ بولا "مطلب ہے ہونٹ۔ لگ لگ کہتے رہو۔ کہتے رہو۔ نہیں لگتے۔ نہیں ملتے۔ بن کہو تو مل جاتے ہیں۔"

"انہوں۔" میں چلایا۔ "ہے تو پہیلی پر ہونٹ نہیں۔ زور لگاتے رہو۔ لگاتے رہو۔ کچھ نہیں ہوتا۔ مشکل اس کے در پر رکھ دو تو بن کہے حل ہو جاتی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر گاؤں ساتھ والہانہ ناچ ناچوں۔

لگ لگ کہے نہ لگے
بن کہے لگ جا

نہ بیٹا نہ

اگلے روز ہم دونوں بلی ماراں کی خاک چھان رہے تھے۔ گلیاں ہی گلیاں پیچ در پیچ گلیاں۔

مجھے پھر سے حاجی صاحب یاد آئے۔ وہی حاجی صاحب جنہوں نے دلی کی جامع مسجد میں بیعت کے لئے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے تھے۔

جب اماں نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا تھا کہ "بیٹا تو میرے کہنے میں نہیں ہے۔ بے شک جو جی چاہے کر۔ بس میری ایک بات مان لے۔ تو حمید کے ساتھ دلی چلا جا۔ یہ تجھے حاجی صاحب کے پاس لے جائے گا۔ تو حاجی صاحب کی بیعت کر آ۔ بس میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتی۔"

میں نے اماں کی بات مان لی تھی۔

میرا خیال تھا کہ حاجی صاحب کوئی بڑی طاقت ور ہستی ہیں۔

ان دنوں مجھ پر ایک لڑکی کا جنون سوار تھا۔ آدھی رات کے وقت جب سارے گھر والے سو جاتے تو میں دبے پاؤں اٹھتا اور گھر سے باہر نکل جاتا۔ پھر محلے کی اس گلی میں پہنچتا جہاں وہ رہتی تھی۔ سلاخ دار کھڑکی کھلی ہوتی۔ عین سامنے وہ اپنی چارپائی پر پڑی سوئی

ہوتی۔ سرہانے دیا ٹمٹمارہا ہوتا۔ اور میں وہاں کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہتا۔ دیکھتا رہتا۔

جب بھی میں محبوبہ کو دیکھنے جانے لگتا تو دفعتاً اماں جاگ اٹھتی اور مجھ سے منت کر کے کہتی نہ بیٹے یہ ٹھیک نہیں۔ میں پھر لیٹ جاتا۔ انتظار کرتا رہتا کہ کب اماں سوئے۔ جب اماں گہری نیند سو جاتی اور خراٹے لینے لگتی تو میں پھر دبے پاؤں اٹھتا۔ ابھی دو قدم بھرتا کہ اماں پھر جاگ اٹھتی تو میں پھر دبے پاؤں اٹھتا۔ ابھی دو قدم بھرتا کہ اماں پھر جاگ اٹھتی۔

ایک دن اماں بولی دیکھ بیٹے میں نے تیرا معاملہ حاجی صاحب کو سونپ دیا ہے۔ جب بھی تو ادھر جانے لگتا ہے تو حاجی صاحب مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیتے ہیں۔

اس کے بعد مجھے حاجی صاحب سے ڈر آنے لگا۔ میں سمجھا حاجی صاحب کوئی بہت طاقتور آدمی ہو گا۔

حاجی صاحب اسی بلی ماراں میں رہتے تھے۔

اللہ والے

حمید مجھے انہی پیچ در پیچ گلیوں میں گھمانے کے بعد ایک بند گلی میں لے گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد ایک نحیف و نزار بڈھا باہر نکلا۔ پتلے دبلے کمزور جسم پر ایک سریوں جھول رہا تھا. جیسے روئی کا بنا ہوا ہو۔ نہ جسم میں جان تھی نہ سر میں۔ پیشانی تلے دو بھور کالی گویا سرمہ سے بھرپور آنکھیں کٹوروں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں بلا کی چمک تھی۔ یوں جیسے دھار چل رہی ہو۔

انہیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ تو یہ ہے وہ حاجی صاحب جو اماں کو عین وقت پر جگا دیتا ہے۔ لیکن اس میں تو خود کو سنبھالنے کو ہمت نہیں۔ یہ ایک باغی نوجوان کو کیسے سنبھالے گا۔

اس زمانے میں میں بزرگ کا مفہوم نہیں سمجھتا تھا۔ اللہ والوں کی عظمت سے واقف نہ تھا۔ چشتیہ آنکھ کو نہیں پہچانتا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ اللہ کے بندوں کی حسیات ہم سے دس گنا زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ سنتے ہیں. زیادہ دیکھتے ہیں۔ زمان و مکان ان کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتے۔

میں نے سوچا۔ یہ شخص چاہے کتنا ہی پاکیزہ ہے آخر ہے تو میری طرح کا بندہ اس سے کھل کر بات کیوں نہ کروں۔

جب حمید ادھر اودھر ہوا تو میں نے بات چلا دی۔ میں نے کہا۔ ”حاجی صاحب یہ بتایئے کہ میں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے۔ “

وہ یہ سن کر گھبرا گئے۔ ”نہیں نہیں“ وہ بڑے اخلاق سے بولے۔ ”خدانخواستہ آپ کیوں قصور کرنے لگے اور پھر میری حیثیت ہی کیا ہے۔ “

میں نے کہا ”پھر آپ اماں کو عین وقت پر کیوں جگا دیتے ہیں۔ “

اس پر وہ قہقہہ مار کہ ہنسے۔ بولے۔ ”نہیں نہیں۔ میں تو انہیں نہیں جگاتا۔ “

میں نے مزید وضاحت کی۔ میں نے کہا ”رات کے وقت جب بھی میں محبوبہ کو دیکھنے کے لئے اٹھتا ہوں۔ آپ اماں کو جگا دیتے ہیں۔ “

وہ پھر ہنسنے لگے۔ بولے۔ ”میں نہیں جگاتا۔ آپ کی والدہ محترمہ اپنی روشنی کی وجہ سے جاگ پڑتی ہیں۔ “

معلق آنکھیں

میں نے کہا ”حاجی صاحب ایک بات پوچھوں۔ “

بولے ”بصد شوق پوچھئے۔ “

”آپ برا تو نہیں مانیں گے۔ “

”بالکل نہیں۔ “ وہ ہنسے۔ ”مجھے تو آپ کی باتیں بہت پسند آ رہی ہیں سبحان اللہ کتنی صاف بات کرتے ہیں آپ۔ “

میں نے کہا ”حاجی صاحب۔ جوانی میں آپ کو کسی لڑکی سے محبت ہوئی تھی کیا۔ “

بولے ”کسی ایک سے تو نہیں ہوئی۔ “

”ایک سے زیادہ سے ہوئی تھی کیا۔ “

”نہیں۔ “ وہ ہنس کر بولے۔ ”مجھے تو ہر حسین لڑکی اچھی لگتی تھی ان دنوں “ کہنے لگے ”کلکتے میں ہماری کیمسٹ کی دکان تھی۔ بس ایک ہی دھن سمائی تھی کہ کسی ضیاسی

سے ایسی چیز حاصل کریں کہ ہر راہ چلتی ہمیں دیکھ کر رک جائے۔ اور پھر ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ "

"کیا ایسی چیز ملی" میں نے پوچھا۔

"ہاں ملی۔ " وہ بولے۔ "اور یہی چیز باعث رحمت ہو گئی۔ "

"وہ کیسے جناب۔ "

"ایک سنیاسی نے سرمہ بنانے کی ترکیب بتائی۔ دو سال کی مسلسل محنت، عملوں اور وظیفوں کے بعد سرمہ تیار ہوا۔ آنکھ میں ڈالا۔ باہر نکلے۔ لڑکیاں ہمیں دیکھتیں اور گویا اندھی ہو جاتیں۔ دیوانہ وار ٹکٹکی باندھے ہمیں دیکھے جاتیں جیسے سدھ بدھ کھو بیٹھی ہوں۔ بس یہ دیکھ کر سراب ٹوٹ گیا۔ نگاہ میں عورت کی کوئی وقعت نہ رہی۔ وہ کشش حصول زندگی بن گئی۔ "

"پھر۔ " میں نے پوچھا۔

"پھر کیا۔ " وہ مسکرائے "کشش کے سب سے بڑے مرکز کو اپنا لیا۔ دکان چھوڑ دی۔ سب کچھ چھوٹ گیا۔ "

ہندوستانی دواخانہ

اس روز ہم دونوں اشفاق اور میں بلی ماراں کی انہی گلیوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ اشفاق حسین راہ گیروں سے ہندوستانی دواخانے کا پتہ پوچھ رہا تھا اور میرے سامنے حاجی صاحب کی دو کالی اور روشن آنکھیں معلق تھیں۔

دفعتاً اشفاق حسین نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں چونکا۔

"مل گیا مل گیا۔ " وہ چلایا۔ "اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"کیا مل گیا۔ " میں نے پوچھا۔

"ہندوستانی دواخانہ۔ وہ دیکھو سامنے۔ "

سامنے ایک بڑی سی دکان پر ہندوستانی دواخانہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دکان میں عسرت اور حسرت ویاس کی دھول اڑ رہی تھی۔ دیواریں خم آلود تھیں اور الماریاں یوں بند تھیں جیسے انہیں کبھی کھولا نہ گیا ہو۔ بوتلیں اور شیشیاں گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔

سامنے دو ٹوٹی ہوئی میزیں بچھی ہوئی تھیں جن پر دو انسان نما ڈھانچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چپ چاپ خاموش بے حس و حرکت۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ دونوں عرصہ دراز سے مر چکے ہوں اور ان کی روحیں عالم حیرت میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں ہوں۔

وہ دکان شفاخانہ معلوم نہ دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بیمار شفا پانے کی امید نہیں رچا سکتا تھا۔ اس سے تو وہ آیورویدک کی دکان کہیں زیادہ اچھی تھی۔

اگرچہ آیورویدک کی دکان پر بھی کوئی چہل نہ تھی۔ وید صاحب بڑے طمطراق سے بنی سجی میز کے سامنے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ پھر بھی دکان پر گرد آلودگی کی کیفیت طاری نہ تھی۔

ایک دن وہ تھا جب دلی کے طبی دواخانوں میں چہل پہل تھی۔ دلی کے نباض حکیموں کی انگلیاں گویا تشخیص کے کمپیوٹر تھے۔

اشفاق حسین آگے بڑھا۔ مجھ میں ہمت پیدا نہ ہو رہی تھی۔ سیلز مین میں حرکت ہوئی۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور زیر لب کچھ کہا جو مجھے سنائی نہ دیا۔

اولمپک کپ

اشفاق حسین خوشی خوشی دکان سے نیچے اترا۔

بولا “بن گئی بات۔ ”

“کیسے۔ ” میں نے پوچھا۔

“انہوں نے رحیم خرادیئے کا پتہ دیا ہے۔ ”

ایک تنگ سی گلی میں ایک ویہڑا سا نظر آیا۔ سامنے ایک چھوٹے قد کا آدمی مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔

وہ ٹھگنا مگر مضبوط جسم کا آدمی. آدمی نہیں لگتا تھا۔ ایسے معلوم دیتا تھا جیسے غار کے منہ پر کوئی جن بیٹا ہو۔

اشفق حسین اس کے قریب گیا۔ بولا۔ “جناب رحیم خرادیہ کی دکان کہاں ہو گی؟۔ ”

کافی دیر تک وہ غار غار ہی رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹا تو

ایک بڑا سا گودام نظر آیا۔ گودام کے مرکز میں ایک بڑا سا پرانی طرز کا خراد لگا ہوا تھا۔ جس کے ارد گرد کاغذ اور پلاسٹک کے تھیلے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کا سامان چنا ہوا تھا۔ پیچھے بڑے بڑے طاقوں میں بھری ہوئی بوریاں پڑی تھیں۔

رحیم خرادیہ اپنے غار میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھو جی بیٹھو۔ کیا چاہئے۔ ابے موڑھے لے آ ادھر۔ " اس نے رعب دار آواز میں کہا۔ اندھیرے کونوں سے دو سائے سے نمودار ہوئے۔

"نیجی سار کا نام سن کر وہ چلایا۔ " ابے گلاسوں کی بوری اتار۔ ادھر سے۔ " پھر خود ہی اٹھ کر ادھر چلا گیا۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری۔ کہنے لگا۔ "یار یہ تو بن گیا کام۔ "

دو گھنٹے کے بعد چار گلاس اٹھائے ہم رحیم خرادیے کی دکان سے یوں باہر نکلے جیسے اولمپکس سے کپ جیت کر آئے ہوں۔

سکھ نارائن

نیجی سار کے گلاس خرید لینے کے بعد چاندنی چوک کی اداسی ہماری نگاہ میں اتنی دبیز نہ رہی۔ بازار سے گزرتے ہوئے اشفاق حسین بولا "چلو یار وہ بھی خرید ہی لیں۔ "

"وہ کیا۔ " میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "ساری رات میں سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی ہمیں گھر والی کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لے جانا چاہئے۔ " اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا "یہ ہے وہ دکان۔ "

"کون سی دکان؟ " میں نے پوچھا۔

"یہ کارڈ ہمارے پڑوسی نے دیا تھا۔ "

"کون پڑوسی۔ "

"بھئی ترکی حمام میں جو ہمارا پڑوسی ہے۔ " اس نے بڑے رازدارانہ انداز سے مجھے بتایا تھا کہ کشمیری شال خریدنا ہو تو چاندنی چوک میں اس دکان پر جانا۔ چیز اچھی دے گا دام واجبی لگائے گا۔ کارڈ پر لکھا تھا "سکھ نارائن کمپنی۔ "

دو گھنٹے کی تلاش کے بعد ہم سکھ نارائن کمپنی پہنچے۔

وہ ایک بہت ہی چھوٹی سی دکان تھی جس میں کوئی شوونڈو نہ تھی۔ مال یوں ٹاٹ میں لپٹا ہوا پڑا تھا جیسے بوریوں کی دوکان ہو۔

"آیئے آیئے۔" لالہ جی بولے۔

"سکھ نارائن ......" اشفاق رک گیا۔

"جی مہاراج یہی ہے سکھ نارائن۔"

دکان میں نہ سکھ تھا نہ نارائن۔ ٹاٹ ہی ٹاٹ۔

"کشمیری چادر چاہیے۔" لالہ جی نے پوچھا۔

"جی۔" اشفاق نے کہا۔

"کس قیمت کی چاہیئے۔" لالہ جی نے پوچھا۔ ہماری گھبراہٹ دیکھ کر بولے "گھبرایئے نہیں مال اصلی ملے گا۔"

"نہ مہاراج۔" اشفاق حسین مسکرایا۔ "ہمیں اصلی نہیں چاہیے۔ ہمیں تو ایسی چادر چاہیئے۔ جو ہو ایک سو کی پر دکھے ایسے کہ کہ ایک ہزار کی ہے۔"

"اونہوں مہاراج۔" لالہ جی نے کہا۔ یہاں تو ایسا مال ہے جو ہے ایک ہزار کا پر دکھے ہے ایک سو کا۔"

یہ سن کہ ہم دکان پر بیٹھ گئے۔

اشفاق حسین بولا "لالہ جی ہم پردیسی ہیں۔"

وہ تو مہاراج ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

"کیسے ظاہر ہے۔" میں نے پوچھا۔

"پاکستان کے ہیں نا۔" وہ بولا۔

دیکھو لالہ جی۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اور گھر والی کے لئے تحفہ لے جانا ہے۔"

ہاں مہاراج۔" وہ بولا۔ "وہ تو لے جانا ہی پڑے گا۔"

"چیز سو دو سو کی ہو پر قیمت ہزار بتائیں تب بات بنے گی۔" اشفاق نے کہا۔ "ورنہ وہ دروازے کی کنڈی نہیں کھولے گی۔"

“جی مہاراج۔ ” لالہ مسکرایا۔ “پھر تو ایک ہی بات ہے۔ ” لالہ جی بولے۔

“کیا۔ ” میں نے پوچھا۔

“جو گھر والی مال پہچانتی ہے۔ پھر تو مشکل ہے۔ ”

“واہ لالہ جی۔ ” میں نے کہا۔ “گھر والی تو ایک ہی چیز پہچانتی ہے چاہے ہند کی ہو یا پاکستان کی۔ چمک. بھڑکیلا پن۔ ”

“سچ ہے مہاراج۔ ” وہ بولا۔ “مہاراج چمک تو مشینی چیز ہے۔ گھریلو نہیں۔ ”

یہ سن کہ ہم مایوس ہو گئے۔ جب دکان سے اٹھنے لگے تو لالہ جی بولے “ہاں ایک چیز ہے۔ رنگ — شاید بات بن جائے۔ دیکھ لو۔ ” یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ ٹاٹ کا ایک بستر اٹھا لایا۔ اسے کھولا۔ رنگ کا ایک ریلا آیا اور ہم پھر سے بیٹھ گئے۔

آدھ گھنٹے کے بعد چادریں لپیٹتے ہوئے لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ “مہاراج کسی سے یہ نہ کہنا کہ یہ سکھ نارائن کا مال ہے بڑی کرپا ہوگی۔ ”

“لالہ جی آپ پچھوں کہاں کے ہیں۔ ” میں نے پوچھا۔

“لالہ جی بولے “جی اب تو سمجھ لو دلی کے ہیں۔ پہلے نارووال کے تھے۔ ”

سمے سمے

“ایک بات تو بتایئے مہاراج۔ ” اشفاق حسین نے کہا۔

“پوچھو مہاراج ” لالہ جی بولے۔

“چار دن ہو گئے ہیں ہم ادھر دلی میں گھوم پھر رہے ہیں۔ جس سے بھی پوچھتے ہیں کہ پیچھے سے آپ کہاں کے ہیں تو کوئی لاہور بتاتا ہے. کوئی پنڈی. کوئی سیالکوٹ۔ کسی نے نہیں کہا کہ میں دلی کا ہوں۔ یہ کیا بات ہے۔ ”

“پتہ نہیں مہاراج۔ ” وہ بولے۔

“ایسے لگتا ہے کہ ادھر سے آنے والوں نے دلی پر دھاوا بول دیا ہے۔ پر دلی والے کہاں گئے۔ ”

“لالہ جی مسکرائے۔ بولے “مہاراج سمے سمے کی بات ہے۔ کبھی دلی والوں کا

سے تھا اب پنجاب والوں کا سے ہے۔ "

چادریں خرید کر ہم پھر چل پڑے۔ اشفاق حسین چلتے چلتے رک گیا۔ کہنے لگا "تم کہتے تھے کدھر خریدوں گا۔ "

ہمارے سامنے دکان پر کھدر بھنڈار کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر ایک سردار صاحب توند پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے۔

میں نے کہا۔ "سردار جی سنا ہے ہند کا کھدر بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ "

سردار جی بولے۔ "مہاراج کھدر تو کھدر ہے چاہے اوھر کا ہو یا ادھر کا۔ ادھر کا کھدر بھی کچھ کم نہیں۔ "

"پھر ادھر کی مشہوری کیوں ہے۔ " اشفاق حسین نے پوچھا۔

"یہ تو جی ایک فیشن ہے۔ " سردار جی بولے۔ "سمجھ لو بھیڈ چال ہے جو چل پڑی سو چل پڑی۔ بس گل تو ایک ہی ہے۔ "

"وہ کیا جی۔ "

سردار جی بولے۔ "ادھر لوک کھدر پہنتے ہیں اس لئے چلتا ہے ادھر لوک نہیں پہنتے اس لئے نہیں چلتا۔ "

"ادھر کیا چلتا ہے۔ سردار جی۔ " اشفاق حسین نے پوچھا۔

"سردار جی ہنسے بولے "مہاراج ادھر نائیلن چلتی ہے۔ ریشم چلتا ہے سنگڑا چلتا ہے۔ کاٹن نہیں چلتا۔ سچی گل ایہ ہے مہاراج کہ اوھر چمک چلتی ہے۔ لشکارہ چلتا ہے۔ "

اشفاق حسین ہنسا۔ کہنے لگا "سردار جی تسی پچھوں کدھر کے ہو۔ "

سردار بولا مہاراج "اساں رائے ونڈ دے آں۔ "

"تے فیر اردو کیوں بولدے او۔ " میں نے پوچھا۔

"آپاں کیہڑے سوکھے ہو کے بولنے آں۔ مہاراج کی کریئے بولنا پیندا اے دکانداری جو ہوئی۔ کی دسیئے مہاراج اردو بول بول کے آپاں دیاں تے وراچھاں پک گئیاں نے۔ ویلے ویلے دی گل اے سجنوں۔ "

کھدر خرید کر ہم دریا گنج کی طرف چلے تو اشفاق حسین بولا۔ "یار دلی وال کیا

ہوئے۔ ”

“کیا مطلب” میں نے پوچھا۔

“یہاں چاندنی چوک میں تو سارا پنجاب آ بسا ہے۔ دلی کے رہنے والے کہاں گئے ”

“جنوب میں چلے گئے ہوں گے۔ ” میں نے جواب دیا۔

“کیوں۔ ” وہ بولا۔

“بھئی یہ کول دراوڑ والی بات ہے۔ ”

“کیا مطلب۔ ”

“ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے۔ ہر نئی قوم شمال سے آئی اور جو یہاں آباد تھے انہیں نیچے دھکیل دیا۔ کول آئے اور دراوڑوں کو دھکیل دیا۔ آریہ آئے تو انھوں نے کولوں کو دھکیل دیا۔ ”

“لیکن وہ تو قوموں کی بات تھی۔ ” اشفاق حسین نے پوچھا۔ “دلی والے تو مہذب لوگ تھے۔ بہت بڑی تہذیب تھی۔ ”

“ہاں زیادہ مہذب ہو جائے تو انسان میں وہ ولولہ نہیں رہتا۔ جرات نہیں رہتی۔ ”

“اونہوں۔ تم کتابی بات کر رہے ہو۔ ” اشفاق حسین نے کہا۔ “مجھے ٹرخا رہے ہو یا خود کو ٹرخا رہے ہو۔ ”

“بالکل تجھے نہیں خود کو ٹرخا رہا ہوں۔ ” میں نے جواب دیا۔ خالص کتابی بات ہے۔ ویسے سچ پوچھو تو میں بھی بات کو نہیں سمجھا۔ ”

اشفاق حسین نے زور سے قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا۔ “میں سمجھتا تھا۔ تم وہی بات کرتے ہو جسے دل سے مانتے ہو۔ ”

کتاب و شنید

مجھے نور بابا یاد آ گئے۔ نور بابا سے مجھے اشفاق احمد نے ملایا تھا۔

ایک روز اشفاق احمد کہنے لگا۔ “یار نور بابا کہتے ہیں کہ جو شخص کتاب اور شنید کے

چکر میں پھنس گیا سمجھ کر لو وہ علم سے دور ہو گیا۔

یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ سن کر میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اشفاق احمد سے کہا یار مجھے نور بابا سے ملا دو۔

نور بابا سے مل کر میں بہت حیران ہوا۔ ان کی بیشتر باتیں گویا کہاوتیں تھیں۔ تھوڑے سے الفاظ میں ایک انقلابی حقیقت بیان کر دینا نور بابا کا کمال تھا۔ نور بابا سے ملنے کے بعد میرے دل میں ان پڑھ لوگوں کی عزت پیدا ہو گئی اور مشاہدے کی عظمت کا احساس جاگا۔ نور بابا سچ کہا کرتے تھے۔ فرماتے۔ پتر کسی ان پڑھ کے ہاتھوں پاکستان کو کبھی نقصان نہیں پہنچا۔

ایک روز نور بابا کے سامنے کتابی بات کہہ کر میں بے حد شرمندہ ہوا۔ بابا میری شرمندگی بھانپ کر بولے۔

”نہ پتر اس بات پر شرمندہ ہونے کی چنداں حاجت نہیں۔ یہ تمہارا خیال نہیں. تمہاری عادت ہے۔ “

نور بابا سچ کہتے تھے۔ زندگی میں میں اکثر عادتاً کتابی بات کر دیتا ہوں۔ وہ میرا خیال نہیں ہوتا. عادت ہوتی ہے۔

اس روز اشفاق حسین سے بحث کرتے ہوئے میں عادت کا سہارا لے رہا تھا۔ ویسے دلی وال کے متعلق میری رائے مختلف تھی۔

جب بھی میری بیوی کسی اہل زبان سے ملتی ہے تو گھر آ کر اکثر کہا کرتی ہے ”دیکھو یہ اہل زبان ہم پنجابی لوگوں سے کس قدر بہتر ہیں۔ کتنے افضل ہیں۔ “

”وہ کس طرح۔ “ میں پوچھتا ہوں۔

کہتی ہے ”سیدھی بات ہے۔ ان کے مقابلے میں ہم تو گونگے ہیں۔ جتنی دیر ہم ہونٹ سنوارتے رہتے ہیں۔ وہ دس باتیں کر جاتے ہیں۔ کڑاکے دار باتیں۔ ہم جیسی پھسپھسی نہیں۔ ان میں بات کرنے کی قابلیت ہے اور آج کے دور میں جس میں بات کرنے کی قابلیت ہے وہ یقیناً افضل مخلوق ہے۔ “

پہلی مرتبہ اپنی بیوی کی بات سن کر میں چونکا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس صلاحیت کو اس زاویے سے نہ دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کچر کچر باتیں کرنا کوئی خوبی

نہیں۔

مت بولئے

دفعتہً اشفاق حسین رک گیا۔ بولا “یار مجھے تو یاد ہی نہ تھا۔ افضل نے فرمائش کی تھی کہ ایک جلد کانشی رام کے میٹریا میڈیکا کی لے آنا۔ ”

“وہ جو اردو میں ہے۔ ” میں نے پوچھا۔

“ہاں وہی۔ ”

“وہ تو ادھر بھی ملتی ہے۔ عام ” میں نے کہا۔

“ہاں ملتی ہے۔ ” اشفاق نے جواب دیا۔

“پھر یہاں سے لے جانے کا فائدہ۔ ”

“بس فرمائش ہے۔ ” وہ بولا۔

“یہاں سستی ہوگی۔ ” میں نے کہا۔

“ہاں ” وہ بولا۔

“ہٹاؤ یار ” میں نے کہا “پیسے بچانے کے لئے بوجھ اٹھانا زیادتی ہے۔ ”

“نہیں یار ” وہ بولا “چاہے کچھ بھی ہے پھر بھی فرمائش ہے۔ چلو بھنڈاری کی دکان پاس ہی ہے۔ پوچھ لیتے ہیں۔ ” دراصل وہ بھنڈاری کی دکان میں جانے کا بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔

ہم بھنڈازی کی دکان میں داخل ہوئے تو تمام سیل گرلز کاؤنٹر پر آگئیں۔

“ہم واپس جارہے ہیں۔ ” اشفاق حسین نے کہا۔ “سوچا جانے سے پہلے آپ کو نمسکار کرلیں۔ ”

“بڑی کرپا ہے۔ ” اوشا نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیا۔

الگ کمرے میں بیٹھی ہوئی معصوم لڑکی کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔

“خریداری کرلی۔ ” ایک لڑکی نے پوچھا۔

“ہند کو لوٹ کر لئے جارہے ہیں۔ ” اوشا نے مسکرا کر پوچھا۔

“نہیں۔ ” اشفاق حسین بولا۔ “ہومیوپیتھی کا خزانہ لوٹا۔ ”

اس پر وہ سب قہقہہ مار کر ہنسیں۔

”ہند میں ہومیوپیتھی تجربے کا بہت بڑا خزانہ ہے۔“ اشفاق حسین نے کہا۔

”اچھا۔“ اوشا بولی ”اس خزانے کو یہاں کوئی نہیں لوٹتا۔

”کوئی پوچھتا ہی نہیں۔“ دوسری نے کہا۔

”بڑے افسوس کی بات ہے۔“ اشفاق نے کہا۔

”انہیں پتہ ہی نہیں“ دوسری نے کہا۔ ”کہ یہ خزانہ ہے۔“

”اچھا۔“ اشفاق حسین نے کہا۔ ”اب جاتے ہوئے ہمیں ایک کتاب اور دے دیجیے۔“

”ساری کی ساری لے جایئے۔“ سیلز گرل مسکرائی۔

”یقیناً لے جاتا۔ پر کیا کروں غریب آدمی ہوں۔ ”پلے نہیں دھیلہ تے کروا میلہ میلہ“ والی بات ہے۔“

”کون سی کتاب دوں۔“ اوشا نے پوچھا۔

”کانشی رام کی اردو کی کتاب میٹریا میڈیکا۔“

”اردو کی۔“ اوشا مسکرائی ”یہاں اردو کی کتاب نہیں چھپتی۔“

”کیا مطلب۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”انگریزی یا ہندی میں۔ اردو کوئی نہیں پڑھتا۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ میں نے کہا۔

”پوچھیے۔“ وہ مسکرائی۔

”یہاں اردو بولتے کیوں ہیں۔“

”یہاں تو ہندوستانی بولتے ہیں۔“

”آپ سیب کا نام کیلا رکھ دیں پھر بھی وہ سیب ہی رہے گا۔ اردو کا کوئی نام رکھ دیجیے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“ وہ بولی۔

”یہاں دلی میں سب اردو بولتے ہیں۔ ہندی نہیں بولتے سنسکرت نہیں بولتے۔ برج بھاشا نہیں بولتے۔ وہ بولی نہیں بولتے جو آکاش وانی بولتی ہے لیکن اردو لکھنے پر بین

ہے چھپنے پر بین ہے۔ اگر لکھنا گوارہ نہیں تو بولتے کیوں ہیں۔ مت بھولئے۔ بی بی! اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ولی والوں کی زبان ہے۔ "

آخری دن

دلی میں وہ ہمارا آخری دن تھا۔

اسی رات ہماری واپسی تھی۔ ہمیں امرتسر جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہونا تھا۔

اس روز ہم آزاد تھے۔ کوئی کام نہ تھا۔ کوئی بندھن نہ تھا۔ قابل ادا فرض نہ تھا۔

ہومیوپیتھی کی کتابیں اور دوائیاں خریدی جا چکی تھیں۔

بیجی سار کے چار گلاس ہمارے سامان میں بندھے ہوئے پڑے تھے۔

راگ و دیا کا ایک ٹیپ اشفاق حسین نے سینے سے لگا رکھا تھا۔

اپنا اپنا سہاگ دائم اور قائم رکھنے کے لئے ہم نے ایک ایک کشمیری چادر بھی خرید کر رکھ لی تھی۔ اور بڑے اہتمام سے قیمت کی اس پرچی پر جوان کے ساتھ ٹانکی ہوئی تھی، ہم نے ۲۰۰ کو ۵۰۰ میں بدل دیا تھا تاکہ واپسی پر بیگم صاحبہ گرم جوشی سے ہمارا استقبال کریں۔

لہٰذا ہمیں کوئی فکر نہ تھا۔ اندیشہ نہ تھا، گھبراہٹ نہ تھی۔ اس روز ہم خالص آوارہ گردی کرنے گھر سے باہر نکلے تھے اور یوں گردوپیش کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے دہقان شہر کو دیکھتے ہیں۔

دفعتہً اشفاق حسین رک گیا۔

”کیوں کیا ہوا۔“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بولا۔

”چلو آگے۔“

”کہاں۔“ اس نے پوچھا۔

”چھوڑو یار۔“ وہ بولا۔

”کیا مطلب۔“ میں نے پوچھا۔

”چلو گھر چلیں۔“ اشفاق حسین نے کہا۔

”کیوں۔“

”یہاں دیکھنے کی کوئی چیز بھی ہو۔“

”بھئی رونق ہے۔ بھیڑ ہے۔“

”اونہوں ــــ رونق نہیں۔“ وہ بولا۔ ”صرف بھیڑ ہے۔“ وہ بھی اتنی نہیں۔“

”دکانیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہیں۔“

”مال سے بھری ہوئی ہیں۔“

”بالکل ہیں۔ پر دکاندار یوں فارغ بیٹھے ہیں جیسے دکانیں خالی پڑی ہوں۔“

”اتنے سارے لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہیں۔ پر شاپنگ نہیں ہے۔“

”ہاں بہت کم شاپنگ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہاں تو دکانیں گڑ کی بھیلیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ مکھیاں ہی مکھیاں۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔

”پھر دیکھو۔ یہاں ہر چیزیں کس قدر سستی ہیں۔“

”بہت۔“ میں نے کہا۔

”پر پرچیزنگ پاور نہیں ہے۔ جیب چاہے بھرے ہوں ہاتھ خالی ہیں۔ یہ لوگ

دیکھے تم نے۔ " اس نے پوچھا۔

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔ " میں نے جواب دیا۔

"محنتی ہیں، چست ہیں پر چمک نہیں۔ " اشفاق نے کہا۔

"ہاں بجھے بجھے سے ہیں۔ "

"کوئی شرہمتی نہیں۔ "

"واقعی حیرت ہے۔ " میں نے آہ بھری۔

"عورت نہ ہو تو شاپنگ کیسے ہو۔ ہو سکتی ہے کیا۔ "

"اونہوں۔ "

"وہ خود آتی نہیں بازار میں۔ یا آنے نہیں دیتے۔ " میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ " وہ بولا۔ پھر دفعتہً ایک ہونکتے ہوئے موٹر سائیکل کو دیکھ کر مسکرایا" سڑک پر موٹر سائیکل دیکھے تو نے۔ "

"کوئی کوئی ہے۔ کہیں کہیں " میں نے جواب دیا۔

"یوں چلتے ہیں جیسے بائیسکل ہوں۔ " وہ ہنسا۔ "ادھر توزوں ـــــ زوں چلتے ہیں۔ "

"ساتھ چنگھاڑتے بھی ہیں۔ " میں نے کہا۔ "توبہ ہے کانوں کے پردے پھاڑ دیتے ہیں۔ "

"اک اور بات دیکھی تو نے۔

"کیا۔ " میں نے پوچھا۔

"جوان ہیں پر ان میں جوانی کی شوں نہیں ہے۔ " اشفاق حسین نے کہا۔

"کیا مطلب۔ " میں نے پوچھا۔

"بلبلے نہیں مارتے۔ مونچھ نہیں مروڑتے۔ گردن نہیں اکڑاتے۔ "

"ادھر تو بلبلے ہی بلبلے ہیں۔ " میں ہنسا "گردنیں ہیں گردنیں ہیں۔ "

"ادھر لڑکیاں راہ چلنے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں میری طرف دیکھ۔ ہے نا" اشفاق حسین نے پوچھا۔

"ادھر تو لڑکی ہے ہی نہیں۔ " میں نے آہ بھری۔

“جو ہے بھی تو لڑکا بنی پھرتی ہے۔ ”

“اور ادھر تو لڑکے لڑکیاں بنے پھرتے ہیں۔ ” میں نے کہا۔

“ایسا کیوں ہے مفتی۔ ” اس نے پوچھا۔

“پتہ نہیں۔ ”

“وجہ تو ہوگی۔ ”

“میں بتاؤں۔ ” میں نے کہا “شاید..... ”

“بتا۔ ”

دال اور چاول.

“یہ دو الگ الگ قومیں ہیں ادھر اور ادھر اور اس لئے ..... ”

“پہلے تو ایک ہی تھی” وہ بولا۔

“اونہوں۔ ” میں نے سر نفی میں ہلایا۔

“کیسے۔ ” اشفاق حسین نے پوچھا۔

“پہلے کھچڑی تھی۔ دال چاول ملے جلے تھے۔ اب دال الگ اور چاول الگ۔ ”

“پہلے تو وطن ایک تھا۔ کلچر ایک تھا۔ ” اشفاق حسین بولا۔

“نہ نہ نہ۔ ” میں نے نفی میں سر ہلایا۔

“کیا مطلب۔ ” اس نے پوچھا۔

“وطن ایک تھا کلچر دو تھے۔ ” میں نے کہا۔

“کلچر زمین کی پیداوار نہیں ہوتی کیا” اس نے پوچھا۔

“کلچر عقیدے کی پیداوار ہوتی ہے۔ ” میں نے کہا۔

“اچھا مجھے پتہ نہ تھا۔ بہر طور یہاں اتنی اداسی کیوں ہے۔ اتنی ویرانی کیوں ہے — شاید .... ” میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

“شاید کیا — ” اس نے پوچھا۔

“یہاں ملک امیر ہے عوام غریب ہیں۔ وہاں عوام امیر ہیں ملک غریب

ہے۔ ”

“اونہوں۔ ” وہ بولا “ذہانت اور چمک امارت سے نہیں ہوتے۔ تجھے یاد ہے اس سکھنی نے کیا کہا تھا۔ ” اشفاق حسین نے پوچھا۔

“کیا کہا تھا۔ ” آپ پاکستان سے آئے ہیں نا۔ ”

“اوشا نے بھی تو یہی کہا تھا۔ کہتی تھی دور سے پتہ چل جاتا ہے کہ پاکستان سے آیا ہے۔ ” میں نے جواب دیا۔

“تو نے یہاں کے سپاہی دیکھے۔ ” اس نے پوچھا۔

“ہمارے ڈیرے پر جو بیٹھتے ہیں اتنے سارے۔ ”

“وہ تو خیر یتیم ہیں۔ یہ چوک والا دیکھ لو۔ ” اشفاق حسین بولا۔

“کیا ہے اسے۔ ”

“سالے کے پاس مروڑنے کے لئے مونچھ تک نہیں۔ ”

“کلین شیو ہو گا نا اس لئے۔ ” میں نے جواب دیا۔

“نہیں — ” اشفاق حسین چلایا۔ “ہوتی بھی تو نہ مروڑتا۔ ”

“کیوں۔ ”

“مونچھ مروڑنے کے لئے صرف انگلیاں ہی نہیں چاہیں مونچھ مروڑی ذہنیت بھی چاہئے نا” وہ مسکرایا “پھر یہاں کی موٹر دیکھی تم نے۔ ” اس نے موٹر کو دیکھ کر پوچھا۔

“اس پر تو ناز کرتے ہیں ہند والے۔ سودیشی ہے نا اس لئے۔ ”

“بے شک ناز کریں۔ انہیں حق حاصل ہے۔ لیکن یہ چلتی یوں ہے جیسے لاج کی ماری ہو۔ ادھر ہم باہر سے منگواتے ہیں پر یوں چلتی ہے جیسے پانی میں بطخ تیرتی ہے۔ ”

“اونہوں۔ مثال ٹھیک نہیں۔ ” میں نے کہا۔

“تو کر دے ٹھیک۔ ”

“یہاں کی موٹر یوں چلتی ہے جیسے لاج کی ماری ہوئی ہو۔ وہاں کی یوں مٹکتی ہے جیسے ہیرا منڈی میں رنڈی چلتی ہے۔ ”

اشفاق ہنسا “یار اتنی بے ادب مثال دیتا ہے تو ادیب ہو کر۔ ” وہ ہنسنے لگا۔

“اچھا ایک بات بوجھے گا۔ ”

“اونہوں مشکل ہے۔ ” میں نے جواب دیا۔

“کیوں۔ ”

“بھئی سوجھ بوجھ ہو بھی۔ ”

“کوشش تو کر۔ ”

“اچھا — بول۔ ”

کھااڑا — کمابجا

“یہ چاندنی چوک ہے نا؟ ”

“ہاں چاندنی چوک ہے۔ ”

“بڑا بازار ہے نا دلی کا۔ ”

“بالکل ہے۔ ”

“ہمارا بڑا بازار کون سا ہے۔ پنڈی شہر کا۔ ”

“راجہ بازار ہے۔ ”

“اس بازار اور اس بازار میں فرق دیکھتا ہے تو۔ ”

“بہت۔ ”

“مثلاً کیا۔ ”

“وہاں چلنے کو رستہ نہیں ملتا۔ ”

“اور — ”

“وہاں موڈھے مار چلتے ہیں۔ ”

“اور یہاں۔ ”

“یہاں رستہ دیتے ہیں. موڈھے نہیں مارتے۔ ”

“کچھ اور — ”

“وہاں دکاندار۔ خریدار سے اکتائے بیٹھے ہیں۔ یہاں دکاندار خریدار کا انتظار کر رہے ہیں۔ ”

“کچھ اور ـــــ”

“وہاں غنڈہ بازی چلتی ہے یہاں نہیں۔ ”

“کچھ اور ـــــ”

“بس۔ اور کیا۔ ”

“کچھ دکانوں کے بارے میں۔ ”

“وہاں گرمی ہے شوراشوری ہے۔ یہاں ٹھنڈ ہے۔ ”

“کچھ اور ـــــ”

“چھوڑ یار۔ ”

“وہاں ہر چوتھی دکان کھانے پینے کی ہے۔ ہے نا۔ ”

“ہاں یہ تو ہے۔ بلکہ ہر تیسری دکان۔ ”

“یہاں کوئی نظر آتی ہے کھانے پینے کی دکان۔ ”

“اونہوں۔ ”

“ایسا کیوں ہے۔ ”

“سیدھی بات ہے۔ وہ کھاؤ قوم ہے یہ کماؤ بچاؤ قوم ہے۔ ”

خوشحالی

“ٹھیک بالکل ٹھیک۔ وہ کھاتے ہیں. کھاتے ہیں. کھاتے ہیں۔ چلتے پھرتے کھاتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے ہیں۔ گھر میں. دفتر میں. ہوٹل میں. موٹر میں. سرراہ ہر جگہ۔ ”

“بالکل۔ ”

“پھر حیرت کی بات ہوئی نا۔ ”

“کیا۔ ”

“سمجھ میں نہیں آتی۔ ”

“کیا سمجھ میں نہیں آتی۔ ”

“شاید تیری سمجھ میں آئے۔ ”

“پوچھ۔ ”

”یہ بتا کیا کھا اڑا قوم کو خوشحال ہونا چاہئے یا کما بچا کو۔ “

”ظاہر ہے کما بچا کو۔ “

”پھر یہاں خوشحالی کیوں نہیں دکھتی۔ دکھتی ہے کیا۔ “

”اونہوں۔ بالکل نہیں۔ “

”ادھر دکھتی ہے۔ ہے نا۔ “

”بہت۔ “

”یہ کیوں۔ “

”شاید ادھر خالی دکھنے والی ہو۔۔۔۔ نقلی اور ادھر نہ دکھنے والی ہو اصلی۔ “

”یہ نہیں ہو سکتا۔ “

”کیوں۔ “

”خوشحالی دکھے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح رنگ دکھے بغیر نہیں رہتا۔ “

”بات تو ٹھیک ہے۔ “

”اس کی وجہ کیا ہے۔ “

”پتہ نہیں۔ “

”ایک اور بات دیکھ۔ بھرا بازار ہے نا۔ “

”بالکل۔ “

”کوئی منگتا نظر آتا ہے کیا۔ “

”بالکل نہیں۔ “

”کیوں۔ “

”یہ تو سیدھی بات ہے۔ “

”کیا۔ “

”کوئی دینے والا ہی نہ ہو تو مانگے کون۔ “

”وہاں تو منگتے ہی منگتے ہیں۔ “

”دینے والے جو ہیں۔ “

”یہاں دان پن نہیں کیا۔ “

“بہت ہے۔ ہم سے زیادہ۔ وہاں پیسہ پیسہ دیتے ہیں۔ یہاں پیسہ پیسہ نہیں دیتے۔ لاکھوں دیتے ہیں۔ ہسپتال بنا دیتے ہیں سرائے بنا دیتے ہیں۔ ”

“فرد کو نہیں دیتے۔ حاجت مند کو نہیں دیتے۔ ”

“حاجت مند مانگتا ہی نہیں۔ ”

“کیا مطلب۔ ”

“مدینے شریف میں لوگ حاجت مند کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ شاید وہ قبول نہ کرے۔ وہاں لینے والا دینے والے پر احسان کرتا ہے۔ ”

“اس شہر پر حضورؐ کا سایہ ہے۔ اس شہر کی کیا بات ہے۔ ”

وہ خاموش ہو گیا۔

بوتل کا کاگ

دیر تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے۔

دفعتہً وہ رک گیا۔ “یار مفتی۔ ” وہ بولا “یہاں کوک نہیں دیکھا۔ ”

“اونہوں یہاں کوک نہیں ہے۔ ”

“کیوں۔ ”

“وہ کوک نہیں ہمارے والا بدیشی۔ انہوں نے اپنا کوک بنایا ہوا ہے۔ سودیشی۔ ”

“بدیشی یا سودیشی کسی کو پیتے دیکھا ہے کیا۔ ”

“اونہوں۔ ”

“وہاں تو بچے کہتے ہیں چاہے روٹی نہ دو کوک پلا دو۔ جوان کہتے ہیں۔ چلو یار عیاشی کریں، کوک پئیں۔ کوک کی دکانوں پر بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ”

“یہاں بھی پیتے ہیں۔ ”

“کیا۔ ”

“کوک نہیں۔ ”

“جوس۔ ”

“اونہوں۔ ”

“اوہ سمجھا___” اشفاق حسین مسکرایا۔

“یاد ہے وہاں امرتسر کے تانگے والے سکھ ڈرائیور نے کیا کہا تھا۔ میں نے اسے کہا سردار جی یہ امرتسر کے لوگ کچھ بند بند سے ہیں جیسے بوتلیں ہوتی ہیں۔ وہ بولا نہیں مہاراج رات پڑتی ہے تو بوتل کا کاگ اڑ جاتا ہے۔ ”

“ہاں۔ ” اشفاق حسین نے کہا۔ “ہند میں پینے کی عادت بڑھ گئی ہے۔ ”

“کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ ”

“بلکہ بڑھتی جارہی ہے۔ یہ کیا اچھی بات ہے۔ ”

“بالکل نہیں۔ گرم ملکوں میں یہ بری بات ہے۔ اس روز فکر کے گھر میں بھی تو نے دیکھا تھا نا۔ ”

“فکر تو خیر مجبور ہے۔ ”

“کیوں۔ ”

“اتنا بڑا لکھنے والا ہے مگر گونگا۔ ”

“دوسرے لوگ تو گونگے نہ تھے۔ جب بوتل آئی تو تم نے ان کی آنکھوں میں چمک نہیں دیکھی تھی کیا۔ ”

“اونہوں۔ ”

“گرسنہ تھی۔ ”

“یہ بتا ہند کیوں پینے لگا ہے۔ ”

“پتہ نہیں۔ ” وہ سوچ میں پڑ گیا۔

“تو تو خود پیتا رہا ہے۔ ”

“ہاں۔ ”

“لوگ کیوں پیتے ہیں۔ ”

“گونگے پیتے ہیں کہ بولیں۔ ڈل پیتے ہیں کہ چمکیں۔ جھجھک والے پیتے ہیں کہ ان جھک ہو جائیں۔ مظلوم پیتے ہیں. قلاش پیتے ہیں کہ دو گھڑی بھول جائیں۔ ”

"یہ ہندو والے کیوں پینے لگے۔ کیا بھولنے کے لئے۔ "

"پتہ نہیں۔ " وہ بولا " آؤ کہیں بیٹھ جائیں۔ "

"کہاں بیٹھیں۔ "

چائے کا دھواں

"یہاں کوئی چائے کی دکان بھی نہیں" ۔

"ہاں یار کوئی ٹی ہاؤس نہیں. کافی ہاؤس نہیں" ۔

"کڑک چائے خانہ بھی تو نہیں" ۔ وہ بولا۔

"ادھر تو قدم قدم پر ہوتا ہے۔ لوگ چائے کم پیتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر باتیں زیادہ کرتے ہیں" ۔

"یہ تو اچھا ہے" ۔ اشفاق حسین مسکرایا۔

"کس لحاظ سے" ۔

"بھئی چائے کے بہانے دل کا دھواں نکال لیتے ہیں۔

"یہاں تو پھر دھواں نکلنے کی کوئی صورت نہیں" ۔

"بالکل نہیں" ۔

"تو اکٹھا ہو رہا ہو گا" ۔

"کیا" ۔

"دھواں اور کیا۔ شاید شراب خانے میں نکلتا ہو" ۔

"اونہوں۔ وہاں دھواں نہیں نکلتا" ۔ اشفاق حسین نے کہا۔

"بوتل پر سے ڈاٹ تو اڑتا ہے" ۔

"اڑتا ہے پر دھواں نکالنے کے لئے نہیں" ۔

"کیا مطلب" ۔

"چائے دوسروں کے خلاف شکوہ شکایت نکالنے کے لئے اکسیر ہے۔ شراب اپنی معذوری کو دور کرنے کی چیز ہے۔ پی کر لنگڑا دوڑتا ہے۔ اندھا دیکھتا ہے۔ بہرہ سنتا ہے۔ چلو یار گھر چلیں" ۔ دفعتہً اس نے بات بدلی۔

"وہاں جا کر کیا کریں گے"۔

"کچھ نہیں کریں گے۔ کچھ نہ کرنا بڑی عیاشی ہے"۔

"بڑی"۔

"یہ کالے لوگ ہیں۔ احساس فراغت سے محروم ہیں"۔

"بے شک یہ کالے لوگ ہیں۔ محنتی ہیں۔ ان میں تلخی نہیں۔ شدت نہیں۔ صبر والے ہیں۔ بلبلے نہیں نکالتے۔ ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔ مگر.... "

برکت ہی برکت

"مگر کیا"۔

"مگر—— یہاں اداسی ہے۔ بڑی اداسی ہے"۔

"ہاں اداسی تو ہے"۔

"تازگی نہیں، تڑپ نہیں، چمک نہیں، رونق نہیں—— "

"مجھے ایسے لگتا ہے کہ یہاں سبھی کچھ ہے پر برکت نہیں، رحمت نہیں۔ "

"بالکل بالکل" اس نے جواب دیا "آخر تو نے بات کہہ دی۔ میرے سوال کا جواب مل گیا۔ یہاں سبھی کچھ ہے پر برکت نہیں اور وہاں برکت ہی برکت ہے۔ انبار لگے ہوئے ہیں"۔

وہ خاموش ہو گیا۔ دیر تک ہم خاموش رہے۔

"ایک بات پوچھوں"۔ میں نے کہا۔

"پوچھ"۔

"تو تو برکت کو نہیں مانتا تھا"۔

"مذہبی رنگ میں نہیں مانتا تا"۔

"برکت تو کوئی نیچرل چیز نہیں۔ نہ ریشنل ہے"۔

"ہاں ہے تو عقل سے ہٹ کر"۔

"جو عقل سے ہٹ کر بات ہو وہ مذہبی ہو جاتی ہے"۔

"وہ کس طرح"۔

“وہ سپر نیچرل ہوتی ہے اور مذہب سپر نیچرل سے اخذ ہوتا ہے”۔

“ہٹا یار”۔ وہ بولا “چل اب چلیں”۔

“رکشا پکڑوں”۔

“رکشا”۔ میں نے ایک گزرتے ہوئے رکشا کو آواز دی۔

“رکشا”۔ وہ بولا “اسے نہ روک”۔

“کیوں — خود ہی کہتا ہے روک خود ہی کہتا ہے نہ روک”۔

“یہ رکشا نہیں — یہ تو ظلم ہے”۔

“ظلم کیوں”۔

“بندہ بندے کو کھینچتا ہے۔ اس رکشا والے کی ٹانگیں دیکھو۔ یہ ظلم نہیں کیا۔ ہند والے تو جیو ہتیہ کے قائل ہیں۔ پھر یہ کیوں گوارہ ہے”۔

“بندے کو جیو نہیں سمجھتے یہ”۔

“کسے سمجھتے ہیں”۔

“گائے کو”۔

“ہاں یار وہ گائے نہیں دیکھی ادھر”۔

“کون سی گائے”۔

“وہ مقدس گائے جو ہند کے بازاروں میں گھوما پھرا کرتی تھی”۔

“ہاں وہ تو نظر نہیں آئی کہیں”۔

“بہت کچھ بدل گیا ہے”۔

“بس ایک بات ہے جو نہیں بدلی”۔

“بس ایک بات ہے جو نہیں بدلی”۔

“وہ کیا”۔

“مسلوں سے عناد”۔

“وہ تو الٹا بڑھ گیا ہے”۔ وہ ہنس لگا۔ “جب تک پاکستان کی دھول نہ اڑا لیں گے انہیں چین نہیں آئے گا”۔

“بیچارے”۔ کبھی چین نہیں آئے گا انہیں

"کیا مطلب"۔

"پاکستان کی دھول کوئی نہیں اڑا سکتا اب"۔

"کیوں"۔

"پاکستان پر میرے اللہ کا ہاتھ ہے"۔

اپنے اڈے پر جانے کے لئے جو رکشا ہمیں ملا۔ اس کا ڈرائیور ایک نوجوان ہندو تھا۔

ڈرائیور کے متعلق میرا ایک مفروضہ ہے جو میں نے عرصہ دراز سے دل میں پال رکھا ہے۔

ہر پروفیشن کے چند ایک اثرات ہوتے ہیں"۔

حسابئے

مثلاً حساب کتاب سے متعلقہ لوگ چیڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اعتراضات ڈھونڈتے ہیں۔ اعتراضات پالتے ہیں۔ پیدا کرتے ہیں۔ پھر ان کا سونٹا بنا کر اسے مگدر کی طرح چلاتے ہیں۔ اس عمل میں انہیں بڑی راحت ملتی ہے۔

آڈیٹر کی انگلی غلطی پر رک جاتی ہے۔

اعتراض کو تقویت دینے کے لئے وہ ایسا قانون ڈھونڈتے ہیں جو اسے سہارا دے سکے۔ انسان کو اصول پر قربان کرنا ان کے ذہن میں بہت بڑی نیکی ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اصول انسان کے لئے بنائے جاتے ہیں انسان اصول کے لئے نہیں۔

اس پروفیشن کے کارکنوں کی خانگی زندگی مسرت سے محروم رہ جاتی ہے۔ بیگم سخت دکھی رہتی ہے۔ چونکہ ایک گھر میں دو اکاؤنٹینٹ گزر بسر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ڈرائیوروں سے متعلق بھی میرے چند ایک مفروضے ہیں۔

ڈرائیور۔

ڈرائیور کے پیشے میں دو خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک مسلسل حرکت۔

دوسرے گاڑی پر کنٹرول۔ اس پروفیشن کے بیشتر افراد خانہ بدوش قوموں میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ مروجہ رسم اور اخلاق سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔ طبیعت میں اک شان بے نیازی ہوتی ہے۔۔۔ چلو۔۔۔ پھر کیا ہوا۔ جذباتی ہوتے ہیں رنگدار ہوتے ہیں بے پرواہ۔ مونچھ مروڑ۔ ہرجائی۔

اب کا تو مجھے علم نہیں تقسیم سے پہلے جب انگریز کا راج تھا اور لوگوں کی دلوں میں رسم و رواج اور اخلاق کا بڑا خیال تھا۔ ان دنوں ریل کا گارڈ اپنے ریسٹ سٹیشن پر تار دیتا تھا سات ڈاؤن سے آ رہا ہوں۔ میرے لئے ڈبل بیڈ، دو ڈنر، اور لڑکی کا انتظام رکھو۔ سٹیشن ماسٹر مسکرا کر یا لاحول پڑھ کر تار ریفریشمنٹ روم کے ٹھیکیدار کو دے دیتا۔ ٹھیکیدار ریفریشمنٹ کا انتظام کر دیتا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

بڑے شہروں میں ریفریشمنٹ کا کام تانگہ ڈرائیور کیا کرتے تھے۔ ایر کمپنی کے کپتان اگرچہ بڑے تعلیم یافتہ اور مہذب ہوتے ہیں۔ بڑے ول ٹریولڈ ہوتے ہیں لیکن مکلف قمیض کے نیچے وہی تانگہ ڈرائیور یا گارڈ ہوتا ہے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

بہر حال یہ ایک مفروضہ ہے۔ میرا مفروضہ۔

دلی کے بیشتر رکشہ ڈرائیور اس مفروضے پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان میں وہ میں نہیں تھی جو ڈرائیور میں ہوتی ہے۔ وہ سو وہاٹ نہ تھا۔ صرف واٹگے کی بس میں جس سکھ ڈرائیور نے آ کر ڈیوٹی سنبھالی تھی اس کی آنکھوں میں، گردن میں، مونچھ میں سب کچھ تھا۔ وہ تو ظالم فلمی گیت بھی گنگناتا رہا تھا۔ بہر حال دلی میں میرا یہ مفروضہ ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

دلی کے رکشہ ڈرائیور کی چھاتی تنی ہوئی نہیں جھکی جھکی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں حیا ہوتی ہے، لاج ہوتی ہے۔ انداز میں ٹھہراؤ ہوتا ہے ادر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سب کے سب میٹر کے پابند تھے اور میٹر مستری کا سیٹ کیا ہوا نہیں تھا بلکہ کمپنی کا سیٹ کیا ہوا تھا۔

دلی کے رکشا ڈرائیور چلتے تھے، ریس نہیں کرتے تھے۔ انہیں نہ تو زیادہ کمانے کی دھن لگی تھی نہ جلدی جلدی فارغ ہو کر گھر جانے کی لگن تھی۔ اپنے گھر نہیں محبوبہ کے گھر اپنے گھر جانے کی دھن ڈرائیور کو نہیں ہوتی۔

رام لال

بہر طور اس روز جو ڈرائیور ہمیں ملا۔ اس کا نام رام لال تھا۔

میں نے کہا "رام لال کتنا کما لاتے ہو"۔

بولا "بس جی   رہ ہو جاتا ہے"۔

"خالی گزارہ"۔ اشفاق حسین نے پوچھا۔

"ہاں جی"۔ وہ بولا۔ "میں ہوں میری ماتا ہیں۔ دو بہنیں ہیں —— چار جیو ہیں جی"۔

"ڈبل شفٹ لگاتے ہو کیا —" میں نے پوچھا۔

"نہ جی"۔ وہ بولا۔

"کیوں نہیں لگاتے سوکھا گزارہ گھی والا ہو جائے گا"۔

"ماتا جی لگانے نہیں دیتی"۔

"کیوں"۔

"کہتی ہیں رامے بہتے کا لالچ نہ کر تھوڑا سی پر سکھی رہ کر"۔

"ویسے رام لال یہاں دلی میں پیسہ کیسے چلتا ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"بس جی   رے موافق۔ لوگ بسوں میں بیٹھتے ہیں نا اس لئے یا سیکل رکشہ لے لیتے ہیں"۔

"پیچھے سے کہاں کے ہو رام لال"۔

"ماتا جی کہتی ہیں واں رادھا رام کے ہیں"۔

"ادھر کے ہی ہوئے نا"۔

"ہاں جی ادھر کے ہی ہیں"۔

"سارے ہی ادھر کے لگتے ہیں دلی میں"۔

"پتہ نہیں جی پر اپنا سارا محلہ ادھر کا ہی ہے کوئی سرگودھے کا ہے کوئی شیخوپورے کا کوئی سیالکوٹ کا"۔

مزار شریف پر پہنچ کر ہم نے رام لال کو روک دیا۔ وہ رک گیا۔ اس نے دونوں کارڈ نکالے۔

”رام لال یہ دو کارڈ کیوں دکھاتے ہو“ ۔

”وہ جی پہلے ایک ہی کاٹ ہوتا تھا۔ پھر بڑھوتی ہوئی تو دو جا مل گیا اس والے میں ریٹ ہے جی۔ اس دو جے میں بڑھوتی ہے“ ۔

جاتے وقت رام لال نے جھک کر یوں پرنام کیا جیسے گرائیں گرائیں کو کرتے ہیں۔

ہوپنگ اگینسٹ ہوپ

اقبال ہوٹل میں ہم صاحب ویسے ہی اقبال کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے چائے کا پیالہ دھرا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ بھئی آپ ہم سے بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ اقبال مسکرا رہا تھا۔ ہم صاحب کے چہرے پر بڑی بے بسی تھی۔

میں نے اشفاق حسین سے کہا ”میرا جی چاہتا ہے ہم صاحب کو ساتھ لے چلوں“ ۔

”کہاں“ ۔ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”پاکستان لے چلوں“ ۔

”ارے“ ۔ اشفاق حسین نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”تمہیں ان پر ترس نہیں آتا“ ۔

”کن پر“ ۔

”ان مسلمانوں پر“ ۔

”ترس کس بات پر“ ۔

”یہ اپنے شہر میں یوں بیٹھے ہیں جیسے پردیس میں ہوں“ ۔

”ہاں“ ۔ وہ بولا ”لگتا تو ایسا ہی ہے“ ۔

”تو نے اس روز دلی دواخانہ دیکھا تھا؟“

”دیکھا تھا۔ دو آدمی بیٹھے تھے“ ۔

”ہاں یوں بیٹھے تھے جیسے لق و دق صحرا میں بیٹھے ہوں“ ۔

”بالکل۔ لیکن یہ لوگ یہاں کیوں بیٹھتے ہیں۔ کس امید پر“ ۔

“یہ لوگ امید پر نہیں بیٹھے”۔

“تو پھر”۔

“املاک کے لالچ پر بیٹھے ہیں”۔

“چہروں پر املاک کے آثار تو نہیں”۔

“انہیں پتہ ہے کہ ایک روز املاک چھن جائے گی۔ اسے آگ لگا دیں گے”۔

“پھر کیوں بیٹھے ہیں”۔

“ہوپنگ اگینسٹ ہوپ”

“ایک بات پوچھوں”۔

“پوچھ”۔

“یہاں کے عوام میں تو زہر نہیں۔ دکھتا نہیں”۔

“کیا مطلب”۔

“پھر آگ کون لگاتا ہے۔ فساد کون کرواتا ہے”۔

“اخباروں کو ایک اشارہ کر دیتے ہیں۔ وہ دھواں چھوڑتے ہیں۔ زہریلا دھواں بس بھانبھڑ مچ جاتا ہے”۔

“کون اشارہ کرتا ہے”۔

“بڑے اور کون”۔

“بڑے کون”۔

“بڑے پیٹ۔ بڑی تجوریاں اونچی کرسیاں”۔

“السلام علیکم”۔ ہم صاحب ہمارے سر پر آ کھڑے ہوئے۔ “آپ جا رہے ہیں”۔ وہ بولے۔

“جی آج جا رہے ہیں”۔

“کس وقت”۔

“آج رات کو”۔

“اچھا صاحب”۔ وہ مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ “اللہ آپ کا حافظ و ناصر ہو”۔ ان کی آنکھیں پرنم ہو رہی تھیں۔ “جب ادھر سے لوگ آتے ہیں تو انہیں دیکھ کر

بڑی مسرت ہوتی ہے ہمیں۔ خدا حافظ"۔

بھگوان پورہ

جب ہم سکاؤٹ کیمپ پہنچے تو سیکوریٹی والے اسی طرح چاق وچو بند بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں تھڑے پر چڑھ گیا۔ وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لئے"۔

"شکر ہے مہاراج آج آپ کو اس کشٹ سے چھٹکارا ہو جائے گا"۔

بوڑھا ہندو اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "نہ مہاراج کشٹ کیسا۔ ہمیں تو بڑی خوشی تھی"۔

"نہ مہاراج"۔ میں نے جواب دیا۔ "یوں بیٹھے رہنا بیٹھے رہنا"۔

"بیٹھنا تو کشٹ نہیں ہوتا مہاراج"۔ وہ بولا۔

"بہر حال ہماری وجہ سے آپ کو بڑی کھیچل ہوئی"۔

"نہ مہاراج۔ ایسا نہ کہو"۔ وہ بولا۔

"اک بات پوچھوں لالہ جی"۔

"دس پوچھو مہاراج"۔

"آپ پیچھے سے کہاں کے ہیں"۔

"میں مہاراج"۔ اس نے پوچھا۔

"جی آپ"۔

"مہاراج میں بھگوان پورے کا ہوں"۔

"اچھا جی اللہ بیلی"۔ میں نے آخری سلام کیا اور تھڑے سے نیچے اتر آیا— ترکی حمام کی طرف جاتے ہوئے اشفاق حسین نے پوچھا "یار یہ سیکوریٹی والا کس علاقے کا تھا"۔

"لاہور کا"۔ میں نے جواب دیا۔

"وہ تو بھگوان پورہ بتا رہا تھا"۔

"ہاں—" میں ہنسا "رسی جل گئی پر بل نہیں گیا"۔

"کیا مطلب"۔

"مغلوں نے شہر سے دور اک باغ بنوایا"۔ میں نے بات شروع کی۔

"لیکن ـــ" اشفاق حسین نے احتجاج کیا۔

"بات تو سن لے پہلے"۔ میں نے اسے ڈانٹا۔

"سنا"۔

"مغلوں نے شہر سے باہر دور اک باغ بنوایا"۔

"ٹھیک"

"باغ کا رکھ رکھاؤ کرنے والے لوگوں نے باغ کے قریب مٹی یا چونے کے مکان بنا لئے اپنے رہنے کے لئے"۔

"ٹھیک ہے"۔

"یہ مکان بہت سے ہو گئے تو گاؤں کی شکل بن گئی"۔

"ارے تو باغبان پورے کی بات کر رہا ہے"۔

"بات تو سن لے پہلے"۔

"سنا"۔

"ہندوؤں نے سوچا کسی طرح یہ گاؤں ہندوانہ ہو جائے"۔

"پھر"۔

انہوں نے ایک مہم چلا دی۔ خطوں میں اپنا اتہ پتہ بھگوان پورہ لکھنا شروع کر دیا۔ بورڈوں پر بھگوان پورہ لکھ دیا"۔

"اس کا فائدہ"۔

"کوئی فائدہ نہیں"۔

"مقصد"۔

"آرٹ فار آرٹ سیک"۔

"وہ ہنسا۔ شاید یہ مقصد ہو کہ شالامار باغ کو بھگوان باغ مشہور کر دیں"۔

"پھر بھی تو کوئی فائدہ نہیں نا"۔

"مطلب نام چلے۔ ہندو کا نام چلے"۔ وہ ہنسنے لگا۔

"شاید مطلب یہ ہو کہ مسلمان کا نام مٹے"۔
"ترکی حمام میں سب زائر سامان باندھے بیٹھے تھے۔

لٹیرے اور لوٹ

سامان سامان سامان۔
مسلمان کی کشتی ہمیشہ سامان کی وجہ سے ڈوبی۔

جو ہند میں مقیم ہیں وہ ہم صاحب کی طرح سامان کے لئے بیٹھے ہیں جو زائر بن کر آتے ہیں سامان کی گٹھڑیاں اٹھائے وطن پہنچتے ہیں اور اس بوجھ پر پھولے نہیں سماتے۔

میں بھی اپنی گٹھڑی پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس میں ہند کی سوغاتیں تھیں۔ ہند کے پان۔ ہند کی بیڑیاں۔ ہند کی الائچیاں۔ ہند کا کتھ۔ ہند کے پاپڑ۔ ہند کا کھدر۔ ہند کے سب سستے اور اچھے۔ ہند کی کھڑاواں۔

میں اپنی گٹھڑی کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

سبھی اپنی اپنی گٹھڑیاں سینے سے لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ یوں جیسے سومناتھ کو سر کر کے آ رہے ہوں۔

"کہاں ہے میری گٹھڑی"۔
"میرا سوٹ کیس کہاں ہے"۔
"میری پانوں کی ٹوکری"۔

سب اپنی اپنی گٹھڑیاں سنبھال سنبھال کر رکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ لیڈر صاحب بھی چلا چلا کر پوچھ رہے تھے "کیوں بھئی میرا پھلوں کا ٹوکرا کہاں رکھ دیا"۔

گاڑی سیٹیاں مار رہی تھی۔

لٹیرے لوٹ کا مال سنبھال رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سیکورٹی والے چوری چوری ہنس رہے تھے۔ ریل گاڑی کھی کھی کرتی ہوئی سرک رہی تھی۔

دور جامع مسجد کانوں پر ہاتھ رکھے چلا چلا کر پوچھ رہی تھی۔ "مجھے لینے کب آؤ گے۔ اللہ اکبر"

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ)، لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

اس کتاب میں میں نے کئی ایک موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن میں ہند اور ہندو پیش پیش ہیں۔ ان دو موضوعات پر بات کرنے کا مجھے حق حاصل ہے چونکہ میں نے اپنی زندگی کے 42 سال ان کے ساتھ گزارے ہیں۔

میں ہند اور ہندو دونوں کا احترام کرتا ہوں

میں ہندو قوم کی جملہ مثبت خصوصیات کا مداح ہوں۔

مجھے ان سے صرف ایک شکایت ہے کہ انہوں نے مسلمان کو ہمیشہ اچھوت سمجھا اور پاکستان کو سچے دل سے تسلیم نہیں کیا۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہندو کے اس رویے کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔

ہندو کے اس رویے نے مجھے مسلمان بنا دیا، مجھے ایک تعصب بخشا۔ منفی تعصب نہیں، مثبت تعصب۔

الحمدللہ کہ میں ایک متعصب مسلمان ہوں

الحمدللہ کہ میں ایک متعصب پاکستانی ہوں۔

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی
969 0 01080 8
Rs. 276.00